چار دیواری کی دنیا
ہم سب کے گناہوں کی سچی کہانیاں
عنایت اللہ
PDFBOOKSFREE.PK

فہرست

یہ افسانے نہیں، سچی وارداتیں ہیں!

یہ پاکستان کی اُن عورتوں کی داستانیں ہیں جو چار دیواری کے زنداں میں قید میں ہیں۔ وہ سہتی ہیں، کہتی نہیں۔ ان کے منہ میں زبان ہے، زبان میں طاقتِ گویائی بھی ہے، سینہ دکھ و درد، شکووں شکائتوں اور گلے سڑے جذبات کے تعفّن سے اٹا پڑا ہے مگر ہونٹ سِلے ہوئے ہیں۔ وہ رسم و رواج، اندھی عقیدت اور اس حکم کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں کہ جھیلو، یا لو مت۔ بعض اپنے ماں باپ کے گناہوں کی سزا بھگت رہی ہیں، کچھ خاوندوں کے جرائم کی بھی سزا بھگت رہی ہیں اور اس زنداں میں بعض ایسی بھی ہیں جنہیں صرف اس لیے طلاق مل جاتی ہے کہ اُن کی کوکھ ہری نہیں ہوتی، اس کا ذمہ دار خاوند ہی کیوں نہ ہو۔

اُن کے اعصاب اور سوچنے کی صلاحیتوں پر صرف رسم و رواج ہی سوار نہیں بلکہ پیر، فقیر، عامل اور ان کی سحر کاریاں بھی غالب ہیں۔ معاشرے کے یہ بدکار افراد جنہیں پیر اور عامل کہا جاتا ہے، اِن عورتوں کی عصمت سے بھی کھیل جاتے ہیں۔ مگر کوئی عورت یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتی کہ یہ شخص جس کے آگے تم سجدے کرتے ہو، بدکار آدمی ہے اور وہ چرس اور شراب کا نشئی ہے اور جسے تم خدا کا برگزیدہ انسان سمجھتے ہو وہ خدا کا دھتکارا ہوا ہے۔

چار دیواری کی دنیا طلسمِ ہوشربا ہے۔ اس میں کچھ اِسرار ہیں، کچھ بھید اور کچھ راز ہیں مگر یہ پوشیدہ نہیں بلکہ ہم ان سے نگاہیں پھیرے ہوئے ہیں جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہیں اور اگر وجود ہے بھی تو جیسے ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں — ہم اپنی لغزشوں اور بداعمالیوں کا سامنا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ہمارا یہی رویّہ معاشرتی قباحتوں کو جنم دیتا اور ان کی پرورش کرتا ہے۔

ہم نے ماہنامہ "حکایت" کا اجرا کیا تو پہلے شمارے میں یہ اعلان کیا تھا "چار دیواری کے اندر مستورات کی دنیا میں اچھے بُرے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے بڑے حادثوں کا باعث بنتی ہیں۔ ذرا ذرا سی باتوں پر سہاگنیں اُجڑ جاتی ہیں۔۔۔۔ خواتین ایسی سچّی کہانیاں اور آپ بیتیاں لکھیں جن میں گھریلو اور ازدواجی حسن و قبیح کو واقعات کی روشنی میں واضح کیا جائے"۔

تھوڑے ہی دنوں بعد ہمیں ایک خاتون کی لکھی ہوئی ایک کہانی اس ہدایت کے ساتھ ملی کہ ان کا پورا نام اور پتہ کسی کو نہ بتایا جائے، صرف "ا۔ب" لکھا جائے۔ محترمہ "ا۔ب" نے خط میں لکھا ــــ "اب یہ راز لوگوں کو سنا دینا چاہتی ہوں۔ شاید کسی کے دل میں اُن لڑکیوں کے لیے رحم پیدا ہو جائے جنہیں صرف اس لیے طلاق مل جاتی ہے کہ قدرت نے انہیں بچّہ پیدا کرنے کی صلاحیت عطا نہیں کی"۔

چند ہی روز بعد ہمیں ایک اور خاتون کی کہانی ملی۔ انہوں نے اپنا نام "ک" لکھا تھا۔ کہانی کے آخر میں انہوں نے لکھا ــــ "یہ انگارے اس امید پر اُگل دیئے ہیں کہ مجھ جیسی کوئی لڑکی یا میرے ماں باپ جیسے ماں باپ عبرت حاصل کریں اور اپنی اصلیت کی طرف لوٹ آئیں۔۔۔ میں معصومیت اور عصمت کی گلی سڑی لاش ہوں"۔

یہی ہمارا مقصد تھا کہ خواتین وہ راز اُگل دیں جو انہیں انگاروں کی طرح جلا رہے ہیں، شاید ہم عبرت حاصل کریں ــــ ہم نے دونو خواتین کی کہانیاں پڑھیں، واقعات کے لحاظ سے ہمارے مقصد اور معیار پر پوری اترتی تھیں۔ تحریر خام تھی جیسے خام ہی ہونا چاہئے تھا۔ گھریلو عورتیں ادیب نہیں ہوتیں۔ ہم نے واقعات کو چھیڑے بغیر تحریر کی نوک پلک سنوار دی اور کہانیاں شائع کر دیں۔

اس کے بعد خواتین کے خطوط آنے لگے جن میں اس معذوری کا اظہار کیا گیا کہ وہ اپنی بپتا سنا سکتی ہیں، لکھ نہیں سکتیں۔ اس مسئلے کو "حکایت" کے شعبۂ خواتین نے اس طرح حل کیا کہ چار خواتین کی خدمات حاصل کر لیں جنہوں نے مختلف گھروں

میں جا کر متعلقہ خواتین سے ان کی کہانیاں سنیں اور انہیں آپ بیتیوں کے رنگ میں قلمبند کیا۔ "حکایت" کے ادارتی عملے نے واقعات میں کوئی ردّ و بدل کئے بغیر تحریر کو سنوار کر کہانیاں شائع کر دیں۔

یہ کہانیاں پڑھ کر ہم سے پوچھا گیا تھا ــــ "کیا گھریلو عورتیں ایسی شستہ اور پختہ تحریر لکھ سکتی ہیں؟" ــــ جی بالکل نہیں۔ ہم اوپر اس سوال کا جواب دے چکے ہیں۔ ہر کوئی ادیب نہیں ہو سکتا۔ کہانی سنا تو ہر کوئی سکتا ہے مگر کہانی لکھنا ایک فن ہے۔ ہم جو کہانیاں شائع کرتے ہیں اور جو اس کتاب میں پیش کر رہے ہیں، ان کی تحریر "حکایت" کے شعبۂ خواتین اور ادارتی عملے کی ہوتی ہے۔ ہم نے یہ اعلان کر کے قارئین کے لیے سہولت پیدا کر دی تھی کہ آپ کا ادیب ہونا ضروری نہیں۔ آپ صرف واقعات لکھ دیں یا زبانی سنا دیں ــــ ہماری چار خواتین نامہ نگار گھروں میں جا کر عورتوں سے کہانیاں سننے لگیں۔ پھر کچھ مرد چار دیواری کی دنیا کی آپ بیتیاں لے کر آ گئے جنہیں ہم نے اپنے الفاظ میں قلمبند کیا اور ان کے نام سے شائع کیا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور ابھی تک چل رہا ہے۔

ان کہانیوں سے ہمارے معاشرے کے وہ گوشے بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے جو چار دیواری کی گھُٹی گھُٹی تاریکیوں میں چھُپے رہتے تھے۔ اس وقت تک "حکایت" میں چار دیواری کی دنیا کی اتنی ہی کہانیاں شائع ہو چکی ہیں جتنے "حکایت" کے شمارے شائع ہوئے ہیں۔ قارئین کی فرمائش پر ہم ابتدائی گیارہ کہانیاں کتابی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔

ہر ایک کہانی ہماری اُن لغزشوں اور کوتاہیوں کو بے نقاب کرتی ہے جنہیں ہم نے رسم و رواج کا نام دے کر قبول کر رکھا ہے ــــ ہم کسی بھی کہانی پر تبصرہ نہیں کریں گے۔ یہ یقین ضرور دلائیں گے کہ یہ افسانے نہیں، سچی وارداتیں ہیں۔ پڑھیئے اور اپنی رائے قائم کیجئے مگر اپنے گھر کا جائزہ ضرور لیجئے۔ ہو سکتا ہے کوئی کہانی آپ ہی کے گھر کی ہو۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

تم ماں نہیں بنو گی

رضی الدّین

مجھے بچوں سے نفرت ہوا کرتی تھی۔

میری شادی ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کو شادی سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب اس کی سیرت دیکھی تو میں اس کا شیدائی ہو گیا۔ اس کی شگفتہ مزاجی اس کے حسن کا بنیادی عنصر تھا: ہنستے مسکراتے رہنا، سنجیدہ بات بھی مسکرا کر کہنا اور ہونٹوں پر دل کش سے تبسم کو قائم رکھنا، ایسے اوصاف ہیں جو بدصورت عورت کو بھی خوبصورت بنا دیا کرتے ہیں۔ شادی کے وقت میری بیوی کی عمر بمشکل سولہ سال تھی۔ بعض اوقات وہ مجھے معصوم سی بچّی لگا کرتی تھی۔ اور میں سوچا کرتا تھا کہ ایسی بھولی بھالی لڑکی کو ماں باپ نے کتنی جلدی عورت بنا دیا ہے۔ یہ تو اس کی ہنسنے کھیلنے کی عمر تھی۔

شادی کی ساتویں یا شاید آٹھویں رات تھی، میری بیوی میکے میں دو روز گذار کے آئی تھی۔ آدھی رات گذر گئی ہو گی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ گہری نیند سو گئی تھی۔ میں ابھی جاگ رہا تھا۔ میں نے بتی جلا دی اور اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے دس گیارہ سال کی بچی بے فکری کی نیند سو رہی ہو۔ سوتے میں وہ مجھے بہت ہی معصوم اور بالک لگ رہی تھی۔ میں بڑی تلخ یادوں کے ریلے میں بہنے لگا اور میرا دل غموں کے بوجھ تلے دبنے لگا۔ اس وقت میری عمر چھبیس سال تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ لڑکی جو ابھی لڑکپن سے نہیں نکلی، جوان بھی نہیں ہونے پائے گی کہ اس کی گود میں بچہ کھیل رہا ہو گا۔ پھر ایک اور بچّہ پھر ایک اور — اور یہ

ہنستی کھیلتی لڑکی جوان ہونے سے بغیر بوڑھی ہو جائے گی۔ مجھے یاد آگیا کہ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ بچھو کے جب بچّے پیدا ہوتے ہیں تو ان کی پہلی خوراک ان کی اپنی ماں ہوتی ہے، وہ ماں کے ساتھ چپک جاتے ہیں اور اس کے جسم کی ساری نمی اور خون چوس لیتے ہیں اور ماں مرجاتی ہے۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ مجھے اپنے پلنگ کے قریب کھڑا دیکھ کر وہ ذرا بھر نہ چونکی مخمور سی مسکراہٹ سے بولی —"اتنی جلدی صبح ہوگئی ہے ؟"— اور اس نے انگڑائی لی۔ اس کا جو ہاتھ میری طرف بڑھا تھا، اسے میں نے تھام لیا۔ میں بولنے لگا تو میری آواز رندھ گئی۔ میں آواز پر قابو پاکر اس کے قریب بیٹھ گیا اور اسے کوئی بہت ہی اہم فیصلہ سنانے کے انداز سے کہا —"ابھی صبح نہیں ہوئی۔ میں تمہیں دو باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ مجھے تمہارے ساتھ ایسی محبت ہے جس کا شاید تم تصوّر بھی نہ کرسکو اور دوسری بات یہ ہے کہ تم کبھی ماں نہیں بنو گی۔ ہمیشہ دلہن رہو گی۔"

"کیوں ؟"

"کیونکہ مجھے تمہارے ساتھ ایسی محبّت ہے جسے بچّے زیادہ دیر زندہ نہیں رہنے دیں گے۔"

مجھے توقع تو یہ تھی کہ وہ ہنس کر ٹال دے گی کیونکہ بھولپن کی وجہ سے وہ سمجھ ہی نہیں سکے گی کہ میں نے کس قدر سنگین بات کہ دی ہے۔ لیکن وہ سنجیدہ ہوگئی اور کہنے لگی —"بچے آپ کے ہوں گے پھر میرے اور آپ کے دل سے ہماری محبّت کو کیوں ختم کردیں گے ؟"

"تمہارا پھول سا چہرہ کملا جائے گا"— میں نے کہا —"اور تم جوانی میں بوڑھی ہوجاؤ گی۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی بیساختہ اور بے محل ہنسی نے میری سنجیدگی ختم کرڈالی اور اس نے مجھ پر رومانی کیفیت طاری کردی۔ بچّوں کا موضوع ختم ہوگیا اور ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے سو گئے۔

میں اُس وقت چھوٹی سی ایک فیکٹری کا سیلز مین تھا۔ فیکٹری کی مصنوعات کے آرڈر لیا کرتا تھا۔ تنخواہ اور کمیشن ملا کر اڑھائی سو روپے ماہوار آمدنی ہو جایا کرتی تھی جو میاں بیوی کے لئے کافی تھی۔ میری طبیعت میں لاابالی پن بھی تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ بچّوں کے جھنجھٹ میں کبھی نہیں پڑوں گا اور اپنی بیوی کے ساتھ ہنستے کھیلتے عمر گزار دوں گا۔ میں بچّوں کی ذمہ داریوں اور مسائل سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں اڑھائی سو روپے ماہوار پر مطمئن تھا اور میں بچّوں کے لئے مزید محنت اور مشقت کے لئے بالکل آمادہ نہیں تھا۔

جب تین مہینے گزر گئے تو بیوی نے پہلی بار محسوس کیا کہ بچّوں کے متعلق میرا فیصلہ اٹل ہے اور میں نے اسے یہ جو کہا تھا کہ تم کبھی ماں نہیں بنو گی ہمیشہ دلہن رہوگی، رومانی کیفیت میں نہیں کہا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی عادت کے مطابق ہنس اور مسکرا کر مجھے کہنا شروع کردیا کہ گھر میں بچہ ہونا چاہیئے اور میں اسے پیار بھرے انداز سے ٹالنے لگا کہ بچہ نہیں ہونا چاہیئے اور نہ ہوگا۔

وقت گزرتا چلا جارہا تھا۔ بیوی کے ساتھ مجھے ایسی شدید محبت تھی کہ میں نے اپنے کام کی طرف توجہ دینی چھوڑ دی۔ پہلے میں ہر مہینے ایک دو فالتو آرڈر بک کرلیا کرتا تھا۔ اب اس بھولی بھالی ہنستی مسکراتی دلہن کی محبت نے ایسا جکڑا کہ میں انہی آرڈروں پر قناعت کرنے لگا جو میرے مستقل گاہک بن چکے تھے۔ میں فیکٹری سے آرڈر بک کرنے کے لئے نکلتا اور گھر جاکر بیوی کے ساتھ مگن ہوجاتا۔ اس طرح میری کمشن بڑھ نہ سکی کیونکہ میری تگ ودو ختم ہوچکی تھی۔ بیوی کو معلوم نہیں تھا کہ میں آمدنی کے اضافے کو اس کی محبت پر قربان کررہا ہوں۔ وہ خوش تھی کہ میں نے اسے دل و جگر میں سمولیا ہے۔ کبھی کبھی مجھے خیال آجاتا کہ مجھے مزید آرڈروں کے لیے بھاگ دوڑ کرنی چاہیئے تو میں بے نیازی سے اپنے آپ کو تسلی دے لیا کرتا کہ ہم دونوں کے لئے اڑھائی سو روپیہ کافی ہے۔

ایک سال گزر گیا تو ایک رات بیوی نے مجھے سنجیدگی سے کہا —"بچہ ہونا چاہیئے۔ مجھے بچّے بہت اچھے لگتے ہیں"— میں اس کی تشنگی کو بہت اچھی طرح

سمجھا تھا۔ تشنگی کے علاوہ اسے اڑوس پڑوس کی عورتوں، میری ماں اور بہنوں
نے بھی گھور گھور کر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ہمارے ہاں شادی کے بعد بچہ پیدا کرنا
لازمی سمجھا جاتا ہے ورنہ بیوی کی خیر نہیں۔ کچھ ایسی صورت میرے ہاں بھی پیدا
ہونے لگی تھی۔ پھر بھی میں نے بیوی کو سمجھایا کہ بچہ تم جنو گی، انہیں تو کوئی
تکلیف نہیں ہو گی۔ ان عورتوں کے پاس اس کے سوا کوئی اور کام نہیں کہ
دوسروں کو گھور گھور کر نقائص نکالتی رہیں اور من گھڑت قصے مشہور کر کے اپنی
دل لگی کا سامان پیدا کرتی رہیں۔

بیوی جب اصرار کرنے لگی تو میں نے کھلنڈرے لڑکے کی طرح چھیڑ چھاڑ اور
ہنسی مذاق سے اس کے اصرار پر رومانی جذبات طاری کر دیے۔ یہ تو اسے یقین
تھا ہی کہ میں اس پر دل و جان سے فدا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میری ہر بات
مان جایا کرتی تھی۔

ایک سال اور گذر گیا۔ میں بیوی کے حسن اور اس کی شگفتہ سیرت کی دلکشی
میں جذب ہو گیا اور بیوی کی یہ خواہش شدید ہو گئی کہ اسے اب ماں بننا چاہیئے۔
وہ اب ان لوگوں کو کوسنے لگی تھی جنہوں نے ماں بننے کے لئے عورت کے
راستے میں مصنوعی رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں۔ ایک رات اس نے جھنجھلا کر کہا
"ہم آخر کب تک لیلیٰ مجنوں کا ڈرامہ کھیلتے رہیں گے۔ ایک وقت آئے گا کہ ہم ایک
دوسرے سے اکتا جائیں گے اور ایک دوسرے کی صورت دیکھنے سے بھی بیزار ہو جائیں
گے۔ میری دو سہیلیوں نے مجھ سے بعد شادی کی تھی۔ دونوں کی گودوں میں ایک
ایک بچہ ہے جو وہ ہر کسی کو فخر سے دکھاتی پھرتی ہیں۔ اس وقت عورتیں مجھے ایسی
نظروں سے دیکھتی ہیں کہ میرا دل کٹنے لگتا ہے" ——— اس نے روٹھ کر کہا ———
"میں اب دلہن نہیں بنی رہوں گی۔ میں عورت بن چکی ہوں۔ مجھے اب ماں بننا
ہے۔ میرے دل میں ایسی تلخی پیدا ہو گئی ہے جسے آپ کی محبت ختم نہیں کر سکتی۔"
میں نے پہلے کی طرح اسے محبت کی دیوانگی اور ہنسی مذاق سے ٹالنا چاہا،

لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مجھے قدرت کے حقیقی راستے پر لے آئے گی۔
میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ دو سال کے عرصے میں
میں نے پہلی دفعہ اس کے پھول جیسے چہرے کو اداس اور اس کی مسکراتی ہوئی
آنکھوں کو اشکبار دیکھا تو میرے دل پر ایسی چوٹ پڑی کہ رکا ہوا غبار ہونٹوں
پر آ گیا۔ وہ مجھے قدرت کے جس حقیقی راستے پر لانا چاہتی تھی، میں اس راستے
سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ میں حقائق کا مفرور تھا اور وہ حقائق میں خوشیاں
ڈھونڈ رہی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ اسے کسی طرح قائل کر لوں کہ وہ بچے کی خواہش
کو دل سے نکال دے لیکن آنسو جو اس کی آنکھوں میں رکے ہوئے تھے، بہنے لگے
اور بہتے ہی چلے گئے۔

میں سینے سے اٹھتے ہوئے جس غبار کو روک رہا تھا، وہ بے قابو ہو کر زبان
پر آ گیا اور میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اس نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ
کر میری طرف دیکھا تو میرے آنسو دیکھ کر گھبرا گئی۔ پیشتر اس کے کہ وہ مجھ سے وجہ پوچھتی
میں نے کہا —— "میں تمہیں اس جوانی میں اپنے ہاتھوں زندہ در گور نہیں کرنا چاہتا۔
جس بچے کو ہنستا مسکراتا کھلونا سمجھتی ہو وہ میٹھا زہر ہے جو پیار کے دھوکے میں
تمہارے جسم سے زندگی کا رس چوس لے گا۔ ہم آٹھ بچوں نے اپنے ماں باپ کو جوانی
میں بوڑھا کر دیا تھا۔ میں ماں باپ کا تیسرا بچہ تھا۔ ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ ہم تین
بچے مل کر ماں باپ کا خون پی رہے تھے۔ پھر پانچ اور بچے پیدا ہوئے۔ ماں بتایا
کرتی ہے کہ اچھے وقتوں میں ابا جان ایک سو روپیہ تنخواہ لیتے تھے۔ اس وقت ایک
روپے کی پوری قیمت وصول ہوتی تھی۔ زندگی بڑے مزے سے گذر رہی تھی۔ شادی
کا دوسرا سال تھا جب پہلا بچہ پیدا ہوا۔ پھر بچے پیدا ہوتے چلے گئے۔ میں
نے بھی گھر میں آسودہ حالی دیکھی تھی لیکن بعد میں آنے والے پانچ اور بچوں
نے مل کر گھر میں غربت پیدا کر دی۔ ابا جان کی تنخواہ ایک سو سے ایک سو پچیس
ہو گئی جو ہم آٹھ بچے ایک ہفتے میں چٹ کر جاتے تھے۔"

میری بیوی چپ چاپ بیٹھی سن رہی تھی اور میں ایسی آواز میں بول رہا تھا جس میں درد تھا۔ میں کہ رہا تھا ــــ " وہی باپ جو دفتر سے آتا تو بڑے مزے سے لیٹ جایا کرتا تھا یا ہم تینوں بچّوں کے ساتھ ہنسنے کھیلنے لگتا تھا، اب اس طرح گھر میں داخل ہوتا جیسے اس کے کندھوں پر جانے کتنا سارا وزن رکھا ہوا ہو۔ اس کی مسکراہٹ اور پیار اس بوجھ تلے دب گیا تھا۔ پھر دوسری جنگِ عظیم شروع ہوگئی اور مہنگائی کا دور دورہ شروع ہوگیا۔ ایک سو پچیس روپوں کی حیثیت پانی کے بلبلے کی سی رہ گئی۔ ماں کے چہرے پر بڑھاپے کی لکیریں آگئیں جو بہت تیزی سے گہری ہونے لگیں۔ ایک روز ابّا جان دفتر سے آئے تو انہوں نے ماں کو خوشخبری سنائی کہ انہیں ایک جگہ پارٹ ٹائم کام مل گیا ہے"۔ اس روز کے بعد شام گہری ہو جاتی تو وہ گھر آتے۔ ایک مہینے بعد وہ محلے کے چار بچوں کو گھر میں ٹیوشن پڑھانے لگے۔ فیس دس روپے فی بچہ تھی۔ اب ابّا جان کولہو کا بیل بن گئے۔ علی الصبح گھر سے نکلنے، دفتر سے فارغ ہو کر پارٹ ٹائم کام کے لیے چلے جاتے۔ گھر آتے تو ٹیوشن والے چار بچے انتظار میں بیٹھے ہوتے۔ رات دس بجے تک انہیں پڑھاتے امّی اور ابا جان کو اب کئی کئی دن آپس میں بات تک کرنے کا موقعہ نہ ملتا ۔ ۔ ۔

"ایک شام ہم سب بچے کھانا کھانے بیٹھے تو امّی نے کچھ بھی نہ کھایا۔ وہ [illegible] تھی۔ میں نے امّی سے پوچھا کہ وہ کیوں نہیں کھاتیں تو انہوں نے کہا کہ وہ کھا چکی ہیں۔ جب ہم کھا کر اِدھر اُدھر ہوگئے تو میں کسی کام سے باورچی خانے میں گیا۔ امّی بچّوں کی چھوڑی ہوئی پلیٹوں میں روٹی کے ٹکڑے پھیر پھیر کر کھا رہی تھیں۔ میں نے ایک اور پلیٹ دیکھی جس میں تھوڑی سی دال تھی۔ مجھے پتہ چل گیا کہ یہ ہماری پلیٹوں سے بچی ہوئی دال ہے جو امّی نے ابّا جان کے لیے رکھ دی ہے اور خود ہماری پلیٹیں چاٹ کر روکھی سوکھی روٹی سے پیٹ بھر رہی ہیں۔ میں اُس وقت اتنا بڑا نہیں تھا کہ سلیقے کی بات کر سکتا۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ امّی آپ تو کہتی تھیں کہ میں کھانا کھا چکی ہوں۔ امّی ہنس پڑیں اور بات گول کر گئیں۔

"تمہاری صرف ایک بہن اور ایک بھائی ہے"۔ میں نے بیوی سے کہا ــــ

"ہماری طرح گھر میں بچّوں کا ہجوم نہ تھا۔ تم نے اپنے ماں باپ کو اس حالت میں نہیں دیکھا جس میں مَیں نے اپنے ماں باپ کو دیکھا ہے۔ تم نے خوش باش زندگی گذاری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ زندگی ہم نے بھی خوش باش گذاری ہے۔ میرے ماں باپ نے تنگدستی کے باوجود بچوں کے سامنے کبھی ٹسوے نہیں بہائے تھے۔ کسی بچے کو کبھی بلاوجہ ڈانٹا جھڑکا نہیں تھا۔ مار پٹائی کا ہمارے گھر میں بالکل رواج نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہم نے ماں باپ کو کبھی ناجائز ضد سے پریشان نہیں کیا تھا۔ امّی اور ابّا جان ہمیں خوش رکھنے کے لیئے اکثر ہنسا بھی کرتے تھے۔ لیکن یہ ہنسنے کی ناکام کوشش ہوا کرتی تھی۔ ہم سب کھانا اکٹھے بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔ صرف ابّا جان غیر حاضر ہوا کرتے تھے کیونکہ وہ پارٹ ٹائم اور ٹیوشن کے چکر میں پس رہے ہوتے تھے۔ کھانے میں تقریباً ہر روز دال یا شوربے والی کوئی سبزی ہوا کرتی تھی۔ ہمارے لیے گوشت خواب کی کوئی چیز بن گیا تھا لیکن امّی کی پیاری پیاری باتیں کھانے سے زیادہ لذیذ ہوا کرتی تھیں۔ اگر گھر میں کوئی بچّہ شرارت کرے یا بچے آپس میں لڑ پڑیں تو امّی نے انہیں کبھی پیٹا یا کوسا نہیں تھا۔ انہیں پاس بلا کر بس اتنا ہی کہا کرتی تھیں ــــ "تم لڑتے اچھے لگتے ہو؟ تمہارا باپ تمہارے لیے صبح سے آدھی رات تک مشقت کر کر کے مرتا جا رہا ہے اور تم لڑتے ہو؟" ــــ اور بچے شرم سے سر جھکا لیا کرتے تھے۔ ماں باپ کے اسی پیارے سلوک کا اثر تھا کہ ہم تمام بچے ردّی کاغذ جمع کر کے لفافے بنایا کرتے تھے اور دوکانوں پر بیچ آیا کرتے تھے۔ ہم پیسے امّی کو دے کر بہت خوش ہوا کرتے تھے"۔

میری آواز رقّت میں دب گئی۔ میری بیوی نے دھیمی سی آواز میں کہا ــــ "اچھا جانے دیجئے۔ آپ بہت اداس ہو گئے ہیں۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ آپ بچوں سے کیوں گھبراتے ہیں"۔

"نہیں فرحت!" میں نے جذبات کی رَو میں بہتے ہوئے کہا ــــ "آج میرے سینے سے جو طوفان اٹھ آیا ہے، اسے نکل جانے دو۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے روکے رکھا تھا تاکہ تیری طبیعت کی شگفتگی پامال نہ ہو جائے۔ آج تیرے

آنسوؤں نے مجبور کر دیا ہے کہ دل میں جو کچھ بھی ہے، تیرے آگے رکھ دوں۔ فرحت! آج کی رات میری ساری کہانی سن لو۔ جب میں بچّہ تھا تو یہی سمجھتا رہا کہ میری امی بڑی اچھی ہے۔ نہ مجھے کوئی ترش بات کہتی ہے نہ میرے کسی بھائی بہن کو، لیکن میں اچھا بُرا سمجھنے کی عمر کو پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ امّی اور ابّا جان کے وہ ہونٹوں پر جو مسکراہٹیں آیا کرتی ہیں، ان میں انہوں نے مفلسی اور بے چارگی کو چھپایا ہوا ہے۔ وہ ہمیں خوش رکھنے کے لیے مسکرانے کی کوشش کیا کرتے تھے اور میں جان گیا کہ ہم اتنے سارے بچّے ماں باپ کے خون، سکون اور رات کی نیندوں پر پل رہے ہیں اور ماں باپ خود فاقے کرکے ہمیں پال رہے ہیں۔۔۔

"عمر کے چالیسویں سال ماں کے بال سفید اور چہرہ ضعیف بوڑھا ہو گیا۔ ابا جان کی کمر دوہری ہو گئی اور وہ دائمی کھانسی میں مبتلا ہو گئے۔ اب وہ سارا دن مشقت کرتے اور رات کے جو دو چار گھنٹے سونے کے لیے ملتے وہ کھانستے گزر جاتے۔ پھر امّی کو نیم فاقہ کشی اور دن بھر گھر کے کام کاج میں جُتے رہنے کی وجہ سے جوڑوں میں درد شروع ہو گیا۔ نہ ابا جان نے اپنا کوئی علاج کرایا نہ امّی جان نے۔ علاج کہاں سے کراتے؟ ان کے پلّے تھا ہی کیا؛ انہوں نے اپنی جوانی، اپنی صحت اور اپنی خوشیاں ہماری نذر کر دیں۔۔۔۔

"فرحت! ماں اور باپ بن جانا آسان ہے لیکن بچے قربانی مانگتے ہیں وہ دینا آسان نہیں ہوتا۔ ہمارے گھر میں آٹھ بچّوں کی پیدائش کا ذمّہ دار کوئی بھی تھا۔ خدا کی ذات یا میری ماں یا میرا باپ لیکن اس حقیقت کو صرف ماں باپ ہی جانتے ہیں کہ بچوں کو خونِ جگر دے کر پالنا پڑتا ہے۔ جوانی کے ارمان اور خواب قربان کرنے پڑتے ہیں۔ عید کے روز جو ماں باپ میلے اور بوسیدہ سے کپڑے پہنے نظر آتے ہیں، ان کے لیے عید کی یہی مسرّت کافی ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی مسرتیں بچوں کو نئے کپڑے اور جوتے پہنا کر قربان کر دی ہیں۔ فرحت! ماں بھی انسان ہوتی ہے، باپ بھی انسان۔ انسان بوڑھا ہو جائے تو بھی بچپن ساتھ نہیں چھوڑتا۔ ماں باپ بھی بچّوں کی طرح قہقہے

اور کد کڑے لگانا چاہتے ہیں۔ وہ بھی کھلونوں سے کھیلنا چاہتے ہیں اور کچھ نہیں تو دم بھر کو سستانا تو ضرور ہی چاہتے ہیں مگر وہ سستا بھی نہیں سکتے۔ بچّوں کو پالتے ہیں، پڑھاتے ہیں اور ان کی شادیوں کے غم میں ادھ موئے ہونے لگتے ہیں۔ کون جانے کہ بیٹیوں کے ہاتھوں کی مہندی میں ماں باپ کے خون کی سرخی ہوتی ہے۔ نئی نویلی دلہن کی مسکراہٹوں میں باپ کی ساری عمر کی خوشیاں دفن ہوتی ہیں۔۔۔

" فرحت! میں مجرم ہوں۔ میں نے بھی آٹھ بچوں کے ساتھ مل کر ماں کی جوانی دودھ کے راستے چوس لی تھی۔ ہم آٹھ بچّے وہ بچھو تھے جو پیدا ہوتے ہی اپنی ماں کو مار ڈالتے ہیں۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہے فرحت! مجھے ہر بچّے سے نفرت ہے اور جب میں تیرا یہ بھولا بھالا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی ماں کا کِھلا ہوا چہرہ یاد آجاتا ہے۔ وہ بھی تیری طرح ہنسا کرتی تھی۔ ہم نے اس کی ہنسی کو اس کے ہڈیوں کے ڈھانچے میں دفن کر دیا ہے۔ اس کی عمر ابھی ساٹھ سال نہیں ہوئی لیکن سو سال کی بوڑھی لگتی ہے۔ چارپائی سے اٹھ نہیں سکتی۔ خدا خوش رکھے میرے بڑے بھائیوں کو جنہوں نے امّی اور ابّا جان کو کام دھندے سے فارغ کرکے سنبھال لیا ہے۔۔۔

" آج تیری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے اس وقت کا خیال آگیا ہے جب تُو رونا چاہے گی تو بچّے تجھے رونے نہیں دیں گے۔ تیری آہیں اور تیری فریادیں بچوں کے غل غپاڑے میں دب کے رہ جائیں گی۔ فرحت! میرے گھر میں بچّہ پیدا نہیں ہوگا۔ میں تیری جوانی کو دیمک نہیں لگنے دوں گا۔ میری رفیقہ! میں اپنے دل پر پتھر رکھ کر تیری گود خالی رکھوں گا۔ میں اپنے خون کو تیرے خون سے کبھی نہیں ملنے دوں گا۔ تیرے حسن کو مرتے دم تک بے داغ اور زندہ رکھوں گا۔ میں نے اپنی ماں کا خون چوس کر جو گناہ کیا ہے، اس کا کفارہ تیرے خون کو تیری رگوں میں رواں دواں رکھ کر ادا کروں گا۔ میں تجھے اس جہنم میں کبھی نہیں جانے دوں

گا جس میں میری ماں جاگری تھی"۔

"ایک دو بچوں سے کیا فرق پڑ جائے گا؟" فرحت نے متانت سے کہا۔

"کیا ہم اتنے گئے گذرے ہیں ـــ کہ دو بچے بھی نہیں پال سکیں گے؟"

"نہیں۔ میری آمدنی تھوڑی ہے"۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے۔ ہم انگریز کے راج میں بھوکے اور مفلس رہے تھے۔ ہمارے بچے اپنے راج میں فاقے کریں گے۔ ذرا باہر نکل کر گلیوں اور جھگیوں میں کھیلتے ہوئے ننگ دھڑنگ بچوں کو دیکھو۔ یہ ان کے بچے ہیں جنہوں نے صرف دو سال گذرے پاکستان بنایا تھا لیکن پاکستان کی دولت تاجروں اور دکانداروں کے گھروں میں جا رہی ہے اور پاکستان بنانے والوں کی ہڈیوں پر عمارتیں کھڑی ہو رہی ہیں"۔

میری بیوی کوئی اور دلیل دینے لگی تھی کہ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا "میں کسی اور کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن میرے گھر میں پیدا ہونے والے بچے سے نفرت کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں اڑھائی سو روپے ماہوار پر مطمئن ہوں ـــ میں اس سے زیادہ محنت و مشقت نہیں کروں گا"۔

"پھر یہ بھی کہہ دیجئے کہ آپ کو مجھ سے بھی نفرت ہے،" میری بیوی یک لخت پھٹ پڑی۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ اس میں اس قدر غصہ بھی ہے۔ اس نے غصے سے کہا ـــ "آپ میرے جسم کے ساتھ کھیلتے رہنا چاہتے ہیں۔ آپ میں اتنی جرأت نہیں کہ حقیقت کا سامنا کر سکیں" ـــ اور اس نے مجھے ایسی ایسی باتیں کہہ ڈالیں کہ مجھ پر خاموشی طاری کر دی۔ میں جب چپ ہو گیا تو اس کا لب و لہجہ فوراً بدل گیا۔ وہ رو پڑی اور بولی ـــ "آپ کو یہ ڈر بھی ہے کہ بچہ آپ کو پریشان کرے گا۔ میں قسم کھا کر وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کو بچے کے رونے کی آواز بھی سنائی نہ دے گی۔ اسے میں پالوں گی، میں سنبھالوں گی۔ مجھے صرف ایک بچہ چاہیئے جسے میں بھی فخر سے اٹھا کر محلے برادری کو دکھا سکوں۔ اگر آپ کو مجھ سے اتنی زیادہ محبت ہے تو میرے فخر کو نہ کچلیئے" ـــ اور وہ اتنا روئی کہ میں نے شکست قبول کر لی۔

جب میری بیوی کی کوکھ میں میرا پہلا بچہ پھلنے پھولنے لگا تو بیوی کی طبیعت کی شگفتگی اور زیادہ بڑھ گئی مگر میں پژمردہ ہونے لگا۔ میرے ذہن پر اپنے ماں باپ کا حشر چھایا ہوا تھا۔ میں اس فلسفے کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو سکا کہ بچہ خدا کا پیغام ہوتا ہے۔ ذہن پر ایسا اثر تھا کہ میں نے ایک روز پھر بیوی سے کہہ دیا کہ میں بچے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ نہ کبھی مجھ سے توقع رکھنا کہ تم مصروف یا بیمار ہو گی تو میں بچے کو اٹھائے اٹھائے پھروں گا"۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب میرے گھر میں پہلا بچہ پیدا ہوا۔ میری بوڑھی ماں اور ضعیف باپ نے جی بھر کے خوشیاں منائیں۔ سسرال والوں نے جشن منایا۔ اور صرف ایک میں تھا جس کے دل پر غم چھایا ہوا تھا۔ میں نے بچے کی صورت نہیں دیکھی۔ آپ مجھے سنگدل کہہ سکتے ہیں، حقائق کا بھگوڑا کہہ سکتے ہیں اور جو جی میں آئے کہہ سکتے ہیں لیکن آپ میری اُس وقت کی ذہنی حالت کو نہیں سمجھ سکتے۔ بچپن سے ہی میرے اندر جو اثرات جمع ہوتے رہے تھے، انہوں نے مجھے سنگدل اور بھگوڑا بنایا تھا۔

بچہ بڑا ہونے لگا۔ میں اسے دور سے دیکھا کرتا تھا۔ ہاتھ پاؤں چلاتا رہتا تھا یا چیخ چیخ کر رونے لگتا تھا۔ بعض اوقات بیوی میرے پاس بیٹھی ہوتی تھی تو بچہ رونے لگتا تھا۔ بیوی اٹھ بھاگتی تھی اور رومانوں کے محل تہس نہس ہو جاتے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ میرے اور بیوی کے درمیان کوئی انسان حائل نہ ہو۔ اب بچہ بُری طرح حائل اور مخل ہو رہا تھا۔

چھ مہینوں تک میں اپنے بچے سے بیگانہ رہا۔ بیوی نے مجھے ایک بار بھی نہ کہا کہ یہ آپ کا اپنا بچہ ہے۔ اسے قریب جا کر دیکھ ہی لیں۔ وہ اپنا وعدہ پورا کر رہی تھی۔

ایک روز میں گھر آیا تو بیوی گھر نہیں تھی۔ بچہ پلنگ پر لیٹا ہوا بہت تیزی سے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ میں نے بالکل پروا نہ کی کہ ماں بچے کو اکیلا چھوڑ کر باہر نکل گئی ہے۔ بچے نے مجھے دیکھا تو اس کے ہاتھ پاؤں ساکن ہو گئے اور اس

نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کسی اجنبی کو دیکھتے ہیں۔ مجھے روزمرہ کی طرح اسے نظر انداز کر کے اپنے کمرے میں چلے جانا چاہیئے تھا لیکن صحن میں دو بلیاں لڑتی ہوئی آ گئیں۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئیں تو دونوں نے ایسی ڈراؤنی آوازیں نکالیں کہ کسی کوشش کے بغیر مجھے خیال آ گیا کہ بچہ ڈر جائے گا۔ میں بلیوں کو بھگانے کے لیے اس طرح دوڑا جیسے بلیاں میرے بچے کو اٹھائے جانے کو آئی ہوں۔ جب وہ بھاگ کر باہر نکل گئیں تو مجھے دلی سکون محسوس ہوا۔ میں آہستہ آہستہ بچے کی چارپائی کے قریب آ گیا۔ بچہ مجھے دیکھ کر ہنس پڑا۔ بغیر دانتوں کا منہ غنچے کی طرح کھل اٹھا۔ میں بے خیالی میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ میرا ایک ہاتھ بچے کے قریب چلا گیا۔ اس نے میری دو انگلیوں کو پھول جیسے ہاتھوں میں پکڑ لیا اور انگلیوں کو منہ میں ڈال کر چوسنے لگا۔ میں بالکل فراموش کر چکا تھا کہ میرے دل میں اس بچے کے خلاف نفرت بھری ہوئی ہے بلکہ مجھے اس طرح کا سکون آنے لگا جیسے بچہ انگلیوں کے راستے میرے دکھ اور میری یادوں کی تلخی چوس رہا ہو۔

سیڑھیوں سے کسی کے اترنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میرے دل میں بیگانگی عود کر آئی۔ میں نے بڑی بے رحمی سے اپنی انگلیاں بچے کے منہ اور ہاتھوں سے نکال لیں اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ سیڑھیوں سے میری بیوی اتر رہی تھی۔

میں بچے سے پھر بیگانہ تو ہو گیا لیکن بچے کے ہونٹوں نے میری انگلیوں کے راستے میرے اندر ایک سرور پیدا کر دیا تھا۔ میں اس سرور سے بیگانہ نہ ہو سکا۔ اسی رات میں معلوم نہیں کیوں جاگ اٹھا۔ چھوٹا بلب جل رہا تھا۔ میں نے ماں اور بچے کو دیکھا دونوں مجھے ایک جیسے معصوم دکھائی دیئے۔ میں انہیں کچھ دیر دیکھتا رہا۔ میرے دل میں ہلچل سی ہونے لگی جسے میں اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔ صرف اتنا ہی احساس پریشان کر رہا تھا کہ میں زیادہ عرصے تک بچے سے بیگانہ نہیں رہ سکوں گا۔

اس رات کے بعد بھی میں بچے سے حسب معمول دور رہنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر اب یہ تبدیلی پیدا ہو گئی تھی کہ مجھے اس کو نظر انداز کرنے کے لیے کوشش کرنی پڑتی تھی۔ ایک روز میں بازار سودا سلف لینے گیا تو ایک آدمی کھلونے بیچ رہا تھا۔ جھنجھنے

بھی تھے۔ ایک آدمی نے ایک بچے کو اٹھا رکھا تھا۔ بچہ کھلونوں کی ضد کرنے لگا تو باپ نے اسے پلاسٹک کا جھنجھنا لے دیا۔ بچہ جھنجھنا بجا بجا کر اس قدر زور سے قہقہے لگانے لگا کہ اس کے پوپلے سے منہ کو کھلا دیکھ کر میری بھی ہنسی نکل گئی —— اور میں نے کسی ان جانی طاقت کے زیر اثر ایک جھنجھنا خرید لیا۔ جب گھر جا کر جھنجھنا بچے کے ہاتھ میں دیا تو اس کی جھنکار اور بچے کے قہقہوں نے میرے گھر کو خوشبوؤں سے بھر دیا۔ میری بیوی حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میں پشیمان سا ہو گیا۔ بیوی نے مجھے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ مجھے دیکھ ہی رہی تھی کہ میں نے کہا۔ "میں کام پر جا رہا ہوں" —— اور میں گھر سے نکل گیا۔ اس روز میں اپنے آپ سے بہت لڑا جھگڑا۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسا لیکن بچے کے قہقہے میرے ارد گرد گونجتے رہے۔

چند دن بعد کا ذکر ہے۔ رات شاید آدھی گذر گئی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے ماں اور بچے کو بے فکری کی نیند سوئے دیکھا —— اچانک بچہ رونے لگا۔ اس کی ماں اتنی گہری نیند سوئی ہوئی تھی کہ پہلو میں روتے ہوئے بچے کا غل غپاڑہ بھی اسے جگا نہ سکا مجھے بیوی پر رحم آ گیا۔ میں نے آہستہ سے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور اس کے گلے سے لٹکتی ہوئی چوسنی اس کے منہ میں دے دی۔ وہ چپ ہو کر چپڑ چپڑ کرنے لگا۔ میں اسے اٹھا کے کمرے میں ٹہلنے لگا اور ٹہلتے ٹہلتے اپنی انگلی اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اس نے منہ سے چوسنی گرا کر میری انگلی منہ میں ڈال لی۔ میں نے انگلی نکالی تو وہ رونے کی بجائے میرے منہ کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد بچے نے مجھے بھی بچہ بنا دیا۔ وہ انگلی منہ میں لے کر خود ہی باہر نکال دیتا اور ہنسنے لگتا۔ ہم دونوں بہت دیر یہی کھیل کھیلتے رہے اور بچہ سو گیا —— خون نے خون کو پہچان لیا تھا۔

میں بھی سو گیا تھا جب بچے کی ماں کی آنکھ کھل گئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ بچے کو میرے پہلو میں دیکھ کر اس کے تاثرات کیا تھے۔ صبح اس نے اتنا ہی بتایا کہ اس نے رات کو ہی بچے کو میرے پہلو میں دیکھ لیا تھا لیکن اٹھایا نہیں تھا۔

اس نے مجھ سے نہ پوچھا کہ بچہ میرے پاس کس طرح پہنچ گیا تھا۔ صرف اتنا کہا —— " دیکھا بچّے کو آپ کے ساتھ کتنا پیار ہے"—— اور میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا —— "میرا اپنا بچّہ ہے نا!"

اس رات کے بعد بچّے سے دور رہنا میرے لیے ناممکن ہو گیا۔ میں نے شکست تسلیم کر لی اور بچّے کو سینے سے لگا لیا۔ نفرت کی جگہ ایسے پیار نے لے لی جو میری مزاحمت کے باوجود بچّے نے خود میرے دل میں داخل کر دیا تھا۔

جب بچہ بڑا ہونے لگا تو از خود ہی یہ خیال میرے دماغ میں آ گیا کہ بچّے کے مستقبل کا ضامن میں ہوں اور اپنے آپ ہی یہ خیال بھی آیا کہ جب بوڑھا ہو جاؤں گا تو یہ بچّہ میری صحیح تصویر ہو گا اور اس دنیا میں میرے نام کو زندہ رکھے گا —— ننھا سا اور بے بس سا بچّہ مجھے پیار کی زنجیروں میں جکڑ کر زندگی کے حقیقی راستے پر لے آیا۔

مجھ میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گیا اور میں نے سوچا کہ میری آمدنی تھوڑی ہے۔ بچّے کی خاطر آمدنی میں اضافہ ہونا چاہیئے۔ میری طبیعت سے لاابالی پن اور بے پروائی اپنے آپ ہی نکلنے لگی اور میں فیکٹری کے سامان کے لیے نئے آرڈروں کی فراہمی کے لیے بھاگنے دوڑنے لگا۔ یہ بھاگ دوڑ صرف بچّے کی خاطر تھی۔ اس کے نتیجے میں آرڈر زیادہ ملنے لگے اور کمشن بھی بڑھ گئی۔

پھر میری زندگی میں وہ وقت آیا کہ میں بچّے کو بڑے فخر سے سکول لے گیا اور ہیڈ ماسٹر سے کہا —— "یہ میرا بچّہ ہے۔ اسے پہلی جماعت میں داخل کر لیجیئے"—— میری آواز میں فتح کا رنگ تھا۔ بچّے کو داخل کرا کے میں گھر آیا تو بیوی سے پہلی بات یہ کہی —— " فرحت! اب ایک بچّہ اور ہونا چاہیئے۔ گھر میں کوئی کھلونا نہیں رہا"—— وہ بہت ہنسی۔

ایک سال بعد جب میرا پہلا بچّہ دوسری جماعت میں تھا، میرے ہاں بچّی پیدا ہوئی۔ یہ تو بچّے سے بھی پیاری تھی مگر مجھے یہ خیال آ گیا کہ اسے دوسرے گھر ... اس کی رخصتی کے لیے آج ہی سے سامان کر لیں۔ کون جانے کل کیا ہو جائے؛

اس ذمہ داری کے احساس نے مجھے یہ عقل دی کہ میں کیوں نہ دکان کھول لوں۔ وہاں ایک نوکر رکھوں اور خود فیکٹری کے لیے آرڈر بھی فراہم کرتا رہوں اور یہی مصنوعات اپنی دکان میں رکھوں۔ آرڈر کی کمشن الگ ملے گی اور منافع الگ ہو گا۔ میرے پاس پیسہ نہیں تھا۔ میں نے فیکٹری کے مالک سے کہا کہ میں آپ کی مصنوعات رکھنے کے لیے دکان کھولنا چاہتا ہوں مگر پیسہ نہیں ہے۔ اس نے خاصی رقم دے دی۔ اسے معلوم تھا کہ دکان میں اسی کا سامان فروخت ہو گا۔ میں نے دکان کھول لی جو چل نکلی۔

میری بھاگ دوڑ اور مصروفیت میں اتنا اضافہ ہو گیا جو کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ میں اسی محنت و مشقت سے گھبراتا تھا۔ لیکن بچوّں کی خاطر جب میں سرگرم رہنے لگا تو مجھے فخر اور سکون محسوس ہونے لگا۔ میرے اندر فرض کی لگن پیدا ہو گئی تھی۔ میری بیوی دو بچوں کی پرورش میں مصروف رہ کر بھی ہنستی مسکراتی رہتی تھی اور وہ مجھے پہلی رات والی دلہن ہی لگتی تھی۔

آج میرے چار بچے ہیں۔ پہلا بچّہ کالج میں ہے۔ میں اب آرڈر بک کرنے کے لیے بالکل نہیں بھاگتا۔ اب دو سیلزمین میرے لیے آرڈر بک کرتے ہیں اور میں انہیں کمشن دیتا ہوں۔ اگر بچّے پیدا نہ ہوتے تو میں ایک مردہ انسان ہوتا۔ —— مرتے دم تک دکان دکان پر جا کر آرڈروں کی بھیک مانگتا رہتا۔ بچوّں کے پیار نے مجھے ایسی جدوجہد سے روشناس کرایا کہ میں آج اپنی زندگی کی کہانی فخر سے سنا رہا ہوں۔

میری بیوی کے سر میں پہلا سفید بال آ گیا ہے۔ لیکن وہ مجھے پہلی رات والی دلہن لگتی ہے —— جب جسم بوڑھا ہو جاتا ہے تو پیار جوان ہو جاتا ہے!

یہ کرشمہ پیار کا ہے

ثمینہ ظہیر

رات کے گیارہ بج رہے تھے جب مجھے 'ڈاکٹر آن ڈیوٹی' کے ساتھ کار کے حادثے کے تین شدید زخمیوں کا استقبال کرنا پڑا۔ ہم آپریشن تھیٹر میں پہنچے پہلا اسٹریچر اندر لایا گیا۔ وہ زخمی خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے نبض پر ہاتھ رکھا اور میری طرف دیکھ کر سر ہلایا ۔۔۔ وہ مرچکا تھا۔ دوسرا اسٹریچر اندر آیا۔ زخمی کا چہرہ مسخ ہوگیا تھا۔ سر کے لمبے بالوں سے پتہ چلا کہ عورت ہے۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھی اور پھر سر ہلا دیا ۔۔۔ وہ بھی مرچکی تھی۔ تیسرا اسٹریچر لایا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے لٹا کر اوپر سے اس پر چٹان پھینکی گئی ہو۔ پسلیاں ٹوٹ کر پھیپھڑوں میں دھنس گئی تھیں۔ چہرہ ماتھے سے ٹھوڑی تک اس طرح کٹا ہوا تھا جیسے سامنے سے اُسے کلہاڑی ماری گئی ہو۔ ڈاکٹر نے نبض پر ہاتھ رکھا اور مجھے حیرت سے دیکھ کر کہنے لگا ۔۔۔ "نبض ابھی تک چل رہی ہے"۔۔۔ فقرہ پورا کیا ہی تھا کہ ڈاکٹر کے منہ سے نکلا ۔۔۔ "اوہ . . . . رک گئی ہے"۔

میں اس ہسپتال میں نرس تھی۔ خون اور موت تو ہماری روزمرہ زندگی کا معمول تھے۔ [illegible]ں، بسوں اور ٹرکوں کے کچلے ہوئے بچے ہمارے پاس لائے جاتے تھے۔ ان کے ما[illegible] باپ ان کی روندی مسلی ہوئی لاشوں کو ہمارے ہاں اٹھا لاتے تھے جیسے ہم قیمہ کیے ہوئے ان ننھے ننھے جسموں کو اصل حالت میں لے آئیں گے اور ان کی ماؤں اور بہنوں کی دلدوز چیخیں اور فریادیں ان جسموں میں جان ڈال دیں گی ۔۔۔ کراچی کے قیامت خیز اور ہنگامہ پرور شہر کی پُرہجوم سڑکوں پر خون بہتا ہی رہتا ہے اور ہسپتالوں کے در و دیوار فریادوں اور آہ و بکا سے لرزتے ہی رہتے ہیں۔

اُس رات جو تین لاشیں آئیں، ان میں سے ٹوٹی ہوئی پسلیوں والا لباس سے ڈرائیور معلوم ہوتا تھا اور مرد اور عورت یقیناً کار کے مالک تھے۔ وہ بچے نہیں تھے۔ بچوں کے باپ ہو سکتے تھے۔ تینوں لاشیں آپریشن تھیٹر سے اٹھا کر مردہ خانے بھیج دی گئیں اور میں دعا کرنے لگی کہ یا خدا، کوئی مجھے یہ نہ بتادے کہ یہ لاشیں میاں بیوی کی ہیں اور ان کے بچے گھر سوئے ہوئے ہیں۔

پولیس کے ایک آدمی نے ڈاکٹر کو ایک خون آلود وزٹنگ کارڈ دے کر کہا کہ یہ ایک لاش کی جیب سے نکلا ہے۔ ڈاکٹر نے خون صاف کرکے پڑھا اور میرے حوالے کرکے کہا:

"اس پر گھر کا فون نمبر دیا ہوا ہے۔ تم فون کرکے اس کے گھر والوں کو اطلاع دے دو۔ میں اپنی زبان سے کسی کو اس کے عزیز کی موت کی خبر نہیں سنا سکتا"۔

ڈاکٹر رحم دل ہو سکتا ہے مگر اتنا نرم دل نہیں کہ کسی کو موت کی خبر نہ سنا سکے لیکن اس نے بعد میں بتایا کہ اسے بھی یہی ڈر تھا کہ اگر فون پر کوئی بچہ بولا تو اسے کیسے بتا سکوں گا کہ تمہاری امی اور ابا کی لاشیں ہسپتال میں پڑی ہیں ۔۔۔ ڈاکٹر نے یہ ہولناک فرض مجھے سونپ دیا اور میں کانپتی ہوئی انگلیوں سے ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے لگی۔

ٹیلیفون کے ڈائیل نے گھوم کر ایک کہانی کو جنم دیا جو میری آپ بیتی بن گئی مگر سناتے ہوئے ڈرتی ہوں کہ پڑھنے والے اسے جھوٹی کہانی سمجھیں گے کیونکہ میں مرنے والوں کے بچوں کی سوتیلی ماں ہوں۔ سوتیلی ماں کو ظالم اور بے درد عورت سمجھا جاتا ہے اور ایسا سمجھنے والے غلط نہیں ہوتے لیکن ایسی سوتیلی مائیں بھی ہوتی ہیں جو اپنے خاوند

کے پہلے بچوں کے لیے ظالم اور بے درد نہیں ہوتی۔ میں انہی میں سے ہوں۔ میں جن بچوں کی سوتیلی ماں بنی، ان کا باپ بھی سوتیلا ہے اور لوگ کہتے تھے کہ ان تین بچوں کا اب اللہ ہی نگہبان ہے جن کی ماں بھی سوتیلی اور باپ بھی سوتیلا۔

نگہبان تو سب کا اللہ ہی ہوتا ہے۔ یہ اسی کی دین تھی کہ ہم دونوں کے دلوں میں ان تین بچوں کا پیار پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ بچے میرے خاوند کے بڑے بھائی کے بچے تھے۔ بڑے بھائی نے اسے اپنے بچوں کی طرح پالا، اپنے کاروبار میں ساتھ رکھا اور اچانک موت کے وقت تک اسے بچہ ہی سمجھتا رہا حالانکہ اس کی عمر چھبیس سال ہو گئی تھی اور وہ بھائی کا اتنا وسیع کاروبار اس کی نگرانی کے بغیر سنبھال لیا کرتا تھا۔

اور میرے دل میں ان بچوں کی محبت اس لیے پیدا ہوئی کہ میں خود سوتیلی ماں کے بے رحم سائے میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ باپ کو اتنا ہی یاد رہ گیا تھا کہ اس کے گھر میں پہلی بیوی سے ایک بیٹی ہے مگر وہ دوسری بیوی کے چاؤ چوچلوں میں بالکل ہی بھول گیا تھا کہ اس کی پہلی بیوی کی بیٹی بھی پیار اور شفقت چاہتی ہے جا۔ میری سوتیلی ماں کے بطن سے بچے پیدا ہونے لگے تو گھر میں میرا وجود محض ایک لڑکی کا وجود رہ گیا جو بچوں کو بہلا سکتی تھی، ان کی غلاظت دھو کر ان کے کپڑے بدل سکتی تھی، انہیں بوتل سے دودھ پلا سکتی تھی، برتن مانجھ سکتی تھی، ہانڈی روٹی کر سکتی تھی اور تنہائی میں اپنی ماں کو یاد کر کے روتی تھی مگر اس کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔

میرے غمخوار میرے آنسو تھے جو بہہ کر پیار کی پیاس بجھا دیتے تھے یا سکول کی کتابیں تھیں جنہیں میں نے سہیلیاں بنا لیا تھا۔ مجھ پر خاموشی طاری رہتی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلا دیا تھا کہ میرا باپ بھی مر گیا ہے۔ میں ایسے باپ کو مردہ ہی کہوں گی جسے اپنی بیٹی کا کوئی خیال نہ تھا اور اس نے بھی شاید اپنے آپ کو یقین دلا دیا تھا کہ اس کی بیٹی بھی پہلی بیوی کے ساتھ ہی مر گئی ہے۔ گھر میں ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اس طرح اجنبی ہو گئے تھے جیسے ریل گاڑی کے ڈبے میں دو مسافر بیٹھے ہوئے ہوں

اور دونوں مخالف سمت کی کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہے ہوں۔

میں نے گھر کے سارے ہی کام کیے۔ دس سال کی عمر میں میں نے سوتیلی ماں کی ڈانٹ ڈپٹ اور تھپڑ سہہ کر ہانڈی روٹی سیکھ لی تھی اور باورچی خانہ سنبھال لیا تھا۔ میرے جن گالوں کو میری ماں چوم چوم کر لال کر دیا کرتی تھی، وہ اب سوتیلی ماں کے تھپڑوں سے لال رہتے تھے۔ میں تو گیارہ بارہ سال کی عمر میں ہی گرہستن بن گئی تھی۔ مجھ سے بچپن کا پیار اور لڑکپن کی شوخیاں چھن گئی تھیں —— اور میرا وہی حشر ہوا جو سوتیلی ماؤں اور سگے باپوں کے ہاتھوں ان بچوں کا ہوتا ہے جن کی اپنی مائیں مر جاتی ہیں۔ میری کہانی نرالی اور عجیب نہیں۔ آپ نے ہزار بار سنی اور سنائی ہو گی۔

میں آپ کو ایک بچے کی کہانی سناؤں گی جس نے مجھے کھویا ہوا پیار دے دیا تھا۔ میں اسی بچے کی سوتیلی ماں ہوں۔

میں نے اسی چار دیواری میں جہاں میرے لیے پیار کی جگہ دھتکار اور کھیل کود کی جگہ سارے گھر کا ڈھیروں کام تھا، دس جماعتیں پاس کر لیں۔ میں افسانوں کی ہیروئن کی طرح سارے صوبے میں اول نہ آئی نہ کوئی ایسے اچھے نمبر لیے، بس پاس ہو گئی۔ مجھے پڑھنے کا وقت ہی کہاں ملتا تھا کہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی۔ میں سوچنے لگی کہ اب کیا کروں۔ ایسے اذیت ناک ماحول سے بھاگ کر جوان لڑکیاں پیار کی تلاش میں کسی فریب کار کی جھوٹی محبت کا شکار ہو جایا کرتی ہیں یا فلمی گانوں کی ہیروئن بن کر اخلاقی تباہی میں جا گم ہوتی ہیں لیکن خدا نے مجھے اس خطرناک رجحان سے بچائے رکھا۔ سکول میں میری دوستی ایسی لڑکیوں کے ساتھ ہو گئی تھی جن میں ایک تو غربت کی وجہ سے میری طرح چپ چپ رہتی تھی اور وہ میری ہی طرح سوتیلی ماؤں کے مظالم کا شکار ہو رہی تھیں اور ایک ایسے سنگدل باپ کے سلوک سے بجھی بجھی رہتی تھی جو چرس کا عادی تھا اور گھر میں مار پٹائی اور اودھم بپا کیے رکھتا تھا۔ صرف ایک ایسی سہیلی تھی جو ہر طرح خوش اور مطمئن تھی۔ کوئی غم نہ فکر۔

میٹرک کا امتحان ہو رہا تھا کہ ایک روز میں نے اپنی اس سہیلی کو بہت ہی

پریشان دیکھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے بڑے بھائی کو ایک کار نے ٹکر ماری ہے اور وہ گزشتہ شام سے ہسپتال میں پڑا ہے۔ پرچہ دے کر میں اس کے ساتھ ہسپتال چلی گئی۔ اس کے بھائی کو دیکھا۔ ٹخنے کے قریب سے ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس پر سخت لگا دیا گیا تھا۔ درد سے مریض تڑپ رہا تھا۔ میری سہیلی رو پڑی۔ اس کے بھائی کی یہ حالت تھی کہ درد سے وہ دانت پیستا اور آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ ایک بار اس نے تڑپتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اسے آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔ وہ شاید ایسے ہی سہارے کی تلاش میں تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی حالت ذرا سنبھلنے لگی اور اس نے میرے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی بہن اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ایک نرس آ گئی۔ اسے درد کے متعلق بتایا تو اس نے مریض کو مارفیا کا انجکشن دے کر درد کے احساس سے نجات دلا دی۔

ہم جب وارڈ سے نکلنے لگیں تو میں نے ایک نظر تمام مریضوں کو دیکھا۔ وہ سب زخمی تھے۔ بعض کے آپریشن بھی ہوئے تھے۔ بعض کراہ رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ رہی تھی کہ نرس وارڈ میں سے گزری۔ تمام مریض اسے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جن میں بے بسی، تشکر اور التجا تھی۔ انہیں دیکھ کر میرے اپنے دل کے زخم کھل گئے ــــ اور میں نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ ان کے زخموں کو میں سہلاؤں گی اور دکھیارے انسانوں کی تیمارداری کروں گی۔ اس فیصلے نے میرے دل کو ایسا سکون دیا جیسے نرس نے مجھے بھی مارفیا کا انجکشن دے دیا ہو۔

اس روز کے بعد میں کئی بار سہیلی کے ساتھ اس کے بھائی کو دیکھنے ہسپتال گئی اور مریضوں کو دیکھتی رہی۔ میں کچھ ایسے محسوس کرنے لگی جیسے یہ سارے مریض اس انتظار میں ہوں کہ میں نرس بن کر آؤں اور ان کی تیمارداری کروں۔ نرسنگ کا پیشہ میری رگ رگ میں سما گیا۔

میٹرک کا نتیجہ نکلا تو میرے گھر میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ابا جان کو میں

نے بتایا کہ میں پاس ہو گئی ہوں تو انہوں نے پوچھا ــ "کتنے نمبر آئے ہیں؟" ــــ میں نے جواب دیا ــــ "چار سو بتیالیس" ــــ انہوں نے بے تعلقی کے لہجے میں کہا۔ "بہت تھوڑے ہیں" ــــ اور بات ختم ہو گئی۔

اب میرے ہسپتال جانے کا کوئی بہانہ نہیں رہ گیا تھا۔ سہیلی کا بھائی کبھی کا تندرست ہو کر آ چکا تھا۔ ایک روز میں ایک سہیلی کے گھر جانے کے بہانے ہسپتال چلی گئی اور سرجیکل وارڈ کی نرس کے پاس جا بیٹھی۔ جب میں ہسپتال جایا کرتی تھی تو دو تین نرسوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کر لی تھی۔ میں نے اس نرس کو اپنی ماں کی موت، باپ کے سلوک اور سوتیلی ماں کے مظالم کی ساری داستان سنا ڈالی اور میں بہت ہی روئی۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں نرس بن کر ان لوگوں کی تیمارداری کرنا چاہتی ہوں جو کسی اذیت ناک روگ میں مبتلا ہو کر یہاں آتے ہیں۔ میرے جلتے ہوئے دل کو اسی طرح سکون ملے گا۔

اس نرس نے مجھے ٹریننگ کے لئے منتخب کرا دیا۔ جب مجھے ٹریننگ کے لیے سرکاری طور پر بلایا گیا تو میں نے ابا جان کو بتایا۔ انہوں نے میری سوتیلی ماں سے پوچھا تو وہ مجھ پر برس پڑی۔ اسے پہلی مرتبہ میری عزت اور عصمت کا خیال آیا تھا۔ اس نے کہا کہ شریف گھرانوں کی لڑکیاں نرسیں نہیں بنا کرتیں۔ یہ تو آوارہ لڑکیوں کا پیشہ ہے جنہیں اپنی اور اپنے خاندان کی عزت کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔

میں جانتی تھی کہ اسے صرف یہ غم کھانے لگا ہے کہ گھر میں ایک نوکرانی تھی، وہ ہاتھ سے جا رہی ہے۔ مجھ سے زیادہ اچھی اور جفاکش نوکرانی اسے کہاں مل سکتی تھی؟ میں نے صاف کہہ دیا کہ میں اپنی کوشش سے منتخب ہو گئی ہوں اور اب رکوں گی نہیں۔ ابا جان اس عورت سے اس قدر دبکے ہوئے تھے کہ خاموشی سے سنتے رہے۔ جب میری سوتیلی ماں نے ایک بار پھر اپنی اور خاندان کی عزت کا نام لیا تو میں نے بچپن سے جو غبار دل میں رکا ہوا تھا، وہ بارود کی طرح پھٹ گیا۔ میں نے کہا:

"نہ میری کوئی عزت ہے نہ میں اس گھر کو عزت کے قابل سمجھتی

ہوں۔ اگر آپ نرسوں کو آوارہ سمجھتی ہیں تو میں بھی آوارہ ہو جانا چاہتی ہوں اور اگر آپ مجھے روکنا چاہتی ہیں تو میری ٹانگیں توڑ دیں تاکہ میں چل نہ سکوں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ کو میرے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں نہ آپ کو میری عزت کا خیال ہے۔"

سوتیلی ماں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسے مجھ سے بہت ہمدردی ہے، جوتی اٹھا کر میری طرف لپکی۔ پیار کی مسلسل محرومی اور مظالم نے مجھے ایسی دلیری دی کہ میں نے لپک کر ماں کی کلائی پکڑ لی اور دھیمی سی آواز میں کہا ــــ "اب مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گی تو جوتی کا جواب جوتی سے دوں گی"ــــ ابا جان نے اسے کندھے سے پکڑ کر پیچھے کر دیا۔ انہیں شاید احساس ہو گیا تھا کہ لڑکی جوان ہو گئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جس سے محلے برادری میں ناک کٹ جائے۔ انہوں نے غصے کا اظہار نہ کیا۔ بے رخی سے مجھے کہا ــــ "جاؤ۔ جو جی میں آئے کرو۔ نرسنگ کی ٹریننگ اچھی لگتی ہے تو وہی حاصل کر لو"ــــ میں کمرے میں گئی۔ فارم اور قلم اٹھا لائی۔ باپ کا تحریری اجازت نامہ ضروری تھا۔ میں نے قلم ابا جان کو دے کر فارم آگے کر دیا اور کہا ــــ "یہاں دستخط کر دیجیے"ــــ انہوں نے دستخط کر دیئے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں ٹریننگ کے دوران ہوسٹل میں رہوں گی تو انہوں نے اجازت دے دی۔

اور اس طرح میں سوتیلی ماں کی با مشقت قید سے آزاد ہو گئی۔ جوان لڑکیوں کو ڈولی میں ڈال کر گھر سے رخصت کیا جاتا ہے۔ مگر میں چپ چاپ، تن تنہا، اٹیچی کیس اٹھا کر گھر سے نکل آئی ــــ سوتیلی ماں کو الوداعی سلام کیا تو اس نے ماتھے پر نفرت کے بل ڈال کر منہ پھیر لیا جس کا مطلب یہ تھا کہ میں اب اس گھر میں کبھی واپس نہ آؤں۔ میں اپنے ماں باپ کے گھر کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر چلی آئی۔

آج بارہ سال گزر گئے ہیں۔ میں نے اس گھر کو دور سے بھی نہیں دیکھا۔ گھر سے ٹریننگ سنٹر پہنچی۔ دو روز بعد ٹریننگ شروع ہو گئی۔ جب ٹریننگ ختم ہوئی تو مجھے اس ہسپتال میں ملازمت دے دی گئی۔ ہسپتال کے رہائشی حصے میں چھوٹا سا ایک کوارٹر بھی مل گیا اور میں نے اپنی زندگی مریضوں کی تیمارداری کے لیے وقف کر

دی۔ میرا دل پیار کا پیاسا تھا۔ یہ پیاس مریضوں نے بجھا دی۔ روگی انسانوں کے ساتھ پیار اور شفقت سے باتیں کرتے کرتے میرا روگ ختم ہو گیا۔

وارڈوں میں خصوصاً پرائیویٹ کمروں میں مجھے تلخ تجربات بھی ہوئے۔ بعض مریض میری مخلصانہ تیمارداری اور مسکراہٹ کو غلط سمجھ بیٹھتے تھے۔ مجھے محبت کے پیغام دیئے گئے۔ پکچر، پکنک اور پارٹیوں کی دعوتیں دی گئیں ــــ صحت یاب ہو کر جانے والے بعض مریضوں کے خطوط بھی ملے جو فلمی مکالموں سے بھرے ہوئے تھے لیکن میں نے اپنے لیے جو راہ متعین کر لی تھی، اس سے مجھے کوئی بھی گمراہ نہ کر سکا۔

میں نے اس ہسپتال میں چار سال گزار دیئے اور وہ رات آئی جب خون میں نہائی ہوئی تین لاشیں آئیں اور میں نے ٹیلی فون کا نمبر ملایا۔ تھوڑی دیر گھنٹی بجتی رہی اور میرا دل دھک دھک کرتا رہا۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ کوئی بچہ نہ بول بیٹھے۔ آخر کسی نے ریسیور اٹھایا اور مردانہ آواز سنائی دی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ علیم الدین صدیقی صاحب کا گھر ہے؟"ــــ جواب ملا ــــ "جی، انہی کا گھر ہے لیکن وہ حیدر آباد چلے گئے ہیں۔ کل شام واپس آئیں گے۔۔۔ فرمایئے کوئی پیغام؟ آپ کون بول رہی ہیں؟"ــــ میں نے بتایا کہ میں فلاں ہسپتال سے بول رہی ہوں۔ نرس ہوں تو دوسری طرف کی مردانہ آواز گھبرا گئی۔ "ہاں، ہاں، مس۔۔۔ فرمایئے خیریت تو ہے۔ میں صدیقی صاحب کا چھوٹا بھائی بول رہا ہوں۔"

میری آواز لرز گئی۔ بڑی مشکل سے سنبھل کر میں نے کہا ــــ "مجھے افسوس ہے کہ صدیقی صاحب حیدر آباد نہیں پہنچ سکے۔ کراچی سے تھوڑی دور ایک ٹرک نے ان کی کار کو تباہ کر دیا ہے اور۔۔۔۔ اور۔۔۔" میں ہکلا کر خاموش ہو گئی۔

ادھر سے سخت گھبرائی ہوئی آواز آئی ــــ "ہاں، ہاں مس جلدی بتایئے۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو مس۔۔۔۔ کیا بھائی جان زخمی ہو گئے ہیں؟۔۔۔ بھابی جان تو ٹھیک

ہیں نا؟ وہ بھی ان کے ساتھ تھیں؟ .... کم بخت ڈرائیور اناڑی تھا .... ہاں، ہاں بتایئے نا، وہ کیسے ہیں، کہاں ہیں؟"

"مجھے سخت افسوس ہے کہ ...." میں نے رُکتے رکتے کہا — "تینوں کو ہسپتال اس وقت لایا گیا جب تینوں ... مجھے معاف کر دینا۔ ایسی جانکاہ اطلاع دینا بھی میرے فرائض میں شامل ہے۔"

"او خدا ...." اُدھر سے رندھی ہوئی آواز سنائی دی۔ "اس حادثے کے ساتھ دوسرا بڑا حادثہ یہ ہے کہ ان کے تین بچے ہیں ... یہ بھی اچھا ہوا .... یا اچھا نہیں ہوا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں تھے۔"

"آپ اگر ابھی آجائیں تو آپ کو ہسپتال کی ایمبولینس مل جائے گی۔" میں نے غم سے دبی ہوئی آواز میں کہا — "اور اگر بچوں کے پاس اور کوئی نہ ہو تو صبح آ کر ...." میں پھر چپ ہو گئی کیونکہ میں یہ نہیں کہنا چاہتی تھی کہ لاشیں لے جایئے۔

"میں ابھی آجاؤں گا۔" اُدھر سے جواب ملا — "بچے سوئے ہوئے ہیں۔" اور اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ تین بچوں کے خیال سے میرا دل غم سے بوجھل ہو گیا اور میرا اپنا غم تازہ ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک جواں سال اور خوش پوش آدمی میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے سسک کر کہا — "صدیقی صاحب ...." میں اٹھی اور اسے مردہ خانے میں لے گئی۔ لاشیں دیکھ کر وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا — حادثوں اور لڑائی جھگڑے میں مرنے والوں کی لاشیں ورثا کو اتنی جلدی نہیں ملا کرتیں۔ کاغذی کارروائی کرنی ہوتی ہے اور پولیس کے براہِ راست تعلق کی وجہ سے قانونی کارروائی بھی ہوتی ہے۔ یہاں بھی یہی مسئلہ درپیش تھا۔ کار کراچی سے چند میل دُور ایک درخت سے ٹکرا کر کچلی ہوئی کھڑی تھی اور سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک ٹرک الٹا پڑا تھا لیکن اس میں کوئی آدمی نہیں تھا۔ ٹرک والے شاید زیادہ زخمی نہ ہونے کی وجہ سے بھاگ گئے تھے۔ اس وقت یہ

سڑک سُپر ہائی وے نہیں بنی تھی۔ تنگ اور ٹوٹی پھوٹی سڑک ہوا کرتی تھی۔ ایک ویگن حیدر آباد کی طرف سے آ رہی تھی جو کار کو دیکھ کر رک گئی۔ ویگن والوں نے کار سے لاشیں نکالیں اور ہسپتال لے آئے۔ اب وہ بھی ہسپتال میں بیٹھے پولیس کو بیان لکھوا رہے تھے۔

میں اس جواں سال آدمی کو مردہ خانے میں سے اپنے کمرے میں لے آئی۔ اس نے بتایا کہ اپنے بھائی کے تین بچوں کے سوا اب دنیا میں اس کا کوئی نہیں رہا۔ دونوں بھائی ہندوستان سے آئے تھے۔ ان کے ماں باپ ہندوستان میں ۱۹۴۷ میں شہید ہو گئے تھے۔ کراچی میں آ کر مرحوم نے ایک کاروبار شروع کیا جو چل نکلا۔ اس نے شادی کی اور اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے بچوں کی طرح لکھا پڑھا کر اپنے کاروبار میں لگا لیا — اور اُس رات وہ بھائی جو اس کے لیے ماں بھی تھا اور باپ بھی، اپنے تین بچے اس کے سپرد کر کے بچوں کی ماں سمیت دنیا سے اٹھ گیا۔ اب چھوٹے بھائی کو جس کا نام ظہیر الدین صدیقی ہے، بھائی اور بھابی کی موت کا ہی غم نہ تھا، وہ بچوں کے لیے زیادہ پریشان تھا۔ اس نے بتایا کہ بچوں میں بڑی ایک بچی ہے جس کی عمر گیارہ سال ہے۔ دوسرا لڑکا، عمر آٹھ سال اور تیسری بچی چھ سال کی ہے۔

نرس کی حیثیت سے میری ڈیوٹی ختم ہو گئی تھی۔ میں نے مرنے والوں کے وارث کو ہسپتال بلا کر لاشیں دکھا دی تھیں اور اب ظہیر الدین صدیقی کے ساتھ ہمدردی کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھی لیکن میری جذباتی حالت ایسی ہو گئی جیسے میری اصل ڈیوٹی اب شروع ہوئی ہو۔ میری ماں بھی بچپن میں مر گئی تھی اور باپ بھی جیتے جی سمجھو مر ہی گیا تھا۔ ان تین بچوں کی جذباتی حالت کو صرف میں سمجھ سکتی تھی۔ میں بے تاب ہونے لگی کہ جا کر ان بچوں کو سینے سے لگا لوں اور انہیں اتنا پیار دوں کہ وہ اپنی ماں کو بھول جائیں۔

یہی کچھ سوچتے سوچتے مجھے خیال آ گیا کہ جب بچے جاگیں گے اور گھر میں اپنے ابّا اور امّی کی لاشیں دیکھیں گے تو ان پر کیا گزرے گی؟ اس خیال سے میرے آنسو نکل آئے پھر میں سسک سسک کر رونے لگی۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا تھا جب میں سات

سال کی ننھی سی بچّی تھی، امّی کی میّت کے پاس کھڑی سوچ رہی تھی کہ امّی جاگتی کیوں نہیں؟ بولتی کیوں نہیں؟ اور لوگ رو کیوں رہے ہیں؟ پھر میں اُس وقت روئی تھی جب لوگ امّی کو اٹھا لے گئے اور اس کے بغیر واپس آئے تھے۔

ظہیر نے میرا ہاتھ تھام کر کہا — "آپ تو مجھے دلاسا دے رہی تھیں" — میں نے جواب دیا — "میری ماں اسی عمر میں مری تھی" — اپنے غم کو آنسوؤں کے راستے بہا کر میں نے ظہیر سے بچّوں کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا کہ اب انہیں کون سنبھالے گا؟ اس نے بتایا کہ نوکر کے سوا کوئی بھی سنبھالنے والا نہیں۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا — "کبھی کبھار میں آ جایا کروں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟ بچّوں کا دل بہلانے کی کوشش کروں گی۔ اس سے میرا اپنا دل بہل جایا کرے گا" — اس کے ساتھ ہی میں نے کہا — "لیکن میں بہت دنوں بعد آؤں گی۔ ابھی نہیں۔ میں اس منظر کو برداشت نہیں کر سکوں گی جب بچّے ابّا اور امّی کے جنازوں کو اکٹھے جاتا دیکھ رہے ہوں گے.... نہیں... نہیں... ظہیر صاحب، میں یہ منظر نہیں دیکھ سکوں گی.... بیس پچیس روز بعد ٹیلی فون کر کے میرا پتہ کر لیجئے گا۔ پھر مجھے لینے آ جایئے گا۔"

لاشیں چلی گئیں۔ ایسی کئی لاشیں میرے اپنے ہاتھوں گئی تھیں۔ زخمیوں نے [illegible]ے ہاتھوں میں آخری سانسیں لی تھیں۔ میں نے ان کی ماؤں، بہنوں اور بچّوں [illegible] ہسپتال کے برآمدوں میں دھاڑیں مارتے، بین کرتے اور بلک بلک کر روتے اکثر دیکھا تھا مگر ان تین لاشوں نے میرے سینے میں ایسی خلش پیدا کر دی جو تلخ ہوتی گئی۔ ہزار کوشش کے باوجود مٹ نہ سکی۔ ذہن میں یہی ایک تصور جم کے رہ گیا کہ دو جنازے جا رہے ہیں اور تین بچّے حیران و پریشان کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں، چہرے پر بچپن کا بھولپن نہیں اور وہ خلاؤں میں ٹکٹکی باندھے ہوئے ہیں۔ ذہن کو اس تصور سے خالی کرنے کی بہت کوشش کی لیکن تصور پختہ ہوتا چلا گیا۔

بیس دن گزر گئے۔ مجھے ٹیلی فون پر ظہیر کی آواز نہ سنائی دی۔ تین چار دن مزید انتظار کر کے میں نے خود ہی اسے ٹیلی فون کیا۔ بچّوں کے متعلق اس نے بہت کچھ بتایا۔ بڑی بچّی نے اس صدمے کو قبول کر لیا تھا اور چھوٹی بچّی کو بہلا لیا تھا۔ لیکن بچّہ جس کی عمر آٹھ سال تھی، عجیب سی ذہنی کیفیت میں تھا۔ ظہیر مجھے پریشانی سے بچانے کے لیے اپنے گھر نہیں بلانا چاہتا تھا۔ شاید وہ اس وجہ سے بھی ججھک رہا تھا کہ میں جوان تھی اور وہ بھی جوان تھا۔ آدمی شریف معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے لوگوں کی باتوں سے ڈرتا تھا لیکن مجھے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ میں تو بچّوں کی خاطر وہاں جانا چاہتی تھی۔ اگلے روز میری ڈیوٹی تین بجے تک تھی۔ میں نے ظہیر سے کہا کہ وہ تین بجے میرے پاس آ جائے۔

وہ آ گیا اور میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی۔ بہت خوبصورت چھوٹی سی کوٹھی تھی۔ بڑی بچّی ملی۔ میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اس نے پہلی بات یہ کہی — "ہمارے ابّا جان اور امّی جان فوت ہو گئے ہیں" — میں نے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو روکے رکھا۔ میں وہاں رونے نہیں بلکہ بچّوں کو بہلانے گئی تھی۔ بڑی بچی بھاگی گئی اور ننھی کو دوسرے کمرے سے لے آئی۔ پہلے تو وہ مجھ سے جھینپتی رہی پھر مانوس ہو گئی۔ انہوں نے مجھے اپنی امّی اور ابّا کی تصویریں دکھائیں اور ان کی ڈھیروں باتیں سناویں۔ میں ان کے ساتھ بچی بن گئی جس سے اجنبیت ختم ہو گئی۔ میں نے بڑی بچّی، پروین سے پوچھا:

"تمہارا ایک بھائی بھی ہے نا — کہاں ہے؟ اسے بھی بلا لاؤ۔"

"نہیں باجی!" — پروین نے منہ بسور کر جواب دیا — "جب سے امّی اور ابّا جان فوت ہوئے ہیں، اس نے ہمارے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ اکیلے کھیلتا ہے۔"

"تم اسے ساتھ رکھا کرو نا!" میں نے کہا۔ "جو کھیل وہ کھیلنا چاہے، وہی تم بھی کھیلا کرو۔"

"نا باجی" پروین نے کہا۔ "وہ بس امی کے ساتھ کھیلتا ہے۔ امّی اس کے

سانھ باتیں کرتی ہیں نا باجی!"

"امی کے سانھ کیسے کھیلتا ہے؟" میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

پروین نے پورے یقین سے کہا — "امی اس کے پاس آتی ہیں۔ اسے نظر بھی آتی ہیں۔ باجی، معلوم نہیں امی ہمیں کیوں نظر نہیں آتیں۔ کل بُبو نے بتایا تھا کہ امی سکول میں اس کے پاس آئی تھیں۔" بولتے بولتے پروین کی آواز بھرّا گئی اور وہ چپ ہوگئی۔

ظہیر آگیا۔ میں نے اسے پروین کی باتیں سنائیں تو اس نے کہا "میرے ساتھ آیئے" — اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ اس نے ایک کمرے میں مجھے لے جاکر دوسرا دروازہ کھولا تو اس طرف کوٹھی کا پچھلا برآمدہ تھا۔ آٹھ نو سال کی عمر کا ایک بچہ ہماری طرف پیٹھ کیے ایک کھلونے سے کھیل رہا تھا۔ یہ کھلونا چھوٹی سی موٹر تھی جو بہت پرانی معلوم ہوتی تھی۔ ظہیر نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بچے نے موٹر کو دھکا دے کر کہا — "امی دان۔ میلی موتل دیکھو... امی دان... امی دان" — وہ دو اڑھائی برس کے بچوں کی طرح توتلی زبان میں باتیں کر رہا تھا اور اس انداز سے بول رہا تھا جیسے اس کی امی اس کے پاس بیٹھی ہوئی ہو۔ اس کا نام ابرار ہے اور اسے بُبو کہتے ہیں۔ اس نے آہستہ سے سر گھمایا اور ہمیں وہاں کھڑے دیکھ لیا۔ اس کا چہرہ جو کھِلا ہوا تھا، بجھ کے رہ گیا۔ اس نے موٹر اُٹھائی اور آہستہ آہستہ چلتا برآمدے سے نکل گیا۔ اس کے چلنے کا انداز بتاتا تھا جیسے اس نے اپنی ہمت سے زیادہ وزن اٹھا رکھا ہو۔ میں نے ظہیر کی طرف دیکھا۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔

ہم اسی کمرے میں بیٹھ گئے۔ ظہیر نے آنسو پونچھ کر عجیب انکشاف کیا۔ کہنے لگا۔ "بھائی جان اور بھابھی کی لاشیں دیکھ کر دونوں بچیوں نے چیخ چیخ کر زمین اور آسمان کو ہلا دیا تھا لیکن بُبو چپ چاپ لاشوں کو دیکھتا رہا۔ میں نے اسے کہا 'بُبو! اب امی اور ابا جان کبھی واپس نہیں آئیں گے — بُبو نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا

پھر لاشوں کو دیکھا اور باہر نکل گیا۔ مردوں اور عورتوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہو گئے۔ جنازے چلے گئے۔ بچیوں کے گلے رو رو کر بیٹھ گئے تھے۔ دوسری کوٹھیوں کی عورتیں انہیں اپنے ساتھ لے گئیں۔ بہت پیار کیا مگر وہ رو رو کر پاگل ہوتی رہیں لیکن بُبو نے ایک آنسو نہ بہنے دیا۔ ہم جب اس کی امی اور ابا جان کو دفن کر کے آئے، تو یہ کوٹھی کے پھاٹک کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ میں نے دوڑ کر اسے اٹھا لیا اور اسے گلے لگا کر بہت ہی رویا لیکن بُبو کی آنکھیں خشک رہیں۔ اس کے ہاتھ میں یہ موٹر تھی۔ اس نے توتلی زبان میں کہا — "میلی امی موتل لائی ہے" — میں اس کی توتلی زبان سن کر حیران ہوا۔ یہ بات تو حیران کن تھی ہی کہ وہ بالکل ہی نہیں رویا تھا اور نہ ہی وہ ہنستا یا مسکراتا تھا۔

میرے کندھے سے وہ اُتر گیا اور اس برآمدے کے کونے میں جاکر موٹر سے کھیلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پروین اس کے پاس گئی تو اس نے پروین سے کہا — "پینو باجی! امی آئی تھی۔ کہتی تھی، بُبو دُودو پی لو۔ یہ دیکھو، امی موتل لائی ہے"۔ — اُس روز سے وہ توتلی باتیں کر رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ دو سال کی عمر میں وہ اسی طرح باتیں کیا کرتا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ وہ دو اڑھائی سال کا تھا جب اس کی امی اس کے لیے یہ موٹر لائی تھی۔ یہ موٹر تو کئی سال سے بیکار پڑی تھی جیسے ہم سب بھول چکے تھے۔ معلوم نہیں بُبو کہاں سے نکال لایا ہے۔

تھوڑے دنوں بعد پروین اور بُبو سکول جانے لگے۔ ایک روز بُبو کی استانی نے پروین کو کلاس میں بلا کر بتایا کہ بُبو کلاس میں بیٹھے بیٹھے اچانک اٹھ بیٹھتا ہے اور میرے پاس آکر کہتا ہے "مس میری امی آئی ہے۔ مجھے بلا رہی ہے اور وہ باہر نکل جاتا ہے۔ ایک روز میں اس کے پیچھے گئی تو دیکھا کہ وہ ایک درخت کے پاس بیٹھا توتلی زبان میں اپنی امی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موٹر تھی۔ جو وہ ہر روز بستے میں سکول لاتا ہے۔"

استانی کے بلانے پر میں سکول گیا تو اس نے مجھے بھی یہی باتیں بتائیں اور کہا کہ بچے کو بہلا کر اس کے ذہن سے ماں کی یاد مٹانے کی کوشش کریں۔ آج ایک مہینہ ہونے کو آیا ہے۔ وہ سکول سے آ کر کھانا کھاتا ہے اور کہتا ہے — "امی دان پانی"۔ اور ہم میں سے جو کوئی اسے پانی دیتا ہے، لے لیتا ہے۔ ہر وقت سنجیدہ رہتا ہے۔ پروین کو تفصیل سے سناتا رہتا ہے کہ امی آئی تھی اور اس نے میرے ساتھ یہ باتیں کی تھیں۔

میں اور ظہیر نفسیات کے علم سے بے بہرہ تھے۔ میری سمجھ میں یہی ایک طریقہ آتا تھا کہ بچے کے ساتھ پیار کیا جائے۔ اس کے سامنے امی کا نام نہ لیا جائے اور نہ کوئی اس کے سامنے روئے۔ اتنے میں نوکر نے بتایا کہ چائے تیار ہے۔ ہم چائے کی میز پر بیٹھے تو پروین بُو کو بلا لائی۔ وہ آ گیا اور ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر مسکرا کر کہا — "بُو جان، آؤ میری گودی میں بیٹھو۔" اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ آہ، اس کی آنکھوں میں غم جھلک رہا تھا۔ اتنا معصوم چہرہ اور اس قدر سنجیدہ؟ وہ پرے سرک گیا جیسے اسے میرا پیار یا میری مسکراہٹ پسند نہ آئی ہو۔ اس نے خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہا — "امی دان، پیسٹی۔" پروین نے اسے ایک پیسٹری دے دی تو وہ مجھے گھور کر دیکھتا اٹھا اور پچھلے برآمدے کی طرف چلا گیا۔

میری امی مر گئی تھی تو میں بھی ہر وقت یہی محسوس کرتی رہی کہ امی میرے قریب کھڑی ہے اور میرے ساتھ باتیں کر رہی ہے۔ میں نے اسے خوابوں میں بھی دیکھا تھا۔ اور اپنے گالوں پر اس کے ہونٹوں کے لمس کو بھی محسوس کیا تھا لیکن میری حالت بُو جیسی نہیں ہوئی تھی۔ میں روتی تھی تو کئی کئی گھنٹے روتی ہی رہتی تھی۔ آخر سوتیلی ماں کے تھپیڑوں نے مجھے خاموش کرا دیا تھا۔ بُو کے روگ کو صرف میں ہی سمجھ سکتی تھی۔

اُس روز میں شام کے وقت واپس آئی پھر میں تیسرے چوتھے روز وہاں چلی

جاتی۔ پروین اور بے بی تو میری سہیلیاں بن گئی تھیں مگر بُو بیگانہ رہا۔ وہ اسی برآمدے کے اسی کونے میں بیٹھا موٹر سے کھیلتا نظر آتا تھا۔ میں نے کئی بار اس کے پاس بیٹھ کر اسے پیار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہر بار مجھے گھور کر اٹھا اور باہر چلا گیا۔ ایک شام میں گئی تو ظہیر بہت ہی پریشان تھا۔ کہنے لگا کہ آج بُو سکول سے ایسا لاپتہ ہوا کہ پروین ڈھونڈ ڈھونڈ کر اکیلی گھر آ گئی۔ یہ بھی تو آخر بچی ہے۔ اس نے گھر سے مجھے ٹیلی فون کیا اور بتایا کہ بُو امی کے ساتھ کہیں چلا گیا ہے۔ پروین کو یقین ہو گیا تھا کہ امی واقعی بُو کے پاس آتی ہے۔ میں گھر پہنچا اور اس کی تلاش میں نکلنے لگا تو دیکھا کہ بُو چلا آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا — "بُو کہاں گئے تھے بیٹا؟" — تو متانت سے بولا — "امی کے ساتھ"— اور اس نے بتایا کہ امی اسے سکول سے لے گئی تھی اور وہ امی کے ساتھ سیر کرتا رہا ہے۔

اب بُو ایک ٹیڑھا مسئلہ بن گیا تھا۔ ظہیر اتنا پختہ عمر آدمی نہ تھا کہ کوئی حل سوچتا۔ وہ باتیں کرتے رو پڑتا تھا یا آہیں بھرتا تھا۔ میں نے اسے بہلانا شروع کر دیا۔ میں اسے اپنے دل کا روگ بتا چکی تھی۔ یہی روگ تھا جو مجھے ظہیر اور ان کے بچوں کی غمزدہ دنیا میں لے گیا تھا اور میں اس گھر کی فرد بن گئی تھی۔ ایک رات میں وہیں رہی۔ بچے سو گئے تو میں اور ظہیر کوٹھی کے لان میں گھاس پر جا بیٹھے اور باتوں باتوں میں رات کے دو بج گئے۔

ظہیر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور التجا کے لہجے میں بولا — "ثمینہ! تم نہ ہوتیں تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ اگر غلط نہ سمجھو..." وہ چپ ہو گیا اور ہکلا کر بولا — "اگر بُرا نہ مانو تو..."

"تو میں یہیں آ جاؤں؟" میں نے اس کی بات پوری کر دی۔

"ہاں ثمینہ!" اور وہ میرے ہاتھ کو اپنے سینے سے لگا کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

لوگ کہتے ہیں کہ محبت سارے غم دھو ڈالتی ہے لیکن ہماری محبت غموں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ فلمی مکالموں والی محبت نہیں تھی۔ یہ ایک درد تھا جو ہم دونوں

میں مشترک تھا۔ ظہیر نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور کہنے لگا ــــ "مجھے معاف کر دینا تمینہ! میں تم سے ایسی قربانی کی امید نہیں رکھوں گا اور نہ تمہیں ایسی کڑی آزمائش میں ڈالوں گا۔ تم نوجوان لڑکی ہو، میں تمہاری گود میں تین بچّے پھینک کر تمہاری جوانی کو دیمک نہیں لگنے دوں گا۔"

نیند کا خمار تھا اور غم کی شدت کہ میں نے کہہ دیا ــــ "میں ان بچوّں کی ماں بنوں گی ظہیر اور تم ان کے باپ ہو گے۔ میں اپنے فیصلوں میں آزاد ہوں۔ سب سے پہلے بُو کا دماغی علاج کرائیں گے پھر ہم شادی کریں گے۔"

معلوم نہیں ہم کتنی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے کہ ہم نے برآمدے میں چھوٹا سا ایک سایہ چلتے دیکھا۔ میں ڈر گئی۔ قدموں کی آواز بہت دھیمی تھی۔ رات تاریک تھی۔ ظہیر اچانک پکار اٹھا ــــ 'بُو' ــــ اور وہ دوڑ پڑا ــــ میں بھی دوڑی ــــ دیکھا بُو کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگیا تھا اور باہر کو چلا جا رہا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ بعض بچّے اور بڑے آدمی نیند میں چلتے ہیں اور میں نے یہ بھی سنا تھا کہ ایسے آدمی کو چلتے وقت جھنجھوڑنا یا بلانا نہیں چاہیے ورنہ اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ ڈر کر بے ہوش ہو سکتا ہے۔ میں نے ظہیر سے کہا اسے بلانا مت بلکہ کسی طرح اسے اندر لے جاؤ۔

ظہیر نے اس کے ساتھ چلتے چلتے آہستہ سے پوچھا "بُو کہاں چلے بیٹا؟" ــــ اس نے مخمور سی آواز میں جواب دیا "امّی دان کے پاش۔" ظہیر سے رہا نہ گیا۔ اس نے اسے اٹھا لیا اور میں نے دیکھا کہ بُو نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا اور گہری نیند سویا رہا۔ اسے اندر پروین کے پہلو میں لٹا دیا تو وہ کروٹ بدل کر سویا رہا۔ پھر وہ بڑبڑانے لگا ــــ "امّی دان ... میلی موتل کِدل ہے؟"

میں اور ظہیر ساری رات جاگتے رہے۔ صبح طلوع ہوئی تو میں اپنے ہسپتال چلی گئی۔ بُو میرے دل و دماغ پر آسیب کی طرح چھایا ہوا تھا۔ نیند میں چلنا بہت ہی خطرناک تھا۔ میں نے ہسپتال کے دماغی امراض کے ڈاکٹر سے بات کی تو اس نے اسی شام میرے ساتھ چلنے کا وعدہ کیا۔ میں نے ظہیر کو ٹیلی فون پر اطلاع دے دی۔

شام پانچ بجے میں ڈاکٹر کو ظہیر کے گھر لے گئی۔ بُو اسی برآمدے کے کونے میں بیٹھا موٹر کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ڈاکٹر کو بُو کے متعلق ساری باتیں بتائی گئیں۔ اس کا توتلی زبان میں باتیں کرنا، اس موٹر سے کھیلنا جو اسے امّی نے دو اڑھائی سال کی عمر میں دی تھی اور ڈاکٹر کو خاص طور پر بتایا گیا کہ وہ امّی اور ابّا جان کی لاشیں دیکھ کر بالکل نہیں رویا تھا، اور نہ بعد میں کبھی رویا ہے۔

ڈاکٹر نے کہا ــــ "بچے کو یہ صدمہ بچپن کے اُس دور میں لے گیا ہے جب وہ توتلی باتیں کیا کرتا تھا۔ یہ موٹر اسے اسی عمر میں ملی تھی، لہٰذا موٹر اسے لقمہ دے رہی ہے کہ وہ دو اڑھائی سال کا بچّہ ہے اور اس کی امّی ابھی موجود ہے اور امّی اس کے پاس موجود ہے .... بچّے نے اس صدمے کو قبول نہیں کیا۔ وہ حقیقی دنیا سے رشتہ توڑ کر تصوّروں کی دنیا میں چلا گیا ہے جہاں اس کی امّی اور اس کے ابّا زندہ ہیں۔ بچّے کا نہ رونا اس کا ثبوت ہے۔ اس کا علاج آسان نہیں۔ اگر بچّے کو جھٹکے دے دے کر تصوّروں کی دنیا سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو وہ بالکل ہی پاگل ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تشدّد پسند ہو جائے۔ یہ صورت اس کے لیے اور گھر والوں کے لیے بہت ہی خطرناک ہو گی۔ اگر بچّہ رونے لگے تو وہ حقیقی دنیا میں واپس آ سکتا ہے مگر اسے رُلانے کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو اس کے تصوّروں کو مجروح نہ کرے۔ اسے یہ بھی نہ کہا جائے کہ تمہاری امّی مر گئی ہے۔"

ڈاکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ آخر کہنے لگا ــــ "میں سوچ کر بتاؤں گا ... بچّہ بڑے ہی خطرناک مقام پر کھڑا ہے۔ بعض غم وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوتے چلے جاتے ہیں مگر یہاں معاملہ خاصا سنگین ہے۔ آپ بچّے کو باہر لے جایا کریں۔ پکنک پر لے جائیں۔ سمندر کے کنارے چلے جائیں۔ ہو سکتا ہے بچہ سمندر کی وسعت سے متاثر ہو کر تصوّروں کی دنیا سے نکل آئے لیکن یہ اثر نہایت آہستہ آہستہ ہو گا۔ ایک ہی بار نہیں۔ باہر جانے سے شاید کچھ بھی اثر نہ ہو۔"

ڈاکٹر کی باتوں سے ہمارے دلوں پر خوف طاری ہو گیا۔ میں ڈاکٹر کے ساتھ ہی واپس چلی گئی۔ راستے میں ڈاکٹر نے یہ کہہ کر میرے خوف کو اور زیادہ شدید کر دیا کہ بچّے کو

مینٹل ہسپتال میں داخل کرانا پڑے گا۔ مینٹل ہسپتال کو لوگ پاگل خانہ کہا کرتے ہیں جو بہت ہی خوفناک جگہ ہے۔ میرے آنسو نکل آئے اور میں سوچنے لگی کہ کیا اتنا خوبصورت بچہ اسی عمر میں پاگل خانے میں داخل ہو جائے گا؟ اور کون جانے وہ اس تاریک غار سے کبھی نکل بھی سکے گا یا نہیں اور ٹھیک ہو کر نکل بھی آیا تو پاگل خانہ آسیب کی طرح اس کے اعصاب پر قابض رہے گا۔

اور میں نے یہ بھی سوچا کہ خدا جانے ہمارے ملک میں ہر روز کتنے بچوں کی مائیں مر جاتی ہیں اور بچے تصوروں میں ان کے ساتھ باتیں کرتے ہیں اور سوتیلی ماں اور سنگدل باپ انہیں بالکل ہی پاگل بنا دیتے ہیں۔ کتنے غنچے بن کھلے مرجھا جاتے ہیں۔ کتنی صلاحیتیں غموں کے زہر سے گل سڑ جاتی ہیں۔ میرا اپنا حشر کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا میں نے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے مجھے غم تو دیا لیکن دل میں دوسروں کے درد اور پیار کو زندہ رکھا۔ اب یہی پیار مجھے بُو کے لیے دیوانہ بنا رہا تھا۔ میں نے رو کر ڈاکٹر سے التجا کی کہ میں اس بچے کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ کسی روز اسے شہر سے دور کسی خوبصورت جگہ لے جائیں۔ اگر اثر اچھا ہو تو وقتاً فوقتاً اسے وہاں لے جایا کریں۔

کراچی میں ایسی خوبصورت جگہ کہاں؟ سوچتے سوچتے ہاکس بے کا خیال آیا۔ سمندر کا یہ کنارہ شہر کے ہنگاموں سے بہت دور ہے۔ منوڑہ اور کلفٹن بھی خوبصورت جگہیں ہیں لیکن کراچی کے شور و شر کی زد سے باہر نہیں۔ میں نے ہسپتال پہنچتے ہی ظہیر سے ٹیلی فون پر پکنک کا پروگرام طے کر لیا۔ سوال یہ تھا کہ بُو ساتھ چلے گا یا نہیں۔ اگر جانے پر راضی نہ ہوا تو اسے کس طریقے سے آمادہ کریں گے؟

تیسرے روز، تین بجے کے قریب میں ان کے ہاں پہنچ گئی۔ ظہیر، پروین اور بے بی پکنک کے لیے تیار تھیں اور بیتابی سے میری راہ دیکھ رہی تھیں۔ بُو کے متعلق پتہ چلا کہ وہ اسی برآمدے میں موٹر کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ اسے چلنے کو کہا گیا تھا لیکن وہ کھیلتا رہا جیسے اس نے بات سنی ہی نہ ہو۔ میں نے پروین سے کہا کہ

بُو سے کہو، آؤ بُو سمندر کے کنارے چلیں۔ امی بھی آ رہی ہیں۔ پروین نے اسے ایسے ہی کہا تو بُو آہستہ آہستہ چلتا ہمارے پاس آ گیا۔ وہ تیز نہیں چلتا تھا اور اس کے چہرے کا تاثر ایک ہی جیسا رہتا تھا ـــ خالی خالی سپاٹ سا چہرہ، آنکھیں خشک اور متبن۔

ہم ٹیکسی لے کر ہاکس بے چلے گئے۔ ایک ہٹ لے لی اور بچے باہر نکل گئے۔ جولائی کا مہینہ تھا۔ سمندر جوش میں تھا۔ ذرا پرے چھوٹی چھوٹی چٹانیں لہروں کو توڑ پھوڑ رہی تھیں اور لہریں پیچھے ہٹ کر دیواروں کی طرح آ آ کر ان سے ٹکرا رہی تھیں۔ بچے ساحل کی ریت پر بھاگنے دوڑنے لگے۔ میں اور ظہیر ہٹ کی کھڑکی سے بُو کو دیکھتے رہے۔ اس کی چال اور اس کے انداز میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اپنی موٹر ہاتھ میں لیے ایک جگہ بیٹھ گیا اور اسی طرح موٹر سے کھیلنے لگا جس طرح برآمدے میں کھیلا کرتا تھا۔ پروین اور بے بی اسے اپنے ساتھ بھگانے دوڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں اور ظہیر بچوں کی دنیا سے دور ہی رہنا چاہتے تھے۔

ساحل پر کچھ اور لوگ بھی بال بچوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے لیکن کوئی ایسی ناگوار بھیڑ نہیں تھی۔ میں اور ظہیر ہٹ میں بیٹھے بُو کے متعلق ہی باتیں کرتے رہے اور شادی کے پروگرام بناتے رہے لیکن بُو کا غم ذہن پر ایسا سوار تھا کہ شادی ہمارے لیے کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں تھا۔

شام کے پانچ بج رہے تھے جب ہم نے بچوں کو کھانے پینے کے لیے بلایا۔ پروین اور بے بی آ گئیں، بُو نہ آیا۔ پروین نے اسے ساتھ لانا چاہا تھا لیکن اس نے جواب دیا تھا کہ امی جان کے ساتھ آؤں گا۔ ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے اس کی مرضی کے خلاف نہ بلایا جائے۔ گھر میں اس کا یہی انداز تھا کہ اپنی مرضی سے چائے یا کھانے کے لیے آتا تھا اور آتے ہی کہتا ـــ امی وان، دُو دُو ـــ اور اسے جو کچھ بھی دو، کھا پی لیتا تھا۔ اب بھی ہم مطمئن رہے کہ وہ "امی جان" کے کہنے پر آ جائے گا۔

ہم سب کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔ بُو نہ آیا۔ آدھے پونے گھنٹے بعد ہم

سب باہر نکلے تو ببُو کہیں نظر نہ آیا۔ ہم اسے ڈھونڈنے لگے۔ دوسرے کنبوں کے دو دو چار چار بچے کہیں کہیں بیٹھے ریت کے محل بنا رہے تھے۔ ہم نے بچوّں کی ہر ایک ٹولی کو دیکھا۔ ببُو کسی ٹولی میں نہیں تھا۔ سمندر کی لہروں کا جوش بڑھ گیا تھا، مجھے بھیانک خیال آیا کہ ببُو سمندر میں ہی نہ چلا گیا ہو۔ میں نے گھبرا کر ظہیر سے کہا۔ "ظہیر، بھاگو اور ببُو کو دیکھو۔ میں دوسری طرف جاتی ہوں . . . ظہیر تیز بھاگو، ببُو کیوں نظر نہیں آتا" ___ میری گھبراہٹ دیکھ کر پروین رو پڑی اور اسے دیکھ کر بے بی بھی رونے لگی۔ میں نے پروین سے کہا کہ وہ دوسرے ہٹوں (کیبنوں) میں ببُو کو دیکھے۔ میں اور ظہیر چٹانوں کی طرف چل پڑے۔ ساحل پر ایک جگہ پانچ چھ بچے کھیل رہے تھے۔ ان سے پوچھا تو ایک بچےّ نے جواب دیا ___ "وہ پاگل بچہّ؟" ___ دوسرے بچوّں نے قہقہہ لگایا اور ہمیں جواب ملا ___ "وہ ہمارے پاس آیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح باتیں کرتا تھا۔ ہم نے اسے بھگا دیا تھا۔ وہ اس طرف چلا گیا تھا۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

پاگل کا لفظ میرے دل میں تیر کی طرح اتر گیا۔ ظہیر مرد تھا۔ یہ صدمہ پی گیا ہوگا۔ لیکن میں سر سے پاؤں تک لرز گئی ___ ماں کی موت نے ایک بچےّ کو ایسا پاگل کر دیا تھا کہ بچوّں نے اسے بھگا دیا تھا ___ ان بچوّں نے جس طرف اشارہ کیا تھا، اُدھر ماہی گیروں کا ایک گاؤں ہے۔ ظہیر اُس طرف دوڑ پڑا اور میں تیز تیز چلتی چٹانوں کی طرف چل پڑی۔ چٹانوں کا علاقہ ویران تھا جسے سمندری موجوں کا شور ڈراؤنا بنا رہا تھا۔ مجھے بار بار یہی خوف پریشان کر رہا تھا کہ سمندر نے ببُو کو اپنی امی کے پاس پہنچا دیا ہے۔ میں چلانے لگی ___ "ببُو ___ ببُو" ___ ظہیر دور نکل گیا تھا۔ پروین اور بے بی دوسری طرف ببُو کو ڈھونڈ رہی تھیں اور میں چٹانوں میں "ببُو ___ ببُو" ___ پکار رہی تھی۔

ساون کے بادل گہرے تھے جنہوں نے سورج کو چھپا رکھا تھا۔ شام ہونے کو تھی۔ یہ ایک اور خطرہ تھا۔ اچانک تھوڑی دُور ایک چٹان پر ایک سایہ اُبھرا ___ وہ ببُو

تھا ___ یہ چٹانیں کوئی ایسی بلند نہیں کہ گر کر کوئی مر جائے۔ خطرہ سمندر کا تھا اور ببُو ایسی جگہ کھڑا تھا، جہاں سے وہ سمندر میں گر سکتا تھا۔ نمناک ہواؤں اور موجوں کے اچھلتے قطروں سے چٹانوں پر پھسلن تھی۔ اپنے تصورّوں میں مگن بچہّ ذرا سی حرکت سے پھسل کر گر سکتا تھا۔ نیچے موجوں اور چٹانوں کی جنگ ایسی خوفناک تھی جس میں گر کر بچےّ کی بوٹی بھی نہ ملتی۔

میں اسے پکارنے لگی تو ہونٹ بند کر لیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے یہ خیال آگیا کہ میرے اچانک پکارنے سے وہ چونک نہ جائے اور اس کا پاؤں نہ پھسل جائے۔ میں نے اس تک خاموشی سے پہنچنے کا فیصلہ کر لیا اور چل پڑی۔ جب میں چٹانوں کے قریب پہنچی تو ببُو نظروں سے اوجھل ہو گیا کیونکہ وہ آگے کھڑا تھا اور میں دوسری طرف نیچے تھی۔ چٹان پر چڑھتے ہوئے میرے پاؤں پھسلنے لگے اور میں حیران ہونے لگی کہ ببُو کس طرح وہاں تک جا پہنچا ہے۔ میں نے سینڈل اتار پھینکے اور رینگ کر چٹان پر چڑھ گئی۔ ببُو سمندر کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ میں اس کے عقب میں چٹان پر اس طرح بیٹھ گئی کہ گھٹنے اور ہاتھ چٹان پر تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا ___ "ببُو" ___ اس نے گھوم کر دیکھا پھر گھوم کر میری طرف ہو گیا۔ اس کے چہرے پر وہی خالی خالی سا تاثر تھا اور آنکھیں سنجیدہ اور خشک۔ وہ چونک گیا تھا اور وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا ___ "اُف میرے خدا" ___ میرے منہ سے جیسے گھبرائی ہوئی سسکی نکل گئی ہو۔ بچے کے لیے اب پیچھے ہٹنے کو ایک اِنچ بھی جگہ نہیں تھی۔ وہ موت کے منہ میں کھڑا تھا۔ چٹان کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہوتی موجوں کے قطرے مجھے ہوا میں اڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ میری یا بچےّ کی ذرا سی لغزش اسے طوفانی سمندر میں گرا سکتی تھی۔ میں اب اسے پکارنے سے بھی ڈرنے لگی۔ صرف اللہ کا نام تھا جسے پکارنے لگی۔ ببُو کو اللہ کی ذات ہی بچا سکتی تھی۔

میرے آنسو بہنے لگے۔ میں وہیں پیٹ کے بل ہو گئی اور خدا سے مدد کی التجا کرنے لگی۔ میں نے آنسوؤں کی دھند میں سے دیکھا کہ ببُو نے آہستہ سے ایک قدم میری طرف اٹھایا پھر اس نے دوسرا قدم اٹھایا۔ میرے آنسو بہہ رہے تھے۔ ببُو میری طرف آ رہا تھا۔ وہ مجھ سے ایک قدم دور رک گیا۔ میرے سینے سے جذبات کا طوفان اُمڈ آیا اور

میں اسے بے تابی سے اٹھا کر سینے سے لگا لینے کو اٹھنے لگی لیکن اپنے آپ کو بڑی ہی مشکل سے روکا۔ میں اب بُو کو دیکھ رہی تھی کہ وہ کیا کرتا ہے۔

۵۸

اس نے آخری قدم کا فاصلہ بھی طے کر لیا اور میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اس نے میرے منہ کی طرف دیکھا اور ایک انگلی میری آنکھ کے نیچے رکھی اور آہستہ آہستہ انگلی کو میرے گال پر بہتے آنسوؤں کی لکیر پر پھیرتا انگلی کو میری ٹھوڑی تک لے گیا۔ اس نے دھیمی سی آواز میں کہا —"آپ لوتی ہیں؟"

میں اپنے قابو سے نکل گئی اور بُو کو دونوں بازوؤں کی لپیٹ میں لے کر اسے سینے سے لگا لیا۔ میں نے بے تاب ہو کر اس کے گال کو چوما اور کہا —"ہاں بُو، میں روتی ہوں۔ تم بھی روؤ.... روؤ بُو.... اپنے آپ کو فریب نہ دو۔ میں نے بھی اپنے آپ کو بہت فریب دیئے تھے۔ مری ہوئی مائیں واپس نہیں آیا کرتی بُو۔ وہ بچّوں کو رونے کے لیے پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ تمہارے آنسو کہاں ہیں بُو؟ بہا دو ان آنسوؤں کو۔ اس ننھی سی جان کو غموں سے نہ بھرو بُو......" میں پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر جو منہ میں آیا کہے جا رہی تھی۔ مجھے بالکل یاد نہیں رہا تھا کہ ڈاکٹر نے خبردار کیا تھا کہ بچے کو جھٹکے دے دے کر تصوّروں سے نکالا گیا تو یہ خطرناک کوشش ہو گی۔ میں اسے بڑے ہی شدید جھٹکے دے رہی تھی۔ میں اسی کی عمر کی بچّی بن گئی تھی جس کی ماں اسے رونے کے لیے اکیلا چھوڑ گئی تھی۔ موجوں کا شور بلند تھا، ساون کی ہوائیں تند تھیں اور میں بُو کو سینے سے لگائے چیخ رہی تھی۔

"تمہاری امّی کبھی واپس نہیں آئے گی.... میں تمہاری امّی ہوں.."

اچانک موجوں کے شور اور میری چیخ اور پکار میں مجھے بُو کی چیخ سنائی دی۔ اس نے چیخ کر کہا —"میری امّی"— وہ مجھ سے لپٹ گیا اور زور زور سے رونے لگا۔ میری گردن کے گرد اس کے چھوٹے چھوٹے بازوؤں کا گھیرا پھندا بن گیا۔ اس کی ہچکیوں سے میرا جسم ہل رہا تھا — اور معجزہ یہ ہوا کہ میں نے اپنی گردن پر اس کے آنسوؤں کی نمی محسوس کی۔ میں نے اس کا چہرہ اپنے سامنے کیا، دیکھا، اس کے آنسو

پانی کے دھارے کی طرح بہے جا رہے تھے۔ وہ پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کا منہ میرے کندھے پر تھا اور وہ روئے چلا جا رہا تھا۔

میں اسے روتا ہوا اٹھا لائی۔ بڑی مشکل سے چٹان سے اُتری۔ مجھے چھپاکا سنائی دیا۔ نیچے دیکھا، بُو کے ہاتھ سے موٹر گر پڑی تھی اور لڑھک کر نیچے جا رہی تھی۔ اس طرف سمندر کا تھوڑا تھوڑا پانی تھا۔ موٹر پانی میں ڈوب گئی — میں نے دل میں کہا "اچھا ہوا، بُو کا بچپن سمندر میں ڈوب گیا ہے۔"

ظہیر دوڑا چلا آ رہا تھا — میں نیچے آئی تو اس نے بُو کو مجھ سے لینا چاہا لیکن وہ اس کے پاس نہ گیا۔ میرے کندھے پر سر رکھے اور بازو میری گردن کے گرد لپیٹے روتا رہا۔

گھر آنے تک وہ روتا رہا۔ ہم نے اسے بہلانے کی کوشش نہ کی۔ اس کا رُکا ہوا غبار اور غم نکل رہا تھا۔ رات کے نو بج رہے تھے جب میں نے ظہیر سے کہا کہ مجھے واپس جانا چاہیئے لیکن بُو پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ رو رو کر کہنے لگا —"مت جاؤ۔ یہیں رہو۔ امّی جان مجھے اپنے پاس سلاؤ"— اب اس کی زبان توتلی نہیں رہی تھی۔ وہ تصوّروں کی دنیا سے نکل آیا تھا — آنسوؤں نے اسے پاگل ہونے سے بچا لیا تھا اور اب وہ میری آغوش کی پناہ ڈھونڈ رہا تھا — جو میں نے اسے دے دی۔

میں رات وہیں رہی۔ بُو کو اپنے ساتھ سلایا۔ رات کو کئی بار میری آنکھ کھلی۔ اسے اطمینان کی گہری نیند سوتے دیکھا۔ وہ اب بڑبڑاتا نہیں تھا۔ صبح جاگا اور مجھے اپنے پہلو میں دیکھ کر مسکرا دیا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

اسی روز میں نے ہسپتال جا کر استعفٰی دے دیا اور ظہیر کے گھر آ گئی۔ تھوڑے دنوں بعد ہم نے اڑوس پڑوس کو مدعو کر کے شادی کر لی۔

آج چھٹا سال گزر رہا ہے۔ بُو، پروین اور بے بی مجھے اپنی کوکھ کی پیداوار لگتے ہیں۔ پیار جو اُن سے چھن گیا تھا، مجھ سے اور ظہیر سے مل گیا ہے اور وہ اپنی امّی اور ابّا جان کو بھول گئے ہیں۔ میرا پہلا بچّہ ڈیڑھ سال کا ہو گیا ہے، جو اُن تینوں کے لیے کھلونا ہے — اور یہ کرشمہ پیار کا ہے۔ ☆

دیوار

ر۔ب

میری ماں اور میرا باپ بیس سال جُدا رہے۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو جوڑ نہیں سکتی تھی۔ ان کے درمیان پتھروں اور مٹی کی ایک دیوار حائل تھی جسے ہم مسلمانوں کے بے بنیاد رسم و رواج اور جھوٹے وقار نے آگ کی دیوار بنا دیا تھا۔ آخر برِصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لائے ہوئے انقلاب اور ریاس کے سیلاب نے بیس سالوں کے ٹوٹے ہوئے ناطے جوڑ دیے اور میں نے پہلی بار اپنے باپ کو آبا جی کہا۔

تھوڑا عرصہ گزرا۔ پہلے آبا جی فوت ہوئے اور ایک مہینہ بعد ماں جی بھی فوت ہوگئیں اور اب میں یہ کہانی سنا سکتا ہوں۔ یہ کہانی سرحد پار سے شروع ہوئی تھی۔ میں جب پیدا ہوا تو ماں جی اپنے ماں باپ کے گھر تھیں۔ میں اسی گھر میں بڑا ہوا اور جب میں اپنے پرائے کو پہچاننے اور نیک و بد کو سمجھنے لگا تو میں نے ماں جی سے پوچھا کہ میرے آبا جی کون ہیں اور کہاں ہیں؟ ماں جی نے جواب دیا کہ یہی تیرے آبا جی ہیں لیکن میں اب اچھی طرح سمجھنے لگا تھا کہ یہ تو میرے نانا جی ہیں جو ماں جی کے آبا جی ہیں۔ میری عمر پانچ سال ہو چکی تھی۔ اب مجھے دھوکا نہیں دیا جا سکتا تھا۔ تھوڑا عرصہ مجھے غلط باتوں سے بہلایا جاتا رہا۔ آخر مجھ پر راز فاش ہوگیا۔

میرے آبا جی اس چھ سات فٹ اونچی دیوار کی دوسری طرف رہتے تھے جو ہماری حویلی کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ ایک حصہ میرے نانا جی کا تھا اور دوسرا میرے دادا جی کا۔ میری ماں جی اور ابا جی چچازاد تھے۔ دادا جی نے وفات سے پہلے حویلی کے درمیان دیوار کھڑی کر کے حویلی کو دونوں بھائیوں میں بانٹ دیا تھا۔ دیوار میں ایک کھڑکی رکھی گئی

تھی جو میری پیدائش سے پہلے ہی پتھروں اور مٹی سے بھر دی گئی تھی اور اس طرح یہ دیوار آگ کی دیوار بن گئی تھی جسے کوئی بھی پھلانگ نہیں سکتا تھا۔

میرے ماموں کی شادی دیوار سے پرے کی لڑکی سے ہوئی اور اس کے بدلے دیوار کے پرے کے لڑکے کی شادی میری ماں جی سے ہوئی۔ ایک ہی خون تھا۔ آپس میں کوئی تنازعہ نہ تھا۔ دادا جی نے زمین بھی برابر تقسیم کر کے دونوں بھائیوں کے نام کروا دی تھی۔ پھر بھی ماں جی سسرال کے ہاں صرف ایک مہینہ رہ سکیں اور بیس سال میکے بیٹھی رہیں۔ فساد کی جڑ میری نانی اور میرے آبا جی کی ماں تھیں۔ وہ جب دونوں بیاہی ہوئی اس حویلی میں آئی تھیں تو پہلے روز سے ہی ان کی آپس میں بن نہ سکی تھی۔ اس وقت حویلی میں کوئی دیوار نہیں ہوتی تھی۔ حویلی کے کمرے آمنے سامنے تھے اور صحن مشترک۔ دونوں گھروں میں ایک ایک بھینس تھی۔ زمین مشترک تھی۔ اناج ایک ہی جگہ رکھا جاتا تھا۔ جو اناج فروخت ہوتا تھا اس کی آمدنی دونوں بھائیوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔

یہ ساری باتیں مجھے ماں جی نے بتائی تھیں۔ ماں جی اپنی ماں جی کی وکالت کر رہی تھیں اور سارا الزام میری دادی پر عاید کر رہی تھیں لیکن میں جانتا تھا کہ ہمارے گھرانوں میں شک و شبہے کی بنا پر لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے دل کی بات نہیں کہی جاتی۔ ایک دوسرے کے حق پر ڈاکہ ڈالنے کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ عورتیں اپنے خاوندوں، بھائیوں اور باپوں کے کان بھر کر بھائی کو بھائی کا دشمن بنا دیتی ہیں۔ مردوں کے سر کھلوا دیتی ہیں اور مردوں کی رگیں اتنی کمزور ہوتی ہیں کہ اندھا دھند ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں۔ یہ حادثے اتنے قدیم زمانے سے ہو رہے ہیں جس کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی تک بھائی سے بھائی ٹکرا رہا ہے۔ بیٹا ماں باپ کا دشمن ہوگیا ہے اور ماں یا بہن کی زبان میں چاشنی اور اثر زیادہ ہو تو دلہنوں کے سہاگ اجڑ جاتے ہیں۔ طلاقیں ہوتی ہیں اور بچے بھٹکتے پھرتے ہیں۔

یہی ڈرامہ میرے خاندان میں کھیلا گیا۔ نانی اور دادی اپنے اپنے خاوندوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف یہ شبہہ پیدا کرتی رہیں کہ ـــــ "تمہارا بھائی اناج اور

پیسوں کا زیادہ حصہ مار لیتا ہے"۔۔۔۔ اور جب بچے پیدا ہوئے تو بچوں کی معصوم سی تکرار اور لڑائیاں ماؤں کے لئے اور بڑوں کے درمیان جھگڑے کھڑے کرنے کا نہایت اچھا اور کارگر ذریعہ بن گئیں۔ بچے تو لڑتے ہیں اور چند منٹ بعد سب کچھ فراموش کر کے پھر پیار اور محبت سے کھیلنے لگتے ہیں۔ مگر ہمارے خاندان میں بڑے جب ایک دوسرے کے منہ آنے لگے تو کدورت دلوں میں گھر کر گئی اور دونوں بھائیوں میں چپقلش مستقل ہو گئی۔ جب بچے بڑے ہوئے تو ان پر بھی اس کدورت اور چپقلش کا اثر ہوا اور ماؤں کے اکسانے بھڑکانے پر ان کے دلوں میں ایک دوسرے کا پیار ختم ہو گیا۔

ہمارے ہاں یہ محاورہ عام ہے کہ چچازاد کبھی سگے نہیں ہوتے: میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض بے بنیاد محاورہ ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ عورتیں چچازادوں کو سگا نہیں رہنے دیتیں۔ اس قباحت کے باوجود جب دو بھائیوں کی اولاد جوان ہو جاتی ہے تو وہ کبھی گوارا نہیں کرتے کہ اولاد کے رشتے ناطے خاندان سے باہر طے کر دیے جائیں کیونکہ خاندان میں بہت کھچاؤ ہے۔ وہ رسم و رواج کی پابندی کر کے اولاد کو ایک دوسرے سے بیاہ کر اپنی نفرت کے بیج ان کے دلوں میں بو دیتے ہیں۔

جب میری ماں جی کی شادی کا وقت آیا تو ان کے چچا کے گھر ایک لڑکا اور ایک لڑکی جوان تھی۔ میرا ایک ماموں بھی جوان تھا۔ گھر میں نانی اور دادی نے ذرا ذرا سی باتوں سے اس قدر شکوک پیدا کر رکھے تھے کہ دونوں بھائی کئی بار ایک دوسرے سے دست و گریبان بھی ہو چکے تھے مگر اولاد کی شادی خاندان کے اندر ہی ضروری تھی۔ لہٰذا شادیاں کر دی گئیں۔

داداجی نے ماں جی کی شادی سے بہت پہلے حویلی بھی تقسیم کر دی تھی اور زمین بھی کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی اولاد کا آپس کا پیار دو عورتوں نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے۔ ایک دیوار دلوں کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ دوسری دیوار داداجی نے حویلی کے درمیان کھڑی کر دی۔ داداجی کی وفات کے چھ مہینے بعد ایک ڈولی دیوار کے اِس طرف سے اُس طرف گئی اور ایک اُدھر سے اِدھر آ گئی ۔۔۔۔ اور تیسرے روز جب لڑکیاں اپنے

میکے گئیں تو ان کے چہروں پر عروسی کی رونق نہیں بلکہ ایسا تاثر تھا جیسے سسرال سے وہ دلوں میں کوئی ناگوار بوجھ اٹھا لائی ہوں۔ دونوں ساسوں نے بیس بیس سال صرف کر کے جو نفرت اپنے اور اپنی اولاد کے دلوں میں پیدا کی تھی وہ ڈولیاں اترتے ہی ظاہر ہونے لگی تھی۔

ماں جی نے مجھے بہت سی باتیں سنائی تھیں جو میں ساری کی ساری لکھ کر کہانی کو بے مزہ نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی کوئی ایسی بات ہے جو قارئین کے لئے نئی اور عجیب ہو گی۔ مثلاً ماں جی سسرال میں گئیں تو دوسرے ہی دن ان کی ساس نے ان کے وہ سارے زیورات اتروا لئے جو انہوں نے ماں جی کو ڈالے تھے۔ زیورات اتروانے کی کوئی وجہ نہیں تھی اور زیورات اس لئے اتروا لئے گئے جیسے ماں جی یہ سونا اپنے ماں باپ کو دے دیں گی اور وہ بیچ کھائیں گے۔

میرے اباجی کی رگیں اپنی ماں کے ہاتھ میں تھیں۔ انہوں نے بالکل نہ سوچا کہ یہ لڑکی اب ان کی بیوی اور ساری عمر کی ساتھی ہے، وہ جو بھی کہتے یا کرتے اس بات یا حرکت پر ان کی ماں کا اثر غالب ہوتا تھا۔ ماں جی سسرال گئیں تو دن میں ایک دو بار صحن میں کھڑی دیوار کی کھڑکی میں سے اپنی ماں کے پاس آ جاتیں۔ ان کی ساس نے اس پر بھی نہ صرف اعتراض کیا بلکہ ایسی باتیں بنائیں جو کوئی بھی خوددار انسان برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے جواب میں نانی جی نے وہی سلوک ان کی لڑکی کے ساتھ کیا۔

شادی کو ابھی ایک مہینہ گزرا تھا کہ میرے اباجی نے میری ماں جی کو اپنی ماں کے بھڑکانے پر ایسا طعنہ دیا جسے ماں جی برداشت نہ کر سکی۔ انہوں نے اپنے ماں باپ کو بتایا اور اپنا یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ اب وہ سسرال نہیں جائیں گی۔ میرے ناناجی نے ان کے فیصلے کو قبول کر لیا۔ سسرال سے دو تین پیغام آئے لیکن ماں جی نہ گئیں۔ میرے اباجی ماں جی کی طرح اپنی ہٹ کے پکے اور خوددار انسان تھے۔ حالانکہ ایسی خودداری اچھی نہیں ہوتی۔ انہوں نے یہ پیغام بھیج دیا کہ اب میں تمہیں اپنے گھر نہیں لاؤں گا، نہ طلاق دوں گا۔ ماں جی نے جواب بھیجا ۔۔۔۔ "مجھ پر پنج تن پاک کی لعنت برسے اگر میں تمہارے گھر قدم رکھوں اور سینے پر لکھ لو کہ تم مرتے وقت جب تک میرے ہاتھ کا پانی نہیں پیو گے، تمہاری جان نہیں نکلے گی اور تم میرے ہاتھوں میں مرو گے"!

ماں جی نے یہ جواب بڑے غصے کی حالت میں بھیجا تھا۔ انہوں نے مجھے یہ قصہ سناتے ہوئے کہا ۔۔۔ "اچھو بیٹے، میں نے ایک عورت کے ہاتھ یہ پیغام بھیج تو دیا۔ بعد میں بہت

ڈری کیونکہ یہ تکبر تھا اور تکبر خدا کو پسند نہیں۔ میں نے ایک رات ایک سو نفل پڑھے اور خدا کے حضور رو رو کر بخشش کی دعا کی۔ انسان کو ایسے کلمے منہ سے نہیں نکالنے چاہئیں۔"

میرے ماموں کا گھر اجڑنے میں بھی کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی لیکن ان کی دلہن نے قسم کھا لی تھی کہ اب اس کا جینا مرنا اپنے خاوند کے ساتھ ہے۔ اس نے سارے طوفانوں کا مقابلہ کیا اور خاوند کا ساتھ نہ چھوڑا۔ میری نانی نے اپنی بیٹی کا انتقام لینے کے لیے اسے پریشان کرنے کی ہر جائز اور ناجائز کوشش کر ڈالی۔ آخر میرے ماموں نے ماں سے کہہ دیا کہ پرائی لڑکی سے بدلہ لینے کی خاطر تم بیٹے کا گھر اجاڑ رہی ہو۔ اگر تم باز نہ آئی تو میں اپنی بیوی کو لے کر گھر سے چلا جاؤں گا۔ اس دھمکی کے باوجود وہ بگولوں کی لپیٹ میں آتے رہے اور ہر طرح کی ناگواریاں جھیلتے رہے مگر اچھے رہے۔

میرے ناناجی نے میری ماں جی کو طلاق دلانے کی بہت کوشش کی لیکن میرے اباجی نے طلاق نہ دی۔ معاملہ پنچایت اور کچہری تک جانے لگا تو ماں جی نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ طلاق کیوں لیتے ہو؟ میں ساری عمر شادی نہیں کروں گی۔ ادھر میرے اباجی کو میری ماں جی کے فیصلے کا علم ہو گیا۔ انہوں نے بھی اپنے ماں باپ سے کہہ دیا کہ میرے لیے کہیں رشتہ نہ ڈھونڈنا میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔ دونوں کے اس فیصلے کا جواز یہ نہیں تھا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت تھی۔ بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے پر اپنی خودداری اور ہٹ دھرمی کا رعب گانٹھ رہے تھے۔

حویلی کے درمیان کھڑی دیوار میں سے کھڑکی نکال کر اسے پتھروں سے بھر دیا گیا اور ماں جی نے اپنے ہاتھوں اپنی طرف پتھروں پر گارے کا لیپ کر دیا ــــــ اور اس طرح ایک مرد اور ایک عورت جو خدا اور رسولؐ کے نام پر یکجا ہوئے تھے الگ الگ زندگی بسر کرنے لگے۔

میں پیدا ہوا۔ ماں جی اور اباجی نے ازدواجی زندگی کا جو ایک مہینہ اکٹھے گزارا تھا، اس کی یادگار میرا وجود تھا جسے ماں نے سینے سے لگا لیا اور اسی کی خاطر جینے لگی۔ اس کے دل میں خاوند کے لیے اگر پیار تھا تو وہ بھی اس نے میرے لیے وقف کر دیا۔ برادری کے بزرگوں نے میرے ماں باپ کا راضی نامہ کرانے پر زور دیا لیکن دونوں نے انکار کر دیا۔ آپ حیران ہوں گے کہ میری ماں جی کیسی عورت تھی۔ میں جس زمانے کی بات سنا رہا ہوں، اس زمانے میں لڑکی اور خصوصاً دیہات

کی لڑکی میں اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اپنے متعلق کوئی بات زبان سے کہہ سکے۔ ماں جی نے بزرگوں کے بھی منہ پھیر دیے اور کہا کہ میرا خاوند مرد ہوتا تو اپنی کرتا، ماں کی نہ سنتا۔ اس کا اپنا دماغ ہے نہ دل۔

وقت گزرتا رہا۔ میں ماں کی گود سے نکل کر صحن میں گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل رینگنے لگا پھر اسی صحن میں چلنا سیکھا اور میں حویلی کی ڈیوڑھی تک جانے لگا۔ یہ ڈیوڑھی حویلی کے دونوں حصوں کا مشترک حصہ تھی۔ دونوں گھروں کے افراد اسی ڈیوڑھی سے اندر باہر جاتے تھے۔ میں نے اس ڈیوڑھی میں اپنے اباجی کو کئی بار دیکھا لیکن اس عمر میں وہ میرے لیے اجنبی تھے۔ انہیں باہر کے ہر آدمی کی طرح غیر سمجھ کر میں جھینپ جایا کرتا تھا۔ جہاں تک میری یاد جا سکتی ہے، اباجی نے کبھی بھی میرے پاس سے گزرتے میرے سر پر ہاتھ نہیں پھیرا تھا۔

گاؤں میں پرائمری سکول تھا۔ مجھے وہاں داخل کر دیا گیا۔ جب میں تیسری جماعت میں تھا تو مجھے ایک روز ہم جماعتوں نے بتایا کہ فلاں آدمی تمہارا باپ ہے۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں اپنے ناناجی کو باپ کہا کرتا تھا۔ اگر لڑکے مذاق کر رہے ہوتے تو میں ان کے گلے پڑ جاتا لیکن میرے غصے پر وہ حیران ہوتے اور خاموش ہو گئے۔ میں نے ماں جی سے پوچھا کہ میرا باپ کون ہے تو انہوں نے ٹالنے کی کوشش کی۔ جب میں ضد کرنے لگا تو ماں جی نے مجھے بتا دیا کہ تمہارا باپ دیوار کے اُس طرف رہتا ہے اور فلاں ہے۔ میں ابھی باتوں کی گہرائی تک پہنچنے کے قابل نہیں تھا۔ ماں جی کی صرف اتنی سی بات کو سمجھ سکا کہ میرا باپ اچھا آدمی نہیں ہے۔ میرے دل میں اس شخص کے خلاف غصہ بھر گیا۔ اس کے ساتھ ہی باپ کی محرومی کا احساس بھی دل میں پیدا ہو گیا۔ اس روز کے بعد جب اباجی کا سامنا ہوتا، میرے ذہن میں کانٹے سے چبھنے لگتے۔ انہوں نے کبھی بھولے سے بھی میری طرف نہ دیکھا۔

ماں جی میرے متعلق بہت حساس ہو گئی تھیں۔ سکول گاؤں میں ہی تھا۔ کسی روز میں چھٹی کے وقت راستے میں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگتا تو ماں جی گھبرائی ہوئی آتیں اور مجھے ساتھ لے جاتیں۔ رات کو مجھے اپنے ساتھ سلاتی تھیں۔ مجھے ذرا سی تکلیف ہو جائے یا کھیل کود میں ذرا سی چوٹ آ جائے تو وہ تڑپ اٹھتی تھیں۔ مختصر یہ کہ وہ میری پوجا کرتی

تھیں۔ اگر میں اباجی کا نام لے بیٹھوں تو وہ حقارت سے کہا کرتی تھیں کہ وہ مرد نہیں ہے اس کا نام نہ لیا کرو۔ وہ بزدل ہے۔ اس کا حق نہیں ہے کہ کسی عورت کو اپنی بیوی اور کسی مرد کو اپنا بیٹا کہے۔ چنانچہ میں نے ماں جی کے سامنے آباجی کا نام لینا چھوڑ دیا اور انہیں دل سے اتار دیا۔

میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک روز چھٹی کے وقت مَیں گھر کو جا رہا تھا۔ سیاہ گھٹائیں گرج رہی تھیں۔ اچانک اولے پڑنے لگے۔ اولے موٹے بھی تھے اور بارش کی طرح پڑ رہے تھے۔ بعض لڑکے واپس سکول بھاگ گئے اور کمروں میں جا پناہ لی۔ بعض دوسروں کے گھروں میں گھس گئے لیکن میں ماں جی کے پاس جا پناہ لینا چاہتا تھا۔ میں گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ گاؤں میں بڑ کا ایک پرانا اور گھنا درخت تھا۔ مجھے اس کے نیچے رک جانا چاہیئے تھا لیکن میں ماں کے پیار کا مارا ہوا بچہ ماں کے پاس ہی پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے بڑ کے ساتھ چند ایک آدمی کھڑے دیکھے۔ میں دوڑ کر ان کے قریب سے گزر گیا۔ میرا گھر بہت دور نہیں تھا، گلیوں کے صرف دو موڑ رہ گئے تھے مگر اولے تیز ہو گئے۔

بڑ کے درخت کے قریب سے میں گزرا تو اولے جو ہر طرف کنکریوں کی طرح گر رہے تھے، مجھ پر گرنے بند ہو گئے۔ میں ڈر گیا لیکن فوراً میں نے اپنے ساتھ کسی آدمی کے قدموں کی آواز سنی۔ میں اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ پیچھے نہ دیکھا کہ کون آدمی ہے۔ اوپر دیکھا تو نظر آیا کہ وہ جو کوئی بھی ہے، اس نے میرے سر پر کھیس تان رکھا ہے اور میری رفتار کے ساتھ میرے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ میں سمجھا گاؤں کا کوئی آدمی ہو گا۔

میرا گھر آ گیا، گھر دس بارہ قدم دور رہ گیا تھا۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر ماں جی کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی برستے اولوں میں دوڑیں اور مجھے جھپٹ کر اٹھایا اور گھر کی طرف دوڑ پڑیں۔ میں دیکھ نہ سکا کہ وہ کون تھا جو مجھ پر کھیس تان کر گھر تک لایا تھا۔ اندر جا کر ماں جی نے میرے آگے کھانا رکھا اور غصے سے پوچھا — "وہ تمہیں کہاں ملا تھا؟ اس نے تمہارے ساتھ کوئی بات کی تھی؟" — میں نے پوچھا — "کون ماں جی؟" — ماں جی نے جواب دیا — "تمہارا باپ جو تمہیں گھر تک لایا ہے؟"

"میں نے تو یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ کون تھا جس نے مجھ پر کھیس تان دیا تھا"۔ میں نے ماں جی کو بتایا — "میں دوڑتا آ رہا تھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ وہ بڑ کے نیچے سے میرے ساتھ لگا تھا۔ اس نے میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی" — میں نے ماں جی سے پوچھا "وہ میرے آباجی تھے ماں جی؟" — ماں نے آہستہ سے سر ہلایا اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ فوراً اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

اس وقت تو میں نو دس سال کا بچہ تھا۔ ماں جی اور آباجی کے احساسات کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ آج وہ وقت یاد آتا ہے تو کتنی ہی دیر سوچتا رہتا ہوں کہ میرے ماں باپ کے اس وقت کے تاثرات کیسے ہوں گے جب ماں نے اپنا بچہ اپنے خاوند سے جھپٹ کر چھین لیا تھا۔ ماں جی کو ضرور دکھ ہوا ہو گا۔ میں ان دونوں کا خون تھا۔ اباجی میری ماں جی کی روح اور ان کے جسم کے مالک تھے۔ میں ان کی اجڑی ہوئی ازدواجی زندگی کی یادگار تھا۔ میں آج محسوس کرتا ہوں کہ جس طرح ماں جی کے آنسو نکل آئے تھے اسی طرح آباجی بھی گھر جا کر اور منہ چھپا کر روئے ہوں گے مگر انسانوں نے انسانوں کے دل کاٹ ڈالے تھے۔

میں بچہ تھا۔ ماں جی کے پیار میں اسی شام تک بھول گیا کہ آباجی مجھے اولوں سے بچا کر گھر لے گئے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ ماں جی نے جب کبھی آباجی کا ذکر کیا تو نفرت اور حقارت سے کیا جس سے میرے دل میں بھی اپنے باپ کے خلاف نفرت پختہ ہوتی گئی۔ کئی بار ہم ایک دوسرے کے قریب سے گزر گئے۔ نہ آباجی نے میری طرف دیکھا نہ میں نے گھوم کر انہیں دیکھا۔ گھر میں باپ کی کمی نانا جی نے پوری کر رکھی تھی۔ نانا، نانی اور ماں جی کے دیوانہ وار پیار کا مرکز صرف میں تھا۔

چوتھی جماعت پاس کر لی تو مجھے چار میل دور شہر میں ہائی سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ میں اپنے گاؤں اور قریبی شہر کا نام اس لیے نہیں لکھ رہا کہ خاندان کے جھوٹے وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔ سمجھنے والے تو سمجھ جائیں گے کہ کون سے خاندان کا قصہ ہے اور جو ہمارے خاندان کو نہیں پہچانتے، انہیں اس کہانی سے ہی دلچسپی ہونی چاہیئے اور سمجھنا چاہیئے کہ میں یہ کہانی کیوں سنا رہا ہوں۔ میرا مقصد بالکل وہی ہے جس کے تحت مئی کے "حکایت" میں محترم دوست محمد ناظر نے اپنی کہانی (کیا میں بے غیرت ہوں؟) سنائی ہے۔ انہوں نے درست فرمایا ہے کہ سرحد پار سے اور تو کچھ

نہیں لا سکے، جھوٹا وقار اور فرسودہ رسم و رواج ضرور ساتھ لے آئے ہیں۔

میں ہائی سکول میں داخل ہوگیا۔ مجھے شہر تک لے جانے اور واپس لانے کے لیے ایک گھوڑی لے لی گئی اور ایک مزارعہ کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ مجھے گھوڑی پر شہر لے جایا کرے اور واپس لے آیا کرے۔

برادری کے بزرگوں نے کئی بار میرے نانا اور دادا سے کہا کہ اپنی اولاد کی زندگی تباہ نہ کرو مگر ماں جی نے صاف انکار کر دیا۔ آخر ناناجی نے یہ شرط پیش کی کہ پہلے میرا بھائی میرے پاس آئے اور سمجھوتے کی درخواست کرے لیکن ان کے بھائی نے بزرگوں کو جواب دیا — "سر لڑکی والوں کا نیچے ہونا چاہیے۔ لڑکی والے ہمارے پاس آئیں" — یہ شرط ناناجی اور خصوصاً ماں جی کو بالکل ہی منظور نہیں تھی۔ میرے اباجی نے بھی جواب دیا تھا کہ میں مرد ہوں، ایک عورت کی خاطر سر نہیں جھکاؤں گا۔ ماں جی اس جواب سے اتنی بھڑکی تھیں کہ انہوں نے صحن میں دیوار کے قریب بلند آواز سے کہا تھا — "میں باپ کے دروازے پر پڑی رہوں گی، اس کی عزت برباد نہیں کروں گی۔"

اس کے بعد سمجھوتے کے دروازے بند ہوگئے اور وقت گزرتا چلا گیا۔ میں دسویں جماعت میں تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ سکول بند تھا۔ گاؤں کے بہت سے لڑکے بڑ کے درخت تلے کھیل رہے تھے۔ میں بھی وہیں تھا۔ اچانک ایک طرف سے شور اٹھا اور مویشیوں کے بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ کئی آدمی چلا رہے تھے — "بچوں کو اندر کرلو۔ دروازے بند کرلو۔ مست سانڈ آرہا ہے" — اتنے میں ہم نے دیکھا کہ ایک دیوہیکل سانڈ ایک گلی سے پھنکارتا نکلا۔ دو بیل اس کے آگے آگے بھاگے آرہے تھے۔ اس نے ایک بیل کو ٹکر ماری تو اس قدر تندرست اور توانا بیل زمین پر لڑھکنیاں کھانے لگا۔ دوسرا بیل اندر تیز بھاگا۔ یہ جگہ گاؤں کے وسط میں بہت فراخ تھی۔

سرحد پار ا... قسم کے مست سانڈ گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ ہندو انہیں مقدس سمجھتے تھے اور ان کی خو... خاطر تواضع کرتے تھے۔ سوائے کھانے کے ان سانڈوں کا کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ ان کا جسم جنڈ گینڈے کی طرح مضبوط ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا کوئی سانڈ بگڑ جاتا تھا تو خوب تباہی مچاتا تھا۔ انہیں ڈرا ڈرا کر گاؤں سے بھگانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ انہیں مارنے سے ہندو ناراض ہوتے تھے۔

ایک آدمی قریب کے مکان سے نکلا تو سانڈ سر نیچے کرکے اس کی طرف دوڑا۔ اس نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور الٹے پاؤں گھر میں داخل ہوکر کواڑ بند کر دیے۔ سانڈ نے ٹکر ماری تو دونوں کواڑ ٹوٹ گئے۔ وہ ایک اور ٹکر مارنے کے لیے پانچ چھ قدم پیچھے ہٹا۔ ہماری برادری کے ایک گھرانے میں ایسا ہی ایک دیوہیکل سانڈ تھا۔ جسے مویشیوں کے میلوں پر نمائش کے لیے لے جایا جاتا تھا اور وہ تین سال سے انعام حاصل کر رہا تھا۔ یہ پالا ہوا سانڈ تھا۔

نوکر اسے ٹہلائی کے لیے باہر لے جا رہا تھا۔ مست سانڈ کو دیکھ کر وہ منہ زور ہوگیا۔ اس نے نوکر کے ہاتھ سے رسی چھڑالی اور ہندوؤں کے بگڑے ہوئے دیوتا کی طرف دوڑا۔ سانڈ نے اسے دیکھا تو پھنکار کر حملہ روکنے کے لیے آگے بڑھا۔ اب دونوں کی جو لڑائی شروع ہوئی تو ایسے لگتا تھا جیسے دو چٹانیں پیچھے ہٹ ہٹ کر ٹکرا رہی ہوں۔ ہمارے بیل نے پیچھے ہٹ کر مست سانڈ کے پہلو میں ایسی ٹکر ماری کہ سینگوں کی نوکیں اس کی کھال میں اتر گئیں۔ سانڈ گھبرا کر بھاگ اٹھا اور ہماری طرف آیا۔ بیل نے اس کے پیچھے آکر پیچھے سے ٹکر ماری۔ سانڈ کی اگلی ٹانگیں دوہری ہوگئیں۔

تماشائی ادھر ادھر بھاگے۔ کئی لڑکے بڑ پر چڑھ گئے۔ میری شامت جو آئی تو میں ایسی گلی میں جا گھسا جو آگے سے بند تھی۔ یہ دراصل گلی نہیں، دو مکانوں کے پہلو تھے جن کے درمیان چار پانچ گز کا فاصلہ تھا اور سامنے ایک مکان کا پچھواڑا تھا۔ یہ جگہ جو چار پانچ گز چوڑی تھی تقریباً بیس گز لمبی ہوگی۔ میں گھبرا کر اس جگہ جا پہنچا تھا۔ جب میں واپس ہونے لگا تو خوف نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔ دونوں سانڈ سینگ الجھائے ہوئے ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ میری طرف ہمارے بیل کی پیٹھ تھی اور مست سانڈ اسے دھکیل کر بند گلی میں لا رہا تھا۔ انہوں نے گلی بند کر دی تھی اور وہ میری طرف آرہے تھے۔ اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں وہاں سے نکل بھاگتا۔

ہمارا بیل سانڈ کو ٹکر مارنے کے لیے تیزی سے پیچھے ہٹا لیکن سانڈ جو اس کے سینگوں سے زخمی ہوچکا تھا، اسی تیزی سے اس پر حملہ آور ہوا۔ میری چیخ نکل گئی کیونکہ وہ میرے قریب پہنچ گئے تھے اور پیچھے ہٹنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا مکانوں

کی بلندی اتنی زیادہ تھی کہ میں اوپر نہیں چڑھ سکتا۔ اب میرا کچلے جانا یقینی تھا۔

مجھے سانڈ اور بیل کی پیٹھوں کے اوپر سے سامنے بڑ کا درخت نظر آ رہا تھا جہاں لڑکوں نے شور مچا دیا۔۔۔ "اچھو پھنس گیا۔ اچھو کو بچاؤ"۔۔۔ میں نے کئی آدمیوں کو دیکھا۔ وہ لاٹھیاں اٹھائے مست سانڈ کے پیچھے آن کھڑے ہوئے۔ سانڈ کو کوئی مار نہیں سکتا تھا ورنہ گاؤں کے ہندو فساد بپا کر دیتے۔ پھر تین چار آدمیوں نے سانڈ کو لاٹھیاں ماریں مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر ہمارے بیل کو ٹکر ماری۔ میرا سینہ ہل گیا۔ ہمارا بیل پیچھے ہٹا تو اس کی دُم میرے منہ پر لگی۔ اب دیوار اور بیل کے درمیان صرف اتنا فاصلہ تھا جس میں میں کھڑا چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ اب میرے بچنے کی صورت یہی تھی کہ ہمارا بیل سانڈ کو دھکیل کر گلی سے باہر لے جائے۔ اس میں شاید اب اتنی ہمت نہیں رہی تھی یا شاید سانڈ پہلو کے زخم سے اتنا بپھر گیا تھا کہ ہمارے بیل کو وہ ہلنے نہیں دے رہا تھا۔

سانڈ کے پیچھے گلی کے منہ پر جو لوگ کھڑے تھے، ان میں مجھے ابّا جی نظر آئے، وہ شاید بعد میں پہنچے تھے۔ ان کے ہاتھ میں لاٹھی یا کلہاڑی نہیں تھی۔ صرف ایک سیکنڈ پہلے وہ مجھے نظر آئے اور دوسرے سیکنڈ انہیں میں نے دوڑ کر اوپر اٹھتے دیکھا اور اسی لمحے وہ مست سانڈ کی پیٹھ پر سوار ہو چکے تھے۔ لوگوں نے انہیں زور زور سے پکارا۔۔۔ "پاگل نہ بنو۔ پیچھے کود آؤ"۔۔۔ لیکن وہ سانڈ کی پیٹھ پر سوار ہو کر آگے سرک رہے تھے جیسے اس کے سینگ پکڑنا چاہتے ہوں۔

سانڈ نے سر اٹھایا اور اچھلا۔ وہ اپنی پیٹھ پر چڑھے ہوئے دشمن کو گرانا چاہتا تھا۔ ابّا جی گرنے لگے لیکن ہاتھ سانڈ کی پیٹھ پر رکھ کر سنبھل گئے۔ سانڈ کے لیے یہ نئی مصیبت تھی۔ وہ سر گھما کر ایک پہلو کو گھوما اور پیٹھ کی طرف سر مارا۔ ہمارے بیل نے اس کا پہلو سامنے دیکھ کر وہیں ٹکر ماری جہاں سے اس کا خون بہہ رہا تھا۔ سانڈ پیچھے ہٹا۔ اب اس کا دھیان پیٹھ پر بھی تھا۔ ہمارے بیل نے اسے سنبھلنے نہ دیا اور اس کی مڑی ہوئی گردن پر ٹکر مار کر وہاں سے بھی خون نکال دیا اور جب اس نے سانڈ کو تیسری ٹکر ماری تو سانڈ گلی کے منہ پر پہنچ چکا تھا۔ مگر ابا جی سانڈ کے اچھلنے اور اسے بیل کی ٹکر لگنے سے گر پڑے۔ میں سمجھا کہ وہ کچلے گئے ہیں لیکن میں خود اتنا ڈرا ہوا تھا کہ آگے بڑھنے سے گھبرا رہا تھا۔ دونوں جانوروں

کی اڑاتی ہوئی گرد میں سے ابّا جی کا ہاتھ نظر آیا جس نے میری کلائی کو جکڑ لیا اور یہ ہاتھ مجھے گھسیٹ کرلے گیا۔

میں گلی سے نکلا تو سانڈ کو بیل دور لے گیا تھا۔ جونہی ابّا جی نے میرا ہاتھ چھوڑا میں گھر کی طرف سرپٹ دوڑ پڑا۔ ماں جی کو کسی نے بتا دیا تھا کہ میں سانڈوں کی لڑائی میں بند گلی میں پھنس گیا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ انہیں اس وقت پتہ چلا جب میں موت کے منہ سے نکل چکا تھا۔ اگر وہ پہلے آ جاتیں تو مجھے بچانے کے لیے یقیناً لڑتے سانڈوں کے درمیان کچلی جاتیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے اپنے سینے سے لگا لیا۔ جب گھر جا کر میں نے انہیں بتایا کہ میں کہاں تھا اور مجھے وہاں سے کس نے نکالا ہے تو ماں جی چپ ہو گئیں اور میں نے ایک بار پھر ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔

اب تو میں اچھا بُرا سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ میں نے ماں جی سے کہا کہ ابا جی میرے دشمن نہیں ہو سکتے۔ میری رگوں میں انہی کا خون ہے۔ انہیں مجھ سے محبّت ہے ورنہ وہ اپنی جان اس طرح خطرے میں نہ ڈالتے۔ راستے میں کہیں وہ مل جایا کریں تو میں اگر انہیں سلام کر دیا کروں تو کوئی بُری بات تو نہیں۔ لیکن ماں جی نے کہا کہ وہ تمہیں مجھ سے جُدا کرنا چاہتا ہے۔ میری سوچوں پر ماں جی کا پیار غالب آ گیا۔ میرے دوستوں نے مجھے اس واقعہ کے بعد کئی بار کہا کہ دیکھو اچھّو، وہ تمہارا باپ ہے، اس سے ایک آدھ بات کر لیا کرو لیکن نہ میں نے کبھی ان سے بات کی، نہ انہوں نے کبھی مجھے بلایا۔ مجھ پر یہ اثر ضرور ہوا کہ اس شام کھیتوں میں جا کر میں تنہائی میں بہت ہی رویا۔ کتنی عجیب اور کتنی دردناک صورت تھی کہ باپ اپنے بیٹے پر جان قربان کر رہا تھا مگر دونوں ایک دوسرے کو سلام تک نہیں کرتے تھے۔

ماں جی اور ابّا جی کو علیحدہ ہوئے سولہ سال گزر گئے تھے۔ دونوں نے شادی نہ کی۔ مجھے لوگوں نے بتایا کہ ابّا جی شادی سے پہلے خاصے زندہ دل اور ہنس مکھ ہوا کرتے تھے مگر اب خاموش طبع اور سنجیدہ ہو گئے تھے۔

میں نے میٹرک پاس کر لیا اور اسی شہر میں کالج میں داخل ہو گیا۔ زندگی کے چار سال اور اسی طرح گزر گئے لیکن اب میرے اندر ایک انقلاب بپا ہونے لگا۔ تعلیم نے میرے دماغ

کو دیہاتی زندگی اور اس معاشرے کی بے جا پابندیوں کے خلاف بغاوت پر اکسانا شروع کر دیا۔ میں کالج میں تیسرے سال میں تھا تو برادری کے بزرگوں سے ماں جی اور ابا جی کو سیلنے کے متعلق بات کی۔ پھر نانا جی اور ماں جی کو قائل کرنے لگا مگر مجھے منہ کی کھانی پڑی۔ میری طبیعت میں اُبال اٹھنے لگا۔ میں نے کھلے بندوں گاؤں والوں کو رسم و رواج کے خلاف لیکچر دینے شروع کر دیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا گاؤں میرے خلاف ہو گیا۔ بعض آدمیوں نے میری غیر حاضری میں یہاں تک کہا کہ اپنی ماں اُجڑ کر گھر بیٹھی ہوئی ہے اور لونڈا دوسروں کو نصیحتیں کرتا پھرتا ہے۔

معلوم نہیں میں جوانی کے جوش میں کیا کر بیٹھتا اور گاؤں والے میرا کیا حشر کرتے کہ اللہ کے نیک بندوں نے ملک میں ایک انقلاب بپا کر دیا۔ جنگِ آزادی فیصلہ کُن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ کالج میں میرا آخری سال تھا۔ کالج کے ماحول میں ہندو مسلم کشیدگی خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی اور ایک روز کالج میں چند ایک ہندو اور مسلمان طلبہ کا تصادم ہو گیا۔ میرے سر پر زخم آیا۔ شہر کے ایک مسلمان ڈاکٹر سے پٹی کرائی۔ جب گھر آیا تو میرے سر پر پٹی اور کپڑوں پر خون دیکھ کر ماں کا رنگ زرد ہو گیا اور وہ غش کھاتے کھاتے بچیں۔ میں نے انہیں ساری واردات سنا دی۔ انھوں نے مجھے کالج جانے سے منع کر دیا لیکن میں نہ مانا۔ میرے زخمی ہونے کی خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ بیمار پُرسی کے لیے میرے گھر آئے۔ میں نے سب کو بتایا کہ کالج میں یہ فساد کیوں ہوا ہے۔ یقین کیجیے کہ گاؤں کے دس بارہ نوجوان کلہاڑیوں سے مسلّح ہو کر تیار ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم ہر روز تمہارے ساتھ کالج جایا کریں گے۔ میں نے انہیں تسلّی دی کہ ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ ماں جی کو بھی قائل کر لیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ انھوں نے یہ حفاظتی انتظام کر دیا کہ جو مزارعہ مجھے گھوڑی پر کالج لے جایا کرتا تھا اسے کہا گیا کہ اپنے ساتھ دو کلہاڑیاں لے جایا کرے۔

میں کالج جاتا رہا۔ میں گھر آتا تب ماں جی کے منہ میں روٹی کا نوالہ جاتا ورنہ نانی جی بتاتی تھیں کہ ماں جی دن بھر پریشان صحن میں پھرتی یا دروازہ کھول کھول کر دیکھتی رہتی تھیں۔ دو مہینے بعد شہر میں بھی ہندو مسلم تصادم کی وارداتیں ہونے لگیں جن کی خبریں گاؤں

تک پہنچ گئیں۔ ایک روز میں کالج گیا تو مسلمان طلبا نے باہر کہیں اجلاس کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ جس وقت مجھے گھر آ جانا چاہیے تھا اس وقت میں طلبا کے ساتھ مسلم لیگ کے صدر دفتر میں بیٹھا تھا۔ اجلاس شروع ہوا اور کئی ایک پروگرام طے ہوئے اور سورج آخری منزل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں گھوڑی پر بیٹھا اور گاؤں کو روانہ ہوا۔

گاؤں تھوڑی دور رہ گیا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ ابھی اندھیرا نہیں پھیلا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دائیں طرف مجھ سے کوئی دو تین سو گز دور ایک آدمی فصلوں کی اوٹ میں گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ پگڑی میں چھپا ہوا تھا اور اس نے کلہاڑی اٹھا رکھی تھی۔ میں اسے پہچان نہ سکا اور نہ ہی میں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ دی۔ وہ کسی گاؤں کا کوئی آدمی ہو سکتا تھا۔

ذرا آگے گئے تو مزارعہ جو میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، بولا ـــــ "آپ اس آدمی کو دیکھ رہے ہیں؟ . . . . آپ کے والد صاحب ہیں۔ میں نے انہیں آپ کے کالج کے قریب گھومتے دیکھا تھا۔ پھر جب آپ مسلم لیگ کے دفتر میں گئے تو وہاں سے وہ تین چار بار گزرے تھے۔ جب آپ گھوڑی پر بیٹھے تو بھی میں نے انہیں دیکھا تھا"

کوئی چیز میرے حلق میں اٹک گئی۔ میرا دل غم سے بوجھل ہو گیا۔ میرا باپ میری حفاظت کے لیے میرے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا تھا۔ اب تو میرا احساس بھی بیدار ہو گیا تھا۔ باپ کے جذبات کو میں بہت اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ یہ خون کا رشتہ تھا جس نے باپ کو سایہ بنا رکھا تھا۔ جی میں آئی کہ ابا جی سے جا ملوں۔ گھوڑی انہیں دے دوں اور خود پیدل چلوں لیکن ماں جی کے دل کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

میں جب گھر پہنچا تو ماں جی بہت ہی پریشان تھیں۔ انہوں نے رو کر کہا کہ میں کالج جانا چھوڑ دوں۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں تسلّی دی مگر یہ نہ بتایا کہ ابا جی بھی میرے ساتھ تھے۔ اب کالجوں میں پڑھائی نہیں ہوتی تھی۔ طلبا کالجوں میں جاتے تھے اور وہاں سے جلسے جلوسوں میں جا شریک ہوتے تھے۔

تین جون کی شام برِصغیر کی تقسیم کا اعلان ہو گیا اور کالج کے ہندو پرنسپل نے مسلمان طلبا سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اب تمہارا کالج آنا خطرے سے خالی نہیں اور میں تمہاری

حفاظت کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ کالج جانا بند ہوگیا مگر اب گاؤں کی حفاظت کی ذمہ داری بھی قبول کرنے کو کوئی تیار نہ تھا۔ ہر طرف سے خبریں آنے لگیں کہ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا ہے۔

یہاں سے میری کہانی اس دور میں داخل ہوگئی جس سے آپ سب بہت اچھی طرح واقف ہیں جو میرے خاندان پر بیتی وہ ہر اس خاندان کی آپ بیتی ہے جو اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان خصوصاً مشرقی پنجاب میں تھا۔ اس لیے میں کہانی کا یہ حصہ آپ کی خونچکاں یادوں کے حوالے کرتا ہوں۔

جب خون کا سیلاب ہمارے گاؤں کے قریب پہنچا تو شہر کے مسلم لیگی ورکر ہمیں شہر کے پناہ گزین کیمپ میں لے گئے۔ گاؤں کے کچھ لوگ نکل گئے، کچھ خوش فہمی میں مبتلا ہو کر گاؤں میں ہی رہے۔ شہر سے میرے کالج کے چار پانچ دوست آ گئے تھے۔ وہ میرے خاندان کو جس میں نانا، نانی، ماں جی اور میں تھے، گھر سے ہمیشہ کے لیے ایسی منزل کی طرف روانہ ہو گئے جس کے متعلق یقین نہیں تھا کہ اس تک پہنچ سکیں گے۔ میرا ماموں اپنی بیوی بچوّں سمیت گاؤں میں رہ گیا اور اباّ جی کا کنبہ بھی وہیں رہا۔ میرے ماموں نے میری نانی — اللہ انہیں اور ان کے بیوی بچوّں کو جنت نصیب کرے۔ مجھے دکھ صرف یہ ہے کہ ان کی قبریں نہیں بنیں اور کسی نے ان کا جنازہ نہیں پڑھا۔ بعد میں معلوم ہوا تھا کہ کافروں نے گاؤں کو آگ لگا دی تھی اور کسی کو باہر نہیں نکلنے دیا تھا۔

شہر کے کیمپ میں پہنچے اور جب کیمپ پر بھی بھیڑیے غرّانے لگے تو نفسا نفسی کے عالم میں راتوں کی تاریکیوں میں کنبے پاکستان کی طرف بھاگنے لگے۔ اللہ کی موعودہ سرزمین ہندوستان کے مسلمانوں سے بہت بڑی قربانی مانگ رہی تھی ـــــ ننھے ننھے بچوّں کی قربانی، بہو بیٹیوں کی عصمتوں کی قربانی، جان کی قربانی، خون، خون اور خون ـــــ ہندوؤں اور سکھوں کو درندہ کہوں تو درندوں کی توہین ہوگی۔ آج مجھے کون قائل کر سکتا ہے کہ ہندو اور سکھ مسلمان کے دوست ہو سکتے ہیں۔ میں، جس نے قرآن کے ورق مسلمان بچوّں کے خون میں بھیگے ہوئے راستوں میں بکھرے دیکھے ہیں، کس طرح قائل ہو جاؤں کہ ہندو ہمارا دشمن نہیں۔

دنیا

چار دیــ

ہم شہر کے کیمپ سے بھاگے۔ کھیتوں میں دوڑے۔ کانٹوں پر چلے، بھوکے، پیاسے، بے بس، تھکے ماندے ـــــ راستے میں نانا جی نے جان اللہ کے سپرد کر دی۔ میّت کو ایک گڑھے میں ڈالا اور اوپر مٹی ڈال دی۔ ایک میل اور چلے تو نانی کا بوڑھا جسم بے جان ہو کر پرائے دیس کی نذر ہو گیا۔ میں نے اور ماں جی نے ہاتھوں سے مٹی کھودی اور نانی جی کو دفن کر دیا۔ ہم نے فاتحہ پڑھی مگر رونے کی ہمت نہیں تھی۔ راستے میں لاشیں ہی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ سب پاکستان پر قربان ہو گئے تھے۔ بعض لاشوں پر کوئی زخم نہ تھا۔ ایسی لاشیں بچوّں، عورتوں اور بوڑھوں کی تھیں۔ وہ تھکن، خوف، بھوک اور پیاس سے شہید ہوئے تھے۔

میں ماں جی کو ساتھ لیے اگست کی جھلساتی ہوئی دوپہر میں چلتا گیا۔ راستے میں ماں جی کو کندھوں پر بھی اٹھایا۔ گندا پانی بھی پلایا۔ مکئی کے کچّے بھٹے بھی کھلائے اور رات کو جب ہم بیاس کے کنارے پہنچے تو دریا سیلابی تھا۔ پلوں سے گزرنا خودکشی کے برابر تھا۔ دور دور تک مسلمان اکیلے اکیلے، کنبہ کنبہ بکھرے ہوئے پاکستان چلے جا رہے تھے ـــــ اور آگے بیاس نے راہ روک رکھی تھی۔ بعض لوگ قریب سے گذر جاتے تھے مگر پہچانے نہیں جاتے تھے۔ یقین کیجیے کہ ایک مقام پر مجھے اپنی ماں کوئی اجنبی عورت لگی۔ میں خود محسوس کرنے لگا کہ میں ماں جی کا اچھّو بیٹا نہیں، معلوم نہیں کون ہوں۔

رات کا اندھیرا پھیلنے تک دریا کے کنارے ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ بعض مسلمان گر پڑے اور معلوم نہیں کہ سو گئے، مر گئے یا بے ہوش ہو گئے۔ میں اور ماں جی بھی کنارے پر لیٹ گئے اور آنکھ لگ گئی۔ جسم کا انگ انگ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

کچھ پتہ نہیں کہ رات کتنی گذر گئی تھی کہ مہاجرین کے بے پناہ شور سے آنکھ کھل گئی۔ ہر کوئی بھاگ دوڑ رہا تھا۔ میں نے جب مہاجرین کی چیخوں کے ساتھ جے کارے سنے تو سمجھ گیا کہ ہندوؤں اور سکھوں نے حملہ کر دیا ہے۔ دریا سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے مسلمان دشمنوں سے بچنے کے لیے دریا میں کود رہے ہیں۔ دریا میں سے بھی چیخیں اٹھنے لگیں۔ میں نے ماں کا بازو پکڑا اور اللہ کا نام لے کر دریا میں اتر گیا۔ دریا تیز تھا۔ میں تیرنا جانتا تھا مگر جسم تیرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ صرف جذبہ تھا یا شاید ماں کی محبت تھی یا شاید خوف کی انتہا تھی کہ جسم کی سوئی ہوئی قوت

بیدار ہوگئی۔ میں نے ماں کو اپنی پیٹھ پر لٹا لیا اور تیرنے لگا۔ آگے سیلابی لہریں اٹھا اٹھا کر پٹخنے لگیں۔ زبان پر خدا کا نام تھا۔ کلمۂ طیبہّ کا وِرد تھا اور میں لہروں سے لڑ جھگڑ رہا تھا۔

میرے قریب سے انسان بہتے گذر رہے تھے۔ جو ڈوب رہے تھے وہ چیختے چلے جا رہے تھے اور جو ڈوب چکے تھے، ان کی لاشیں میرے قریب سے گذرتی جا رہی تھیں ـــــ اور میرے بازو شل ہو چکے تھے۔ میں دریا کے وسط میں پہنچ چکا تھا جہاں سیلاب کا عتاب انتہا پر تھا۔ میں ایک گز آگے بڑھتا تو سیلاب بیس گز مجھے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جب میرے بازو اکڑ گئے۔ جسم پتھر بن گیا اور میں ڈوبنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ماں جی میری پیٹھ سے سرک گئیں۔ میں نے چیخ کر کہا ـــــ "ماں جی" ـــــ اور ایک ہاتھ ان کی بغل کے نیچے رکھ کر انہیں اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایسے نظر آیا کہ دوسری طرف کوئی اور آدمی ہے، جو ماں جی کے پہلو کے ساتھ تیر رہا تھا۔ لہریں ہمیں اوپر لے جاتیں اور زور سے نیچے پٹخ دیتیں۔

ماں جی ڈوبی نہیں۔ میں ایک بازو سے تیر رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے ماں جی کو تھامے رکھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ماں جی کے دوسرے پہلو کے ساتھ جو آدمی تیر رہا ہے اس نے بھی ماں جی کو اُس پہلو سے تھام رکھا ہے ورنہ ماں جی ڈوب چکی ہوتیں۔ میں نے ہانپتی ہوئی اور مری ہوئی آواز میں ماں جی سے چلّا کر پوچھا ـــــ "اُدھر کون ہے؟" ـــــ سیلاب کے شور میں مجھے ان کا جواب سنائی دیا ـــــ "کوئی بھائی ہے جس نے مجھے سنبھال رکھا ہے" ـــــ میں نے اور زور سے پوچھا۔ "کون ہو بھائی؟" ـــــ مگر کوئی جواب نہ ملا۔

ایسے لگ رہا تھا جیسے کنارہ کبھی نہیں آئے گا اور ہم تیرتے تیرتے خدا کے حضور پاکستان کو دیکھے بغیر پہنچ جائیں گے۔ لیکن خدا ساتھ تھا۔ سیلاب کا زور تھم گیا اور پانی کم گہرا آ گیا۔ حتیٰ کہ ہمارے پاؤں تہہ کو چھونے لگے۔ پھر کنارہ آ گیا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اندھیرے میں دوسرے آدمی کو دیکھ سکتا۔ وہ کوئی انسان نہیں فرشتہ تھا جس نے ماں جی کو سیلاب سے نکالا تھا۔ میں تو ماں جی کو ڈبو چکا تھا۔ جونہی خشکی پر قدم پڑے، میں بے ہوش ہو کر گر پڑا اور بے ہوش ہی رہا۔

آنکھ کھلی تو تیز روشنی سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ سورج نکل آیا تھا اور میں درخت کے

نیچے پڑا تھا۔ مجھے اپنے ایک پہلو کے ساتھ ماں جی اور دوسرے پہلو کے ساتھ اباّ جی بیٹھے نظر آئے۔ وہ میرے منہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دونوں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ یہ خواب کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں ڈر گیا۔ ان کے ہونٹ بند تھے اور مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ میں اتنا ڈرا کہ میرے آنسو نکل آئے۔ ماں جی کے سر پر دوپٹہ نہیں تھا۔ ان کے بال سیلاب کی مٹی سے بھرے ہوئے تھے انہوں نے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھے اور مجھے اباّ جی کی آواز سنائی دی ـــــ "گھبراؤ نہیں، مرد بنو، تھوڑی دور اور چلنا ہے" ـــــ میں نے بیس سال کے عرصے میں پہلی بار اباّ جی کی آواز سنی۔ شاید اس آواز میں جادو کا اثر تھا کہ میں اٹھ بیٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ مجھے دریا نظر نہیں آ رہا تھا۔

اباّ جی نے پوچھا ـــــ "اٹھ کے دیکھو، چل سکو گے؟" ـــــ میں اٹھا اور جواب دیا۔

"ہاں اباّ جی چل سکوں گا" ـــــ ہم تینوں چل پڑے۔

وہ اباّ جی تھے جنہوں نے سیلابی دریا میں ماں جی کو سہارا دیا تھا۔ انہیں اندھیرے اور سیلاب کے زور کی وجہ سے نہ میں پہچان سکا تھا نہ ماں جی ـــــ وہ کیمپ سے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ کنارے پر آ کر جب میں گر پڑا تو اباّ جی نے مجھے کندھے پر اٹھا لیا تھا۔ مجھے بعد میں ماں جی نے بتایا کہ دریا کے اس کنارے بھی ہندو اور سکھ بھوکے بھیڑیوں کی طرح مسلمانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مار رہے تھے۔ اباّ جی مجھے اٹھائے ہوئے چلتے گئے اور جب تھک گئے تو مجھے اس درخت کے نیچے لٹا دیا۔ میں اس دوران سویا رہا یا شاید بے ہوش رہا۔

سرحد دور نہیں تھی۔ ہم پاکستان میں پہنچ گئے اور وہ منزل پا لی جس کی خاطر قوم نے اتنی قربانی دی تھی جس سے زمین اور آسمان کانپ گئے تھے۔ اباّ جی کے کنبے کے تمام افراد گاؤں میں شہید ہو گئے تھے۔ وہ بھی میرے ماموں کی طرح گاؤں سے نکلنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اباّ جی نے ہمیں بتایا کہ وہ ان سے ناراض ہو کر شہر چلے گئے تھے لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ جب میں اپنے کنبے کو لے کر گاؤں سے نکلا تھا، اباّ جی بھی میری خاطر اور ماں جی کی خاطر گھر سے نکل آئے تھے اور ہم سے چھپ چھپ کر ہمارے پیچھے چلتے رہے تھے۔

ہم والٹن کیمپ پہنچ گئے۔ اباّ جی بہت روئے اور ماں جی بھی روتی رہیں۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کوئی گلہ شکوہ نہ کیا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ جب میں اِدھر اُدھر سوتا تھا تو وہ آپس میں کیا باتیں کرتے تھے۔ مجھے صرف یہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کہ وہ ایک دوسرے میں

گھل مل گئے تھے۔ ٹوٹے ہوئے دل جُڑ گئے تھے اور ساری کدورتیں دور ہو گئی تھیں۔ ابّا جی کی عمر پنتالیس سال اور ماں جی کی بیالیس سال ہو چکی تھی۔

ایک سال کی خانہ بدوشی کے بعد ہمیں نہایت اچھی زمین مل گئی۔ جب زمین پیسے دینے لگی تو ہم نے اور زمین خرید کر ایک بڑا سا باغ بنا لیا اور ہماری دوسری زندگی کی خوشحالی شروع ہو گئی۔ ابّا جی اور ماں جی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ میرے دو بھائی پیدا ہوئے جو اب کالج میں ہیں۔ پھر میری شادی ہوئی اور تین بچے پیدا ہوئے۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا ابّا جی چھیاسٹھ سال کی عمر میں فوت ہو گئے ہیں۔ وفات سے ایک روز پہلے انہوں نے ہنس کر ماں جی سے کہا تھا — "تمہیں یاد ہے تم نے مجھے پیغام بھجوایا تھا کہ تم میرے ہاتھوں میں مرو گے؟" — اور وہ کتنی ہی دیر ہنستے رہے تھے مگر ماں جی کے آنسو نکل آئے تھے۔ دوسرے ہی دن ابّا جی فوت ہو گئے۔

ماں جی ہر وقت خوش رہتی تھیں لیکن ابّا جی کا جنازہ نکلا تو ان پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ان کی شگفتگی ابّا جی کے ساتھ ہی مر گئی۔ میں نے اور میری بیوی نے بہلانے کی بہت کوشش کی لیکن ان کی اداسی گہری ہوتی چلی گئی۔ صرف ایک بار انہوں نے میری بیوی سے کہا — "بیٹی! سر کے سائیں کے بغیر عورت کی کوئی زندگی نہیں۔"

ابّا جی کا ابھی چالیسواں نہیں ہوا تھا کہ ماں جی کو بخار آنے لگا۔ اسی حالت میں چالیسواں کیا اور ساتویں روز اچھے سے اچھے علاج کے باوجود ماں جی سر کے سائیں کے پاس چلی گئیں۔

مَیں ہار گئی ہُوں

ت۔ک

میری عمر کا ایک منٹ ایک دن کے برابر ہوتا ہے۔ سزا کے لمحے بہت طویل ہوا کرتے ہیں۔ میں ایسے گناہوں کی سزا بھگت رہی ہوں جن میں کچھ گناہ میرے ہیں، باقی میرے ماں باپ کے۔ میری وہ بہن خوش نصیب ہے جو اچھے وقت بیاہی گئی تھی۔ اچھے وقت سے میری مراد یہ نہیں کہ اس وقت ہم امیر تھے بلکہ یہ کہ اس وقت ہم امیر نہیں تھے۔ بُرا وقت وہاں سے شروع ہوا جب ہمارے گھر میں پیسہ آنا شروع ہوا۔

میں اس وقت چھوٹی سی تھی جب والد صاحب کی چھوٹی سی دکان تھی جو گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں والد صاحب کے لیے دکان پر کھانا لے جایا کرتی تھی۔ بڑی بہن کی شادی ہو چکی تھی۔ یہ مجھے بہت بعد میں پتہ چلا تھا کہ بڑی بہن کے جہیز کے لیے والد صاحب کو قرض لینا پڑا تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ والد صاحب اور والدہ پریشان کیوں رہتی ہیں۔

ان کی پریشانی یک لخت ختم ہو گئی کیوں کہ پاکستان بن جانے سے وہ ہندو ساہوکار ہندوستان چلا گیا تھا جس سے والد صاحب نے سود پر قرض لیا تھا۔ پھر اچانک والد صاحب کی دکان بہت بڑی ہو گئی اور ایک روز والد صاحب دن کے وقت ہی گھر آ گئے۔ آتے ہی والدہ کو ساتھ لے کر گھر کا سامان باندھنے لگے۔ میں ڈر گئی کیونکہ اُن دنوں ہندوستان سے لٹے پٹے مہاجر آ رہے تھے اور ان کی جو حالت ہندوؤں اور سکھوں نے کی تھی وہی حالت یہاں کے مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کی نہیں کر سکے مگر مکان جل رہے تھے اور رات کے وقت بھی گلیوں میں بھاگ دوڑ لگی رہتی تھی۔ بچوں کو باہر

نکلنے سے منع کر دیا گیا تھا اس لیے ہم بچے ڈرے ڈرے رہتے تھے۔

جب والد صاحب، والدہ اور میرے دو بھائی گھر کا سامان باندھ رہے تھے تو میں ڈر گئی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے میرے والدین ہندوؤں اور سکھوں سے ڈر کر کہیں بھاگ کے جا رہے ہیں۔ میں انہیں دیکھتی رہی۔ وہ بہت ہی تیزی سے ٹرنک، گٹھڑیاں اور دوسرا سامان اٹھا اٹھا کر صحن میں رکھ رہے تھے۔ میں رو پڑی۔ والد صاحب شاید میرے رونے کی وجہ سمجھ گئے۔ میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا ــــــ "اری پگلی! روتی کیوں ہے؟ ہم نئے مکان میں جا رہے ہیں۔ اپنا نیا مکان دیکھنا۔ کیسی کیسی خوبصورت ٹائلوں کا فرش ہے۔ دس کمرے ہیں۔ کمروں میں پنکھے لگے ہوئے ہیں اور وہاں ریڈیو بھی ہے۔ ایسی ایسی پیاری رضائیاں اور ایسے ایسے پیارے پلنگ اور صوفے ہیں کہ تم اس کال کوٹھڑی کو بھول جاؤ گی۔"

میں واقعی اس کال کوٹھڑی کو بھول گئی۔ وہ کسی ہندو کا مکان تھا جس میں ہم رات کے وقت داخل ہوئے تھے۔ ہر کمرے میں چھت کا پنکھا اور دو بلب۔ چھ کمرے نیچے، چار اوپر۔ ہر کمرے کا فرش رنگ برنگی ٹائلوں کا۔ فرنیچر ایسا جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ باورچی خانہ الگ، چار نلکے۔ میرے لیے یہ مکان محل سے کم نہ تھا۔

میں نے دوسرے دن امّی سے کہا کہ ابو کو روٹی دے آؤں تو امّی نے بتایا کہ ہم نے وہ دکان چھوڑ دی ہے اور اب ابو نے بہت بڑی دکان لے لی ہے۔ پاکستان بننے تک منڈی پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ ہندو چلے گئے تو مسلمانوں نے ہندوؤں کی دکانوں پر قبضہ کر لیا اور اس طرح بعض پرچون فروش، آڑھتی اور تھوک فروش بن گئے۔

خدا نے میرے ماں باپ کو دیا تو چھپڑ پھاڑ کر دیا اور خدا کی اسی دین سے میری تباہی شروع ہو گئی۔ میرے والد صاحب نے شاید تین یا چار جماعتیں پڑھی تھیں۔ امّی بالکل اَن پڑھ ہیں۔ اس کے پاس زیور اتنا سا ہی تھا، جھمکوں کی ایک جوڑی اور ایک انگوٹھی۔ کسی خاص تقریب کے لیے کوئی خاص کپڑے نہیں تھے۔ والد صاحب اکثر دھوتی باندھا کرتے تھے۔ صرف جمعے اور دونوں عیدوں کے روز شلوار پہنتے تھے۔ پاکستان بننے کی دیر تھی کہ میری امّی سونے کے زیورات سے لد گئی۔ چھ چھ چوڑیاں اور ایک ایک کڑا اس

کے بازوؤں کا حصہ بن گئے۔ پڑوس کے گھر میں جائے تو سونے کا ہار ضرور گلے میں ڈالتی تھی۔ کندھوں تک لٹکتے ہوئے جھمکے بھی کانوں میں ڈال لیے۔

والد صاحب بھی رات ہی رات میں بدل گئے۔ چھوٹی سی دکان پر صبح سے رات تک ٹکے ٹکے کا سودا بیچنے والا منڈی کے چوہدریوں میں شامل ہو گیا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ کاروبار کیسا تھا۔ بس یہی کچھ نظر آتا تھا کہ کسی ہندو کے چھوڑے ہوئے اس مکان کے کسی کمرے سے خزانہ برآمد ہوا ہے۔ میں اس وقت چھوٹی تھی۔ گھر کا یہ انقلاب بہت اچھا لگتا تھا۔ اب جبکہ میں اس انقلاب کی بھینٹ چڑھ گئی ہوں تو وہ وقت یاد آنے لگا ہے۔ میرے ماں باپ غربت میں اچھے بھلے تھے۔ روز بروز خدا جو دیتا تھا اور جتنا دیتا تھا صبر اور شکر سے کھاتے تھے اور جب خدا نے دولت کا ڈھیر لگا دیا، محل جیسا مکان دے دیا اور چھوٹی سی دکان آڑھت کا گودام بن گئی تو گھر کا قدرتی پن ختم ہو گیا۔ امیروں کی طرح مصنوعی حرکتیں اور اداکاری شروع ہو گئی۔ میرے ماں باپ امیروں کے گھر تو پیدا نہیں ہوئے تھے۔ دونوں تنگ اور تاریک محلوں میں پرانی طرز کے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں پیدا ہوئے، گندی گلیوں میں کھیلے، ننگی گالیاں بکتے بڑے ہوئے۔ امّی چار دیواری کی اندھیری دنیا میں قید رہی اور والد صاحب تیسری یا شاید چوتھی جماعت سے اٹھ کر بچپن میں ہی دکان پر بیٹھے اور ان کی عمر گھر سے دکان اور دکان سے گھر تک کے چکر میں گذرتی رہی۔

انہوں نے نوٹوں کے یہ بنڈل کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ ان کے تصوّروں کی دنیا اتنی تنگ تھی کہ اس میں اتنا بڑا مکان، اتنے سارے زیورات اور اتنی ساری نقدی نہیں سما سکتی تھی۔ چھوٹے سے برتن میں مٹکے جتنا پانی ڈال دیا گیا تو پانی بہہ نکلا۔ میرے والدین اب اپنے آپ کو غریب نہیں کہنا چاہتے تھے مگر ان کا ذہن ابھی تک بدبودار گلیوں والے محلے کے چھوٹے سے مکان میں قید تھا۔ ہماری برادری ابھی تک غریب تھی کیونکہ جب ہندو اور سکھ یہاں سے بھاگے تو برادری گھروں میں سوئی رہی تھی۔ میرے والد صاحب تیز نکلے اور اپنی دنیا بدل لی۔

میرے ماں باپ نے برادری کے ساتھ جس میں چچے، تائے، ماموں اور خالو

جیسے قریبی رشتہ دار بھی ہیں، اس قسم کا سلوک شروع کر دیا جیسے برادری کا ہر ایک فرد اور گھرانہ ان کی مدد کا محتاج ہے۔ کسی کے گھر ماتم بیاہ ہوتا تو والد صاحب بادشاہوں کی طرح وہاں جاتے، گردن کو بے تکے طریقے سے اکڑا کر گھر والوں سے کہتے ــــ "اس موقعے پر تمہیں پیسوں کی ضرورت ہو گی، مجھ سے لے لینا" ــــ اور یہ کہہ کر وہ نوٹوں کی گٹھی جیب سے نکال کر آگے کر دیتے۔

ایک بار برادری کے ایک گھر میں شادی تھی۔ ہم سب گئے۔ والد صاحب نے گھر والوں کو حاکموں اور دانش مندوں کی طرح کہا ــــ "تم لوگ اتنی شو بازی نہ کرو۔ غریب لوگ ہو۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہ کرو" ــــ گھر کا ایک بوڑھا برداشت نہ کر سکا۔ اس نے والد صاحب سے کہا ــــ "ارے تو کون سے شہنشاہ کے گھر پیدا ہوا تھا۔ ڈنڈی مارتے مارتے ہندو کی دولت سے امیر بن گیا ہے . . . خبردار، میرے سامنے گردن اونچی نہ کرنا"۔ برادری کے کچھ اور لوگ بھی بول پڑے۔ سب نے میرے والد صاحب کو بُرا بھلا کہا اور انہیں جتایا کہ لوٹی ہوئی دولت سے انسان کی اصلیت نہیں بدل سکتی۔ اس پر خاصی تُرش کلامی ہوئی جس کے نتیجے میں برادری کے ساتھ ہمارے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔

برادری کو امی کی یہ حرکت بہت بُری لگتی تھی کہ ماتم پر جائے تو بھی بھڑکیلے کپڑے اور سارا ہی زیور پہن کر جایا کرتی تھی۔ ململ کا میلا سا دوپٹہ اوڑھنے والی عورت اب ریشمی دوپٹے کے بغیر باہر نہیں نکلتی تھی۔ یہ نمائش صرف کپڑوں اور زیورات تک محدود نہیں تھی۔ امی نے میک اَپ بھی شروع کر دیا تھا۔ پوڈر اس طرح لگاتی تھی کہ ابرو بھی سفید کر لیتی تھی اور لپ سٹک ہونٹوں کے کونوں سے باہر چلی جاتی تھی۔ بچپن میں تو مجھے امی کا یہ بہروپ بہت اچھا لگتا تھا مگر اب یاد آتا ہے تو کبھی ہنسی آجاتی ہے، کبھی رونا۔

مجھے مزہ تو اس سے آتا تھا کہ امی میرا بھی چہرہ سرخی اور لپ سٹک سے رنگ دیا کرتی اور مجھے اکثر کہا کرتی تھی ــــ "دیکھو بیٹی! غریبوں کے بچوں کے ساتھ نہ کھیلا کرو۔ ہم امیر لوگ ہیں" ــــ میں سمجھ بیٹھی تھی کہ امیری کی نمائش میک اَپ سے کی جاتی ہے اور غریبوں سے نفرت کر کے۔ اس طرح بچپن میں ہی مجھے بن ٹھن کر رہنے کی عادت ہو گئی۔

مجھے سکول داخل کرا دیا گیا۔ میں پہلی جماعت میں داخل ہونے کی عمر سے تین سال بڑی ہو گئی تھی۔ سکول میں میرا رویّہ وہی تھا جو امی نے بنایا تھا۔ بن ٹھن کر رہو اور امیروں کی طرح اداکاری کرو۔

میں ساتویں جماعت میں پہنچی تو میری عمر سولہ سترہ سال ہو چکی تھی۔ چھٹی جماعت میں پہنچی تھی تو مجھے برقعہ پہنا دیا گیا تھا۔ ایک طرف تو ہمارے ٹھاٹھ امیرانہ تھے جس کا اظہار گہرے میک اَپ، زیورات اور بناوٹی سی قسم کی باتوں سے ہوتا تھا۔ دوسری طرف پردے کی کڑی پابندی تھی۔ والد صاحب امیر تو ہو گئے تھے اور اپنی اصلیت بھی فراموش کر بیٹھے تھے لیکن پردے کے بھی پابند تھے جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ "لوگ یہ نہ کہیں کہ پیسہ دیکھ کر آوارہ ہو گئے ہیں"۔ اس پابندی کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا بلکہ والد صاحب نے اسے عزت اور آبرو کا مسئلہ بنا رکھا تھا۔

میں نے میٹرک پاس کر لیا تو تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میرے ماں باپ کے پیشِ نظر تعلیم نہیں تھی۔ وہ تو صرف برادری والوں کو دکھانا چاہتے تھے کہ ہماری بیٹی دس جماعت پاس ہے اور ہمارا درجہ برادری سے بہت بلند ہے۔

مجھے گھر بٹھا لیا گیا مگر مجھے نمائش کی جو عادت ڈال دی گئی تھی، اس سے مجھے چار دیواری کی قید میں گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ اتنی خوبصورت چار دیواری مجھے کال کوٹھڑی کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ بس ایک ہی جنون تھا کہ میک اَپ کروں اور بن ٹھن کر گھر گھر پھروں۔ ہم جس قسم کے محلے میں رہتے ہیں وہ آپ نے دیکھے ہوں گے بلکہ آپ ایسے ہی محلوں میں رہتے ہوں گے۔ اس گھٹی گھٹی دنیا میں لڑکیاں، باہر کے مردوں سے نہیں مل سکتیں نہ بڑے ہو کر کہیں باہر نکل کر مردوں سے دوستی کی جرأت کرتی ہیں۔ اسی کو ہم لوگ پردہ کہتے ہیں مگر میں آپ کو بتا دوں کہ جن گھرانوں میں خاندانی شرافت اور صحیح تعلیم و تربیت ہوتی ہے وہاں کی لڑکیاں پردے اور چار دیواری کی دنیا کو دل و جان سے قبول کرتی اور اسی دنیا کو شرافت اور وقار سے آباد رکھتی ہیں۔

مجھ جیسی لڑکیاں تصوروں میں بھاگی بھاگی پھرتی ہیں۔ باہر نکل کر کسی مرد کے ساتھ مل بیٹھنے اور اس سے اپنے حسن اور سنگار کی داد لینے کی جرأت نہیں ہوتی مگر تصوروں میں

ساری زنجیروں کو توڑ پھینکتی ہیں۔ میری حالت ایسی ہی تھی اور اس حالت کو میری امّی نے اس طرح اور زیادہ بگاڑ دیا تھا کہ جوں جوں میں قدرتی طور پر جوان ہوتی جا رہی تھی، میری امّی مصنوعی طور پر مجھ سے زیادہ جوان نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پیٹ پر دوپٹہ کس کر باندھتی اور شرمناک حد تک اپنے جسم کو تنا ہوا رکھتی تھی۔ یہ تو میں آج کہہ رہی ہوں کہ اس کی حرکتیں شرمناک تھیں۔ اُس وقت جبکہ یہی کچھ میرے دل و دماغ پر سوار تھا، مجھے امّی کی ہر بات اور جوان بننے کی ہر کوشش بہت اچھی لگتی تھی۔

میرا بہنوئی کبھی کبھی ہمارے ہاں آتا اور چند دن ہمارے ساتھ رہتا تھا۔ اُن دنوں میری امّی صرف میک اَپ ہی نہیں کرتی بلکہ میرے بہنوئی کے ساتھ بے حیائی کی حد تک بے تکلفی کے مظاہرے کرتی تھی۔ اسے شاید یہ خیال تھا کہ جوان آدمی کے ساتھ چونچلے کر کے اپنی گئی گذری جوانی واپس آ جاتی ہے۔ امّی کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنے بہنوئی کے ساتھ کھلنا شروع کر دیا اور وہ بھی مجھ میں دلچسپی لینے لگا۔ پہلے وہ کبھی کبھار ہمارے ہاں آیا کرتا پھر تھوڑے تھوڑے وقفے بعد زیادہ دنوں کے لیے آنے لگا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا آپ اسے سچ نہیں مانیں گے کیونکہ ماں اپنی بیٹی کی رقیب نہیں ہو سکتی مگر یہ انہونی میرے ساتھ ہوئی۔ میں بہنوئی کے پاس بیٹھی ہنس کھیل رہی ہوتی تو امّی مجھے کسی نہ کسی بہانے اٹھا دیتی اور خوب گہرا میک اَپ کیے ہوئے میرے بہنوئی کے پاس بیٹھ جاتی۔ پھر میں نے یہ دیکھا کہ جب بہنوئی ہمارے ہاں آتا تو امّی میرے ساتھ کھنچی کھنچی رہتی۔ بات بات پر نکتہ چینی کرتی۔ بلا وجہ ڈانٹ دیتی۔

میں صرف امّی کو مجرم نہیں سمجھتی۔ میں بھی مجرم تھی۔ ہمارے اخلاق کی تو بنیاد ہی کوئی نہیں تھی۔ اگر کوئی بنیاد تھی تو وہ شو بازی یعنی نمود و نمائش تھی۔ وہ میری بہن کا خاوند تھا جسے ماں بیٹی [illegible] رہی تھیں۔ آخر میری بہن کو شک گزرا کہ اس کا خاوند آئے دن ہمارے ہاں کیوں آتا ہے... سنا ہے کہ ان کا آپس میں جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔ یہ شاید ان کی ازدواجی زندگی کا پہلا جھگڑا تھا۔ میں جھگڑے کی وجہ جانتی تھی۔ بہنوئی نے ہمارے گھر آنا چھوڑ دیا اور بہن بھی ہم سے دور ہٹنے لگی مگر بہنوئی مجھ پر عجیب سا اثر چھوڑ گیا۔ جس کی میں

تشنگی محسوس کرنے لگی۔ وہ میرے حسن اور جوانی کی تعریفیں ایسے الفاظ اور ایسے لہجے میں کیا کرتا تھا کہ مجھ پر نشہ طاری ہو جایا کرتا تھا۔ ہمیں اس سے آگے بڑھنے کا موقع کبھی نہیں ملا تھا۔

بہنوئی نے تو ہمارے ہاں آنا چھوڑ دیا لیکن میں آپے سے باہر ہو گئی۔ باہر تو میں جا نہیں سکتی تھی۔ میری ساری دنیا محلے تک محدود تھی یا ریڈیو سے فلمی گانے سنتے وقت گزرتا تھا۔ میرے کردار کی کھوکھلی عمارت ان گانوں کے اشتعال انگیز الفاظ سے سجی رہتی اور دل چار دیواری کے پنجرے کو توڑ کر اُڑ جانے کے لیے تڑپتا رہتا تھا۔ خواہش صرف ایک ہی ہوتی تھی کہ بہنوئی کی طرح کوئی میرے حسن اور جوانی اور میک اَپ کی تعریفیں کرے۔

یہ حقیقت مجھ پر بہت دیر بعد کھلی کہ میں خوبصورت لڑکی نہیں ہوں۔ اب تو لڑکی بھی نہیں رہی، عورت بن گئی ہوں۔ میرا رنگ ہلکا سانولا ہے۔ غور سے دیکھو تو ایک آنکھ ذرا سی ٹیڑھی ہے۔ نقش و نگار ایسے بُرے بھی نہیں مگر نوجوانی میں ان کی جو کشش تھی وہ ختم ہو گئی ہے۔ سامنے کے دو دانت ذرا ٹیڑھے ہیں۔ میرا حسن دراصل لپ سٹک، سرخی اور پوڈر تھا یا یہ کہ میں جوان تھی۔

چار دیواری کی دنیا سے بھاگ کر میں کہاں جاتی؟ فرار کا صرف ایک راستہ تھا اور وہ تھا سیڑھیاں۔ میں سیڑھیاں پھلانگتی چھت پر چلی جاتی۔ وہاں سے مجھے دوسرے مکانوں کی چھتوں، فصیلوں اور ممٹیوں کے سوا اور کچھ نظر ہی نہ آتا۔ ہمارا یہ نیا مکان محلے کے دوسرے مکانوں سے ملا ہوا تھا۔ دوسری چھتوں پر بچے پتنگ اڑاتے نظر آتے تھے اور ان بچوں میں دو چار مرد بھی نظر آ جایا کرتے تھے۔

میں شادی کی عمر سے آگے نکلی جا رہی تھی لیکن میرے رشتے کے لیے کوئی پیغام نہیں آتا تھا۔ میں اپنی زبان سے ماں باپ کو کہہ نہیں سکتی تھی کہ مجھے کسی سے بیاہ دو جو میرے حسن اور جوانی کی تعریفیں کیا کرے۔ محلے میں میری سہیلیاں بھی تھیں جن میں سے دو میری ہمراز تھیں۔ ان سے پتہ چلا کہ برادری کا کوئی گھرانہ میرے رشتے کا خواہش مند نہیں۔ بیٹوں والے جب اپنے سامنے برادری کی لڑکیوں کی فہرست رکھتے تھے تو اس میں میرا نام بھی ہوتا تھا

مگر میرے نام پر لکیر پھیر دی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے ماں باپ کھوکھلی سی باتوں اور سفلوں کی طرح اپنے زیورات، اپنے بڑے گھر اور امارت کا تذکرہ کرتے تھے۔ چنانچہ برادری نے فیصلہ دے دیا تھا کہ ایسی ماں کی بیٹی بھی ایسی ہی ہوگی۔ ہم تو اپنے آپ کو برادری سے اونچا سمجھتے تھے مگر برادری نے فیصلہ دے دیا تھا کہ ہم ہیچ ہیں جو ہندوکے دولت اور زیورات پر اینٹھ رہے ہیں۔ مجھے امّی سے پتہ چلا کہ والد صاحب نے فیصلہ کر لیا ہے وہ برادری میں مجھے بیاہیں گے ہی نہیں۔ چنانچہ باہر کا کوئی گھرانا ڈھونڈ رہے تھے۔

اور میں کوٹھے پر کھڑی دوسرے کوٹھوں پر پتنگ اڑاتے لڑکوں اور جوانوں میں نہ جانے کسے ڈھونڈنے لگی —— اور مجھے وہ مل ہی گیا جس کی مجھے تلاش تھی۔ وہ قریب کے کوٹھے پر پتنگ اڑا رہا تھا۔ مجھے کچھ اچھا لگا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں فصیل کی اوٹ میں چھپ جانے کی بجائے کھڑی رہی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

اگر آپ کسی گنجان آباد محلے میں رہتے ہیں تو آپ نے چھتوں پر جا کر فصیلوں کے سوراخوں میں سے تانک جھانک کرنے والوں کو دیکھا ہوگا۔ یہ چوری چھپے کی محبت ہوتی ہے جو باغوں اور ہوٹلوں کی محبت سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ بے شمار مکانوں کی چھتیں ملی ہوئی ہوتی ہیں کوئی اونچی، کوئی نیچی۔ بیت الخلا چھتوں پر ہوتے ہیں اور آج کل کے "ہیر رانجھوں" کو بار بار بیت الخلا میں جانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لڑکی کپڑے دھوتی ہے تو صحن میں پھیلانے کی بجائے چھت پر جا پھیلاتی ہے اور بار بار جا کر دیکھتی ہے کہ کپڑے ہوا سے اڑ تو نہیں گئے۔

یہ ایک چپ چاپ سی محبت ہوتی ہے۔ ایسی ہی محبت میں نے بھی کی اور یہ کامیاب محبت تھی۔ کامیاب اس لحاظ سے کہ ہم پکڑے نہیں گئے۔ دن کے وقت ملنا ناممکن تھا۔ رات کو جب امّی اور ابّا کے خراٹے عروج پر ہوتے تھے تو میں دبے پاؤں چھت پر چلی جاتی تھی اور وہ دو مکانوں کی چھتوں اور فصیلوں کو پھلانگتا ہماری چھت پر آ جاتا تھا۔ یہ اس کی بہت بڑی قربانی تھی۔ سوہنی کے لیے دریائے چناب عبور کر کے مہینوال تک پہنچنا مشکل نہیں تھا، کیونکہ رات کے وقت دریا پر کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا تھا اور سوہنی گھڑے پر تیر کر جاتی تھی۔ کسی محلے میں رہنے والے ہی جان سکتے ہیں کہ کسی مکان کی چھت پر سے رات کے وقت گزرنا اور

فصیلیں پھلانگنا کتنا خطرناک کام ہے۔ کوئی پکڑ لے تو سارا محلہ اکٹھا کر کے اسے تھانے پہنچا دے۔ آدھی رات کے وقت چور کے سوا اور کون فصیلیں پھلانگتا ہے۔ اس کی اس دلیری سے میں اتنی متاثر ہوئی کہ اسے دنیا بھر کا بہادر آدمی سمجھ کر اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا۔

کھوکھلے ماں باپ کی کھوکھلے کردار کی لڑکی کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا کہ ایک آدمی اپنی جان اور خاندان کی عزت کو خطرے میں ڈال کر اس کی پوجا کرنے آتا تھا اور اسے باتوں اور حرکتوں سے یقین دلاتا تھا کہ سارے جہان میں تم جیسی حسین لڑکی کوئی نہیں۔ میرے دل میں یہ آدمی دنیا کے مردوں میں عظیم ترین آدمی تھا۔

ایک رات امّی نے مجھے چارپائی سے غائب پایا تو مجھے ڈھونڈتی ڈھونڈتی کوٹھے پر پہنچی۔ میں کوٹھے پر تھی۔ وہ فصیل پھلانگ رہا تھا۔ امّی نے اسے دیکھ لیا۔ لگی واہی تباہی بکنے۔ میں سنتی رہی اور سہتی رہی۔ مجھے والد صاحب کا ڈر تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ امّی نے انہیں بتایا تھا یا نہیں۔ انہوں نے مجھے کچھ بھی نہ کہا۔ کوئی دس روز بعد امّی نے مجھے بتایا کہ میرا رشتہ طے کر دیا گیا ہے اور شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی ہے۔ میں نے کئی بار پوچھا کہ رشتہ کہاں اور کس کے ساتھ طے ہوا ہے؟ امّی نے کسی ایک بھی سوال کا جواب نہ دیا اور ایک روز بارات آ گئی۔

شادی بڑی دھوم سے ہوئی۔ ماں باپ نے جہیز کی صورت میں اپنی امیری کا پورا پورا ثبوت دیا۔ لوگ انگلیاں دانتوں تلے دبا کر میرا جہیز دیکھتے تھے۔ صرف میں تھی جسے اس جہیز سے نفرت تھی۔ میرے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ میں جسے چاہتی تھی اس سے عمر بھر کا ساتھ نبھانے کی قسم کھائی تھی۔ اس نے بھی کہا تھا کہ وہ میرے سوا کسی اور لڑکی کو اپنے گھر نہیں بسائے گا۔ ہماری قسمیں ٹوٹ رہی تھیں اور میں جل بھن رہی تھی۔ شادی سے دو روز پہلے میں اسے ملی تھی اور اسے کہا تھا کہ میں اپنے خاوند کو اتنا پریشان کروں گی کہ وہ طلاق دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ میں جس روز طلاق لے کے آ جاؤں گی اس سے اگلے روز وہ مجھے کہیں دور لے جائے گا۔

میری ڈولی اسی شہر کے ایک محلے میں جا اتری۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا اور

میں سوچ رہی تھی کہ وہ کون بدنصیب ہوگا جو میرا خاوند ہوگا۔ آخر وہ میرے سامنے آگیا۔
خاصا خوبرو آدمی تھا۔ شکل وصورت اور قد بُت کے لحاظ سے اس میں کوئی نقص نہیں
اس میں جو نقص تھا وہ تھوڑے دنوں بعد ظاہر ہوگیا۔ وہ یہ تھا کہ وہ بھلا مانس سا آدمی تھا
میری کسی چیز کی تعریف نہ کی، جس طرح میرا چاہنے والا پیارے پیارے لفظوں میں مجھے
یقین دلایا کرتا تھا۔ اس طرح میرے خاوند نے ایک لفظ نہ بولا۔ مجھے وہ بدھو سا لگتا تھا۔ دوسرا
یہ ہوا کہ یہ گھرانا ہماری طرح امیر نہیں تھا۔ میری ساس اور سُسر بوڑھے تھے۔ میرا خاوند
لیکچر دیتا تھا کہ میں ان کی خدمت کیا کروں۔

وہ خود میری بہت خدمت کیا کرتا تھا۔ میرے اشاروں پر ناچتا تھا اور تنخواہ اپنے
باپ کو دیا کرتا تھا۔ اس کی سادگی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ میں خودسر ہونے لگی اور
میرا خاوند میرا غلام بن گیا۔ اس کے ماں باپ کی تو میں ذرہ بھر پروا نہیں کرتی تھی۔ میرا
نماز روزے کا پابند تھا۔ ایک روز مجھے کہنے لگا کہ بیٹا! ہر وقت سرخی پوڈر اچھا نہیں لگتا۔ میں
نے تمہیں کبھی قرآن پڑھتے نہیں دیکھا، نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی خدا کو بھی یاد کر لیا کرو۔
مجھے غصہ آگیا جو میں نے رات کو اپنے خاوند پر نکالا اور اسے کہا کہ نہ میں مولویوں کے
گھر پیدا ہوئی ہوں نہ مولویوں کے گھر خوش رہ سکتی ہوں۔ اگر ماں باپ کی خدمت کرانی
ہے تو نوکر یا نوکرانی رکھ لو۔ میں اپنے ماں باپ سے پیسے لا کر اسے تنخواہ دے دیا کروں
گی۔ میرے خاوند نے غلاموں کی طرح مجھ سے معافی مانگی پھر التجا کی کہ میں اس کے بوڑھے
ماں باپ کا خیال رکھا کروں مگر میں نے کبھی بھولے سے بھی ان کا خیال نہ رکھا۔

جوں جوں دن گذرتے جا رہے تھے۔ خاوند میرے آگے بچھتا چلا جا رہا تھا اور میں اس
کی گردن پر سوار ہوتی جا رہی تھی ___ میں اٹھتے بیٹھتے ان لوگوں پر اپنے ماں باپ کی
امیری اور اپنے جہیز کی دھونس جماتی تھی۔ یہ لوگ بالکل امیر نہیں تھے۔ میرے خاوند کی تھوڑی
سی تنخواہ تھی جس پر گھر کا گذارا چلتا تھا۔ شروع شروع میں مجھے حیرت ہوئی کہ میرے ماں
باپ نے مجھے اس گھر میں کیوں بیاہ دیا ہے؛ کچھ عرصہ بعد راز کھلا کہ ماں نے مجھے اُس آدمی سے
ملتے پکڑ لیا تھا۔ اس لیے وہ ناک بچانے کی خاطر مجھے بہت جلد ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرنا
چاہتی تھی۔ چنانچہ کسی کی سفارش سے میرا رشتہ سوچے سمجھے بغیر اس گھرانے کو دے دیا گیا تھا۔

میں تین چار روز سسرال رہتی اور دس بارہ روز میکے میں گذارتی۔ ماں باپ کو میں
جھوٹ موٹ کی کہانیاں سناتی کہ میں سسرال میں بہت تنگ ہوں۔ خاوند آوارہ ہے اور ساس
اور سُسر مجھ پر بے جا سختیاں کرتے ہیں۔ میں اپنے ماں باپ کو خوب بھڑکاتی اور وہ بھڑک اٹھتے۔
میں جتنے دن میکے رہتی زیادہ وقت کوٹھے پر گذرتا اور موقع ملے تو رات کو بھی کوٹھے پر چلی
جاتی تھی۔ اس آدمی کے مقابلے میں میرا خاوند بھُربھری مٹی کا بُت تھا۔

شادی ہوئے ابھی سات آٹھ مہینے گذرے تھے کہ میں نے خاوند سے بلاوجہ لڑائی مول
لے لی اور روٹھ کر میکے آگئی۔ خاوند سے کہہ آئی کہ اب واپس نہیں آؤں گی۔ دوسرے دن
خاوند آگیا۔ میرے والد صاحب اور امّی نے اسے بہت ڈانٹا اور کہا کہ تم ہماری بچّی کو نوکرانی
سمجھتے ہو۔ یہ گھر کے کام کاج کی عادی نہیں۔ سونے چاندی میں پلی ہے وغیرہ وغیرہ۔

خاوند مجھ سے ملا تو میں نے اسے صاف کہہ دیا کہ واپس نہیں جاؤں گی۔ یقین کیجیے کہ
اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑے پھر میرے پاؤں چھُو لیے۔ مجھے آج خیال آتا ہے کہ خاوند
تو مجازی خدا ہوتا ہے۔ مگر اُس وقت جب میرے دماغ میں کوئی اور جنون سمایا ہوا تھا، مجھے
لطف آ رہا تھا کہ ایک آدمی میرے پاؤں چھُو رہا ہے۔ وہ بزدل آدمی تھا۔ مجھے اس سے
نفرت ہوگئی۔

تھوڑے دنوں بعد اس کا باپ تین چار بزرگوں کو ساتھ لے کر آیا تو میرے والد صاحب
نے مجھے ان کے ساتھ بھیج دیا۔ میں نے رات کے وقت خاوند سے کہا ___ "تم مرد نہیں ہو۔
مجھے ایسے مرد کی ضرورت ہے جس کے میں پاؤں چھوؤں" ___ خاوند کی سادگی اور بزدلی
کی وجہ سے میں شیر ہوگئی تھی۔ میں نے اسے بلا جھجک کہا ___ "میں ایک آدمی کو چاہتی ہوں۔
بہتر ہے کہ مجھے طلاق دے دو"

میرے خاوند نے کہا ___ "ابھی اٹھو" ___ اور وہ یک لخت بدل گیا۔ میں کچھ دبک
گئی۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور پھر کہا ___ "ابھی اٹھو" ___ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ خود
ہی میرا برقع لے آیا اور میرے کندھے پر پھینک کر کہا ___ "چلو"۔
وہ مجھے باہر لے گیا۔ تانگے میں بٹھایا اور تانگہ میرے ماں باپ کے گھر کی گلی کے سامنے
جا رکا۔ ہم اپنے گھر میں داخل ہوئے تو امّی اور میرے والد صاحب ہمیں دیکھ کر حیران ہوگئے

کہ اس وقت ہم کیوں آئے ہیں۔ میرے خاوند نے مجھے بازو سے پکڑا اور زور سے جھٹکا دے کر مجھے والد صاحب کی طرف دھکا دیا۔ میں والد صاحب کے پلنگ پر جا پڑی۔ میرے خاوند نے مردوں کی طرح دبدبے سے کہا ——"تمہاری بیٹی کسی اور کو چاہتی ہے اور آج اس نے مجھ سے طلاق مانگی ہے۔ یہ رہی تمہاری بیٹی۔ میں اسے نہیں بساؤں گا اور طلاق بھی نہیں دوں گا۔ میں دیکھتا ہوں تمہاری دولت میرا کیا بگاڑتی ہے"——میری امی اور والد صاحب حیران و ششدر اسے دیکھتے رہے اور وہ چلا گیا۔

میں نے اپنے ماں باپ کو سسرال اور خاوند کے خلاف جھوٹے الزام لگا کر خوب بھڑکایا اور دل میں خوش ہونے لگی کہ اب اپنی مرضی کے آدمی سے شادی کرلوں گی۔ ماں باپ نے بھی فیصلہ کردیا کہ مجھے سسرال نہیں بھیجیں گے۔ انہیں اپنی دولت پر گھمنڈ تھا اور مجھے اپنے چاہنے والے پر ناز تھا۔ میں نے کوٹھے کا رومان نئے ولولوں سے شروع کردیا۔

پانچ چھ مہینے گزر گئے۔ نہ میرے سسرال سے کوئی مجھے لینے آیا نہ ہماری طرف سے کوئی سمجھوتے کے لئے گیا۔ میں نے اپنے ماں باپ کو خوب بھڑکا رکھا تھا۔ میں چونکہ اب شادی شدہ تھی اس لئے میرے لیے باہر نکلنے کی پابندیاں ختم ہوگئی تھیں۔ میں سہیلیوں سے ملنے کے لئے چلی جایا کرتی تھی۔ ایک روز میں نے امی سے کہا کہ دو سہیلیوں کے ساتھ پکچر دیکھنے جارہی ہوں تو امی نے اجازت دے دی۔ میں بن ٹھن کر نکل گئی۔ میں دراصل سہیلیوں کے ساتھ نہیں بلکہ اُس آدمی کے ساتھ پکچر دیکھنے جارہی تھی۔ ایک روز پہلے ہم نے کوٹھے پر پروگرام طے کیا تھا۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ مجھے کہاں ملے گا۔ میں وہاں گئی تو وہ میرے انتظار میں کھڑا تھا۔

ہم پکچر ہاؤس کے باہر کھڑے تھے۔ پہلا شو ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ میں نے برقعے کا نقاب گرا رکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرا خاوند آرہا تھا۔ میں نے اپنے دوست کو اپنا خاوند دکھایا اور اسے کہا کہ اسے دو چار تھپڑ جڑ دو۔ میں اپنے خاوند کو دکھانا چاہتی تھی کہ جسے میں چاہتی ہوں وہ دیکھو کتنا دلیر مرد ہے اور تم بزدل ہو۔ میں جسے چاہتی تھی اسے بھڑکایا۔ اتنے میں میرا خاوند ہمارے قریب سے گذر کر آگے چلا گیا۔ آگے چل کر وہ پھر واپس آیا۔ میں

نے نقاب اٹھا دیا تا کہ وہ مجھے دیکھ لے۔ میں اسے پوری طرح جلانا چاہتی تھی۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ کسی نہ کسی بہانے اس کی بے عزتی کردو۔ وہ ذرا جھجک گیا لیکن میں اس کے پیچھے پڑی رہی۔

جب میرا خاوند قریب آیا تو میرے دوست نے آگے ہو کر اسے کہا——"اوئے تمہیں شرم نہیں آتی بار بار ادھر دیکھتے ہو۔ آنکھیں نکال لوں گا"—— میرے خاوند نے میری طرف دیکھا۔ پھر میرے دوست کی طرف دیکھا اور میں نے یہ دیکھا کہ میرے خاوند کے دائیں بازو نے حرکت کی۔ مجھے ہلکی سی دھمک کی آواز سنائی دی اور میرا دلیر اور جوانمرد دوست الٹے پاؤں پیچھے کو لڑکھڑاتے ہوئے سات آٹھ قدم پیچھے جا پڑا۔ وہ پیٹھ کے بل گرا اور ایسا گرا کہ اس کی ٹانگیں اوپر اٹھ گئیں۔ میرا خاوند وہیں کھڑا رہا۔ جب میرا دوست اٹھا تو اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ میرے خاوند نے اسے پوری طاقت سے گھونسا مارا تھا۔

وہ اٹھا اور میری طرف دیکھے بغیر سڑک کی طرف چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کہیں سے ڈنڈا یا چھری یا چاقو لینے گیا ہے اور واپس آکر میرے خاوند کو قتل کردے گا مگر وہ ایسا گیا کہ واپس ہی نہ آیا۔ میرے خاوند نے وہیں کھڑے کھڑے مجھ سے کہا——"جاؤ ایسے چھ یار اور لے آؤ۔ میں یہیں کھڑا ہوں"

میرے لیے یہ صورتِ حال بڑی عجیب اور بہت تکلیف دہ تھی۔ میں نے تو کچھ اور سوچا تھا۔ مجھے اپنے کوٹھے کے دوست کی بہادری کا مان تھا اور میں اپنے خاوند کی بزدلی کو بھی جانتی تھی۔ مگر معاملہ الٹ ہوگیا تو میرا پسینہ نکل آیا۔ میں نے نقاب نیچے گرا دیا۔ چند ایک آدمی تماشہ دیکھنے آگئے تھے۔ مجھے ایسے لگا جیسے انہوں نے سارے مردوں کے سامنے مجھے ننگا کردیا گیا ہو۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے وہاں سے چل پڑی۔ میرا خاوند وہیں کھڑا رہا۔ سینما کے احاطے سے باہر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرا بہادر دوست کہیں نظر نہ آیا۔ گھر جا کر کوٹھے پر چڑھی۔ وہ کہیں نظر نہ آیا۔ دوسرے دن بھی کوٹھے پر گئی۔ بہت دیر فصیل سے لگی کھڑی رہی۔ پھر میں آٹھ روز بہت دیر تک کوٹھے پر کھڑی رہی۔ وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ نویں روز میں ایک سہیلی کے گھر جارہی تھی کہ وہ مجھے اپنے دروازے کے سامنے کھڑا نظر آیا وہ

دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں قریب گئی تو اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے نقاب اٹھا رکھا تھا۔ اس کا اوپر والا ہونٹ ناک کے نیچے سے کٹا ہوا تھا اور دونوں ہونٹ ابھی تک تھوڑے سے سوجے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے دیکھا تو گھبرا گیا۔ یک لخت گھوما اور اتنی تیزی سے اندر چلا گیا جیسے میں بھی اپنے خاوند کی طرح اس کے منہ پر گھونسا دے ماروں گی۔

میرا دماغ چکرا گیا اور اس چکر میں مجھے دو آدمی گھومتے نظر آنے لگے۔ ایک دلیر، دوسرا بزدل مگر مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ دلیر کون اور بزدل کون ہے۔ ایک کی باتوں میں آتنی کشش تھی کہ میں نے اپنی آبرو بھی قربان کر دی۔ دوسرا سیدھا سادہ حقیقت پسند آدمی جسے میں نے نفرت سے ٹھکرا دیا۔ میرے کردار اور میری سوچوں کی بنیادوں میں ریت بھری ہوئی تھی۔ عمارت گر پڑی اور میں اپنے ہی الٹے سیدھے خیالوں میں بھٹک گئی۔

رات آئی تو جاگتے گذر گئی۔ رہ رہ کر یہی فیصلہ سامنے آتا تھا کہ خاوند کے پاس چلی جاؤں مگر ماں باپ کی ناک خطرے میں تھی۔ میں اپنی زبان سے انہیں کہہ نہیں سکتی تھی کہ میں سسرال جا رہی ہوں۔ البتہ امی سے اتنا ضرور پوچھا کہ امی، کیا وہ مجھے لینے آئیں گے؟ نہ آئے تو تم لوگ کیا کرو گے؟ امی نے جواب دیا ــــ "ہم ایک دو مہینے انتظار کریں گے۔ وہ اگر چپ رہے تو ہم دعویٰ دائر کر دیں گے کہ تمہیں طلاق دے کر پورا حق مہر ادا کریں یا ماہوار خرچہ دیں جو ایک سو روپیہ لکھوایا گیا تھا" ــــ امی نے گردن تان کر کہا ــــ "ان کمبختوں کے پاس ہے ہی کیا جس سے مقدمہ لڑیں گے؟ ہم چھ ہزار کا وکیل کھڑا کریں گے اور پیسے کے زور سے مقدمہ جیت لیں گے۔ مردود ساری عمر یاد کریں گے کہ کن بادشاہوں سے ٹکر لے بیٹھے تھے!"

والد صاحب کے ارادے بھی ایسے ہی تھے اور میں ان کے ارادوں اور اپنے جذبات کے جھمیلوں میں الجھتی چلی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے خاوند کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اسے جو کچھ کہا اور اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ اب انگاروں کی طرح مجھے ہی جلا رہا تھا۔ میں کس منہ سے اس کے سامنے جاتی۔

چھ مہینے گزر گئے۔ میرے والد صاحب نے دیوانی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور میرے خاوند کو سمن بھیج کر دو مہینے بعد کی تاریخ دی گئی۔ مجھے اور میرے ماں باپ کو امید تھی کہ پہلی ہی پیشی پر مقدمے کا فیصلہ ہمارے حق میں ہو جائے گا اور ہمیں حق مہر کا دس ہزار

روپیہ مل جائے گا مگر پہلی پیشی پر پتہ چلا کہ میرا خاوند عدالت میں آیا ہی نہیں۔ سمن کی تعمیل نہیں ہو سکی۔ اگلی تاریخ تین ماہ بعد کی دی گئی۔ تین مہینے تین سالوں کی طرح گزرے۔ مجھے بھی عدالت میں جانا پڑتا تھا۔ تین گھنٹے باہر انتظار کرتے کرتے ہمارے نام پکارے گئے۔ اندر گئے تو جج کے ریڈر نے کہا کہ سمن کی تعمیل نہیں ہوئی۔ دوسری پارٹی شہر سے باہر گئی ہوئی ہے۔ ایک اور تاریخ دی گئی۔ تین مہینے بعد۔

پورے ایک سال تک میرا خاوند عدالت میں حاضر نہ ہوا۔ ہمارے وکیل نے بتایا کہ سمن کی تعمیل کرانے والے کو دو چار روپے دے دیئے جاتے ہیں اور وہ سمن پر لکھ دیتے ہیں کہ متعلقہ آدمی بہت تلاش کے باوجود نہیں مل سکا۔ ایک سال بعد اخبار میں اشتہار دلوایا گیا۔ دو مہینے بعد کی ایک پیشی پر میرا خاوند آ گیا۔ کارروائی کچھ بھی نہ ہوئی۔ اس کے وکیل نے دو چار اعتراض کیے اور جج نے ایک اور لمبی تاریخ دے دی۔

مقدمے کا دوسرا سال تھا کہ ایک روز میری دو سہیلیاں میرے گھر آئیں۔ کہنے لگیں کہ ایک سہیلی کی شادی پر جا رہی ہیں۔ آج بارات آ رہی ہے۔ میں بھی چلوں۔ میں نے کپڑے بدلے اور جب بڑے آئینے کے سامنے بیٹھ کر میک اپ کرنے لگی تو میں بیان نہیں کر سکتی کہ میرے سینے میں کیسا بھونچال آیا۔ ایسے معلوم ہوا جیسے آئینے میں میرا عکس مجھے نفرت سے دیکھ رہا ہو اور جیسے میں سرخی پوڈر کی صورت میں اپنے چہرے پر لعنت مل رہی ہوں۔ میں نے عادت کے مطابق چہرے پر پوڈر وغیرہ کا لیپ کر دیا۔ جب ہونٹ لپ سٹک سے لال ہو گئے تو میری نظروں کے سامنے اپنے چاہنے والے کے ہونٹ آ گئے اور وہ منظر یاد آ گیا جب وہ میرے خاوند کا گھونسا کھا کر گرا تھا تو اس کے ہونٹوں سے لپ سٹک کے رنگ کا خون بہہ رہا تھا۔ میرے دل سے حقارت کا طوفان اٹھا۔ مجھے اس آدمی سے تو نفرت ہو ہی گئی تھی، اپنے آپ سے بھی نفرت ہونے لگی۔ ماں باپ کے اوچھے پن نے مجھے گناہگار کیا اور اب میں اکیلی سزا بھگت رہی تھی۔

مجھے بناؤ سنگار سے گھن آنے لگی۔ جی میں آئی کہ منہ دھو ڈالوں لیکن سہیلیاں مجھے ساتھ لے گئیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ شادی کون سے گھر میں ہے۔ ہم گلیوں میں چلی جا رہی تھیں اور ایک سہیلی مجھے سنا رہی تھی کہ جس کی شادی ہو رہی ہے وہ نیک اور غریب سی لڑکی ہے۔ اس

کا کنبہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ میری سہیلی بولے جا رہی تھی اور میں اپنی سوچوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکی ہوئی پوری بات سن ہی نہیں رہی تھی اور مشین کی طرح چلی جا رہی تھی۔

ایک گھر کے سامنے شادی کا ہنگامہ تھا۔ گلی میں دو دیگیں پک رہی تھیں۔ جب میں سہیلیوں کے ساتھ شادی والے گھر میں داخل ہوئی تو مجھے دھچکا سا لگا جس نے مجھے جوانی سے اٹھا کر بچپن میں پھینک دیا۔ اس گھر کی دیواروں، کواڑوں اور چھتوں نے شاید مجھے پہچان لیا تھا اور مجھ پر اپنا تاثر طاری کر دیا تھا۔ مجھے تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ میں اسی گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ ہمارا مکان تھا جسے خالی کر کے میرے والد صاحب نے ایک ہندو کے مکان پر جا قبضہ جمایا تھا۔

آج اس گھر میں شادی کی رونق تھی۔ در و دیوار بھی مسکرا رہے تھے۔ ہر کوئی ہنس کھیل رہا تھا۔ صرف میں تھی جو آہیں بھر رہی تھی اور اندر ہی اندر رو رہی تھی۔ مجھے چھوٹا سا یہ غریبانہ مکان بہت ہی پیارا لگ رہا تھا۔ میرا بچپن اور میری معصومیت اس گھر میں دفن تھی اور کبھی کبھی ایسے لگتا تھا جیسے یہ میرا مقبرہ ہے اور میں اس میں دفن ہوں۔ کتنے اچھے تھے وہ دن جب میرے والد صاحب حق حلال کی کماتے اور بڑے پیار سے پیسے گھر لاتے تھے۔ میں اسی گھر سے ان کے لیے چھوٹی سی دکان پر کھانا لے جایا کرتی تھی —— اگر میں اسی گھر میں جوان ہوتی تو لوگ میرے متعلق بھی یہی کہتے کہ یہ بڑی نیک اور غریب لڑکی ہے۔

میں نے دلہن کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر قدرتی رونق تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں دلہن بنی تھی تو میرے چہرے پر ایسی رونق نہیں تھی۔ اگر رونق تھی بھی تو میں نے اسے سرخی پوڈر اور کوٹھے کی مجرمانہ محبت تلے چھپا دیا تھا۔ میرے چہرے کی رونق داغدار تھی۔

میں دلہن کے پاس جا بیٹھی تو اس کی کسی سہیلی نے مجھے بتایا کہ لڑکی ہجرت سے پہلے شہزادی ہوا کرتی تھی۔ ہندوستان میں ان کا محل جیسا مکان تھا۔ امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ یہاں آئے تو سر چھپانے کو یہ جھونپڑا جیسا مکان خالی دیکھا تو اسی میں ڈیرے ڈال دیئے لیکن اتنے صبر والے لوگ ہیں کہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔

میں اسے کیسے بتاؤں کہ اس کنبے کے لیے محل جیسا مکان یہاں بھی موجود تھا مگر اس

میں ہم جھونپڑا نشینوں نے جا ڈیرے ڈالے ہیں۔ یہ تھا تو میرے ماں باپ کا گناہ لیکن اس کا بوجھ بھی میرے ضمیر پر آن پڑا اور میری روح کراہنے لگی۔ میں نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا لیکن بھاگنا آسان نہ تھا۔ سہیلیوں نے جکڑ رکھا تھا۔ اتنے میں بارات آگئی۔ بارات کو کھانا کھلایا گیا۔ نکاح پڑھا گیا اور شام سے ذرا پہلے دولہا کو اندر لایا گیا۔ دلہن کی سہیلیوں نے اسے کرسی پر بٹھا کر گھیر لیا اور اس کا ناک میں دم کر دیا۔

کسی لڑکی نے اس کے چہرے سے سہرا اٹھا کر پیچھے پھینک دیا۔ جب چہرہ بے نقاب ہوا تو میرا خون کھول اٹھا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور میں لڑکیوں کے ہجوم سے نکل آئی۔ دُلہا کے اوپر والے ہونٹ پر میرے خاوند کے ڈیڑھ سال پرانے گھونسے کا نشان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہونٹ ایسے طریقے سے کٹا تھا کہ زخم ٹھیک ہو کر بھی نہ مل سکا۔ میں وہاں سے بھاگ آئی۔

اور اب آٹھواں سال گزر رہا ہے۔ آخری میک اَپ کیے آٹھ سال گزر گئے ہیں۔ مقدمہ دیوانی عدالت میں چل رہا ہے۔ لمبی لمبی تاریخیں ملتی ہیں۔ ہر تاریخ پر عدالت میں جاتی ہوں۔ خاوند کو برقعے کے باریک نقاب میں سے دیکھتی رہتی ہوں۔ دل اچھل کر حلق میں اٹک جاتا ہے۔ روتی ہوں۔ آہیں بھرتی ہوں۔ میں بیوہ نہیں۔ خاوند ہے مگر نہیں ہے۔ میرے ماں باپ کو جس روپے پر ناز تھا وہ بیکار ثابت ہو گیا ہے۔ وکیل کہتا ہے ابھی مقدمہ دو سال اور چلے گا۔

میں اَب چار دیواری میں قید رہتی ہوں۔ اتنی خوبصورت چار دیواری مجھے افریقہ کے اُس درخت کی طرح چوس رہی ہے جس کے متعلق کہتے ہیں کہ کوئی اس کے نیچے جا کھڑا ہو تو اس کی شاخیں جھک کر اس کا خون چوس لیتی ہیں۔ کبھی کبھی کوٹھے پر جاتی ہوں تو چار دیواری کی قید سے اکتائی ہوئی کوئی لڑکی کسی چھت پر کھڑی نظر آتی ہے اور کسی دوسری چھت پر کوئی نوجوان کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ میرا دل ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ میں ان لڑکیوں کو اپنی کہانی سنانا چاہتی ہوں مگر کیسے سناؤں۔ ان حادثوں کے تسلسل کو کیسے توڑوں؟

اگر میرا بس چلے تو میں اس کنبے کو جو ہمارے پرانے مکان میں آباد ہے جا کر کہوں کہ تم ہمارا نیا اور بڑا مکان لے لو اور مجھے میرا پرانا جھونپڑا واپس کر دو۔ مگر میں

بے بس ہوں۔

آج یہ انگارے اس امید پہ اگل دیئے ہیں کہ مجھ جیسی کوئی لڑکی یا کوئی میرے ماں باپ جیسے ماں باپ پڑھ کر عبرت حاصل کریں اور وہیں سے واپس اپنی اصلیت کی طرف لوٹ جائیں اور ہر کسی کو بتائیں کہ اس راستے پر نہ جانا۔ ہم نے آگے ایک لڑکی کی معصومیت اور عصمت کی گلی سڑی لاش پڑی دیکھی ہے۔ یہ راستہ خطرناک ہے۔

میں گل سڑ رہی ہوں۔ شاید اگلی پیشی پر یا شاید اس سے پہلے ہی میں اپنے خاوند کے قدموں میں جا گروں اور اسے کہوں کہ تم مرد ہو۔ میں ہار گئی ہوں۔ شاید میں ایسا کر ہی گزروں گی۔ مجھے امید ہے کہ میرا خاوند مجھے بخش دے گا اور مجھے تھام لے گا۔ وہ مرد ہے۔

میں زہریلی لڑکی تھی

نگہت عزیز

میں ایک زہریلی لڑکی تھی۔ میرے وجود میں میرے ماں باپ نے زہر بھرا تھا۔ اس نے میری ازدواجی زندگی جہنم بنا دی تھی۔ میں نے اپنے خاوند کو بھی اس جہنم میں جھونک دیا تھا۔ میرا مزاج سڑیل، تنگ اور غصیلا تھا۔ میں ہر بات سے کوئی ایسی بات نکال لیتی تھی جس سے میرے غصے اور گھرکیوں میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ میں اسی کو زندگی سمجھتی تھی کیونکہ یہ خصائل میری فطرت بن گئے تھے۔

میری امی اور ابا جان آپس میں بہت لڑتے تھے۔ جو جلی کٹی، غلیظ اور بیہودہ بات منہ میں آتی تھی ایک دوسرے کو کہہ گزرتے تھے۔ ان کی آپس کی لڑائی روزمرہ کا معمول تھا۔ شکست ہمیشہ ابا جان کو ہوتی تھی۔ وہ ہار مان کر یا تو باہر نکل جایا کرتے تھے یا ہمیں ڈانٹ کر یا کسی نہ کسی بچے کو کسی نہ کسی بہانے دو چار تھپڑ مار کر غصہ ٹھنڈا کر لیا کرتے تھے۔ ہم آخر بچے تھے۔ ہمیں ماں باپ پر غصہ آتا تھا لیکن ان کا ہم کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اس لیے ہم بہن بھائی آپس میں لڑ جھگڑ کر ناخنوں سے ایک دوسرے کو زخمی کر کے غصہ ٹھنڈا کر لیا کرتے تھے۔ اس طرح ہمارا گھر میدان کارزار بنا رہتا تھا۔ میں نے ہوش سنبھالا تو گھر کو اسی حالت میں دیکھا۔ مجھ سے بڑے دو بھائی تھے۔ ایک دو سال اور دوسرا چار سال بڑا تھا۔ ہو سکتا ہے جب میں دودھ پیتی بچی تھی تو انہوں نے کبھی مجھے پیار سے اٹھایا ہو یا میرے ساتھ کبھی کھیلے ہوں۔ جہاں تک مجھے میری یادیں پیچھے لے جاتی ہیں، یہی کچھ نظر آتا ہے کہ کبھی مجھے ایک بھائی مار پیٹ رہا ہے کبھی دوسرا۔ یا یہ نظر آتا ہے کہ امی اور ابا ایک دوسرے پر

چڑیلوں کی طرح چیخ رہے ہیں۔ اس جنگ کے بعد کسی نہ کسی بچے کی پٹائی ہو جایا کرتی تھی اور اس پٹائی کے بعد ہم بہن بھائی ایک دوسرے کو پیٹ ڈالتے تھے۔ ہمارے لیے گھر میں پیار اور شفقت کا نام و نشان نہ تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرا ایک بھائی چار سال ہوئے لا پتہ ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ جیل خانے میں بند ہے۔ وہ میٹرک پاس نہیں کر سکا تھا۔ یہی حال دوسرے بھائی کا ہے۔ وہ میٹرک میں دو بار فیل ہوا اور تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ اب وہ ایک بنک میں چپڑاسی ہے۔ لڑکے تو گھر سے بھاگ سکتے ہیں۔ کوئی ٹھکانہ نہ ملے تو لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں راتیں فٹ پاتھوں، باغوں اور ریلوے سٹیشنوں کے تیسرے درجے کے مسافر خانوں میں سو کر گزار سکتے ہیں۔ لڑکیاں بھاگ کر کہاں جائیں؟ کون ہے جو گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کو بہن یا بیٹی بنا کر گھر رکھ لے گا اور کون ایسا دردمند ہے جس کے دل میں یہ احساس بیدار ہوگا کہ یہ لڑکی گھر کے دوزخ سے بھاگی ہوئی پیار اور شفقت کی تلاش میں بھٹک رہی ہے؟

میں بھی دراصل گھر سے بھاگی تھی لیکن سکول میں پناہ لے لی تھی۔ اللہ جنت نصیب کرے ابا جان کو جن کے دل میں یہ شوق تھا کہ بچوں کو پڑھانا ضرور ہے۔ یہ گھر کے ماحول کا قصور تھا کہ میرے دونوں بھائی تعلیم سے بھاگے۔ انہوں نے جب مجھے سکول داخل کرایا تو میں نے عمر کے چھٹے سال پہلی بار سکون محسوس کیا۔ اللہ نے کرم یہ کیا کہ پہلی جماعت کی استانی بڑی پیاری عورت تھی۔ وہ بچیوں کو مارتی پیٹتی نہیں تھی بلکہ پیار سے پڑھاتی اور سمجھاتی تھی۔ یہ تو میں چوتھی جماعت میں جا کر معلوم ہوا تھا کہ ہماری پہلی جماعت کی استانی کے چار بچے مر چکے تھے۔ بچہ پیدا ہوتا تھا تو چھ سات مہینوں بعد مر جاتا تھا۔ چاروں بچے اسی عمر میں مر گئے تو اس مظلوم ماں کو اسی جرم پہ طلاق مل گئی کہ اس کے خون میں کوئی ایسا نقص ہے کہ اس کے بچے زندہ نہیں رہتے۔ اس کے خاوند نے دوسری شادی کر لی۔

ہماری پہلی جماعت کی استانی عظیم عورت تھی۔ اس نے اس قدر ہولناک صدمہ اپنے سینے میں جذب کر کے اسے پیار کا رنگ دے دیا تھا اور یہ پیار میرے

حصے میں بھی آیا۔ اسی پیار کا نتیجہ تھا کہ مجھے سکول اور کتابوں سے پیار پیدا ہو گیا اور میں سکول کو بڑی پیاری پناہ گاہ سمجھنے لگی۔ دن بھر کے یہی چھ گھنٹے سکون نصیب ہوتا تھا یا رات کا وہ وقت جب میں گہری نیند سوئی ہوتی تھی اور بڑے خوبصورت خواب دیکھا کرتی تھی۔

ہمارے گھر میں صرف ایک بار اور آخری بار کھلونا آیا تھا۔ وہ ایک آنے کا غبارہ تھا جس میں گیس بھری ہوئی تھی۔ ابا جان یہ غبارہ میرے لیے لائے تھے۔ امی نے اسی پر اودھم مچا دیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگی کہ یہ لچھن اس گھر میں نہیں چلیں گے۔ کھانے کو ملتا نہیں اور یہاں کھلونے آنے لگے ہیں۔ حالانکہ ہم کوئی ایسے غریب نہیں تھے کہ کھانے کو بھی نہ ملے۔ ابا جان ریلوے میں ملازم تھے۔ روزمرہ کی ضروریات کے لئے جن میں ہماری تعلیم بھی شامل تھی، ان کی تنخواہ کافی تھی۔ مگر امی کو لڑنے کا بہانہ درکار تھا جو انہیں مل گیا۔ ابا جان اندر کمرے میں جا بیٹھے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ انہوں نے امی کی کسی بات، کسی طعنے اور کسی گالی کا جواب نہ دیا۔

میں غبارے کا دھاگا ہاتھ میں لیے صحن میں ڈری ڈری سی کھڑی تھی۔ امی ایسی ایسی بیہودہ باتیں کہہ رہی تھی کہ مجھے غبارے سے ڈر آنے لگا۔ میں نے گلی میں بچوں کو غباروں کے ساتھ لمبے لمبے دھاگے باندھ کر غبارے اڑاتے دیکھا تھا۔ غبارے مجھے اچھے لگتے تھے مگر غبارہ میرے ہاتھ میں آیا تو امی نے اسے ایسی ڈراؤنی چیز بنا دیا کہ دھاگہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور غبارہ اڑ گیا۔ میں حسرت بھری نظروں سے دور ہی دور، اوپر ہی اوپر جاتے ہوئے غبارے کو دیکھتی رہی۔ اتنے میں امی نے دیکھ لیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ امی نے میرے منہ پہ اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ میں چکرا کر گری۔ دل پر خوف کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ امی کو ایک آنہ ضائع ہو جانے کا دکھ تھا۔ میں صحن میں اوندھے منہ پڑی، بلبلا بلبلا کر رونے لگی۔ ابا جان آئے اور مجھے اٹھا کر باہر لے گئے۔

اور ایسے بہت سے واقعات ہیں جو میرے سینے میں نقش ہیں۔ ہر نقش

ڈراؤنا اور ہریاد سخت کڑوی اور کسیلی ہے۔ بس وہ سکول کے چند گھنٹے تھے جب سکون ملتا تھا۔ آج جب زندگی کے حقائق اور چند ایک کتابوں نے مجھے عقل و دانش عطا کر دی ہے، میں اپنا تجزیہ کر سکتی ہوں۔ میری ذات میں گھر کا ماحول نفرت، حقارت اور غصّہ بھرتا جا رہا تھا اور سکول کا ماحول پیار و محبت پیدا کر رہا تھا۔ ایک انسان بیک وقت دو مختلف راہوں پر چلا جا رہا تھا۔

گھر میں لڑائی ہمیشہ امّی کی طرف سے شروع ہوتی تھی۔ ذرا ذرا سی باتوں پر جنگ شروع ہو جاتی تھی اور ہم، دو بھائی ایک بہن، اسی جنگ و جدل میں بڑے ہوتے رہے۔ میں نے تو سکول سے دل لگا لیا تھا لیکن بھائیوں نے سکول سے بھاگ کر آوارہ بچّوں سے دل لگا لیا۔ جس گھر کے بچے آوارہ ہو جائیں وہاں کا ماحول اور زیادہ مکروہ ہو جاتا ہے۔ یہی حال ہمارے گھر کا ہوا۔ چھٹی کے دن، سکول سے چھٹی کے بعد اور گرمیوں کی چھٹیاں میرے لیئے انتہائی اذیت ناک دن ہوتے تھے کیونکہ گھر رہنا پڑتا تھا۔ میں جوں جوں بڑی ہوتی جا رہی تھی، احساسات اور جذبات بھی بیدار ہوتے جا رہے تھے جس سے اذیت کے احساس میں بھی شدّت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ بچپن گذر گیا تھا، لڑکپن کی ابتدا تھی۔ اب تو گھر کے ماحول سے بھاگنے اور کہیں کوئی پُرسکون پناہ گاہ میں چھپنے کی خواہش شدّت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

ہمارے گھر میں ایک پرانا ریڈیو تھا جو اکثر خاموش رہتا تھا۔ میں نے ریڈیو سے دل بہلانا شروع کر دیا۔ ممی گانے تو میں سنتی ہی رہتی تھی لیکن شعور اور احساس کی بیداری کے ساتھ ہی مجھے عشقیہ قسم کے فلمی گانے اچھے لگنے لگے۔ میں نے فلمی گیتوں سے پوری کاپی بھر لی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس شوق نے پڑھنے کے شوق پر بُرا اثر نہ کیا۔ لیکن میرے دل و دماغ پر بہت بُرا اثر ہوا جسے میں اس وقت بہت اچھا سمجھتی تھی۔ میں نے خ[illegible]ں میں ایسے آدمی کی تصویر بنا لی جس کے لیے یہ گیت گائے جاتے ہیں۔ [illegible] نتیجہ میں تنہائی میں فلمی گیت گنگنانے لگی اور جب میں آٹھویں جماعت میں تھی تو میں نے پہلی دفعہ ایک فلم دیکھی۔ اس میں مجھے وہ آدمی نظر آ

گیا جو میرے تصوروں کے عین مطابق تھا۔ وہ فلم کا ہیرو تھا اور میں ہیروئن بن گئی۔ میں نے تصوّروں میں اپنی پسند کے خاوند کی تصویر کو اس ہیرو جیسا خوبصورت بنا لیا۔ اس طرح مجھے گھر کے اذیت ناک ماحول سے بھاگنے کے لیے ایک پناہ مل گئی، جو تھی تو میرے تصوروں میں لیکن بہت حسین تھی۔

جو اثرات میرے گھر کے ماحول کے تھے، اُن سے میں نجات حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنا رنگ دکھا رہے تھے۔ ان کے تحت میں شکی مزاج اور غصیلی ہو گئی تھی۔ کوئی ذرا سی بات خواہ مذاق میں کیوں نہ کہہ دے مجھے بُری لگتی تھی۔ غصّہ جلدی آجاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی لڑکی میری سہیلی نہیں بنتی تھی۔ بعض کو میں نے سہیلیاں بنا بھی لیا تھا۔ لیکن گھر کے اثرات نے مجھے زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ چند دنوں بعد میں کسی نہ کسی شک کی بنا پر یا معمولی سی کسی بات سے ان سے الگ ہو جاتی تھی۔

میں نویں جماعت میں تھی جب میرا بڑا بھائی بہت ہی آوارہ ہو چکا تھا۔ چار سال پہلے وہ میٹرک میں فیل ہوا تھا۔ کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا تھا۔ کبھی آتا تھا تو امّی سے لڑ جھگڑ کر پھر چلا جاتا تھا۔ اس سے چھوٹا بھائی میٹرک میں پہلی بار فیل ہوا تھا اور پھر سکول جانے لگا تھا۔ اس کی عادتوں سے پتہ چلتا تھا کہ کبھی پاس نہ ہو گا۔ اَبّا جان کو دونوں بیٹوں کا صدمہ بے حال کر رہا تھا۔ وہ دونوں کو اکثر مارا پیٹا کرتے تھے۔ آخر تھک ہار کر چپ ہو گئے تھے۔ امّی کا لڑائی جھگڑا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی چیخ و پکار گھر میں گرجتی رہتی تھی لیکن اَبّا جان اب پہلے کی طرح ڈٹ کر مقابلہ نہیں کرتے تھے۔ وہ کوئی ایسے بوڑھے تو نہیں تھے لیکن وقت سے پہلے تیزی سے بوڑھے ہوتے چلے جا رہے تھے۔

امی کے تعلقات کسی کے ساتھ اچھے نہیں تھے۔ نہ اڑوس پڑوس کے کسی گھرانے کے ساتھ نہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ۔ ہر کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا تھا۔ میں دسویں جماعت میں تھی۔ اچھا بُرا سمجھنے لگی تھی۔ امّی بھی اب دل کے دُکھڑے مجھے سنانے لگی تھی میں نے ایک روز امّی سے کہا کہ وہ اَبّا جان سے لڑا نہ کریں۔ اگر لڑنے والی کوئی بات ہو تو...

امیّ نے ابا جان کے خلاف شکایتوں کا دفتر کھول دیا۔ اس کے بعد وہ مجھے ہر روز ان کے خلاف باتیں سنانے لگی۔ اس نے جب یہ کہا کہ اس شخص نے میری زندگی تباہ کر دی ہے۔ برادری میں فلاں لڑکا مجھے بہت پسند تھا۔ اس کا گھرانہ بھی بہت اچھا تھا، تو میں سمجھ گئی کہ امیّ کی بنیادی شکایت کیا ہے۔ میں نے امیّ کی تائید شروع کر دی جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ میرے ساتھ اور زیادہ بے تکلفی سے باتیں کرنے لگی۔ اس کی دلیلیں ایسی ہوتی تھیں کہ میں اس کی ہر بات کو برحق ماننے لگی گھر کے ماحول نے مجھے تنک مزاج اور غصیلا تو پہلے ہی بنا رکھا تھا اور میرے دل میں نفرت اور حقارت بھی بچپن سے پیدا ہو چکی تھی۔ اب امیّ نے اپنی عادت کو صحیح ثابت کرنے کے لیے مجھے ایسے پیارے اور غمزدہ لب و لہجہ میں باتیں سنانی شروع کر دیں کہ میری ذات میں بچپن کے جو اثرات تھے وہ اور زیادہ پختہ ہو گئے۔ امیّ کو ساری دنیا کے خلاف شکایت تھی۔ اس کی نگاہ میں ساری دنیا ظالم اور بے وفا تھی۔ میں مانتی چلی گئی —— اور میرے اندر زہر پیدا ہوتا چلا گیا۔

چار دیواری کی دنیا میں معلوم نہیں کتنی مائیں ہر روز اپنی بیٹیوں کو ایسی ہی تعلیم دیتی ہیں اور اپنی رگوں سے زہر نچوڑ کر زبان کے راستے اپنی بیٹیوں کی رگوں میں ڈال کر مر جاتی ہیں۔ پھر یہ بیٹیاں مائیں بن کر اپنی بیٹیوں کو ناگ اور بچھو بنا جاتی ہیں۔ جانے کتنے خاوند اور کتنے باپ اس زہر سے وقت سے پہلے مارے جاتے ہیں یا کڑھ کڑھ کر زندگی کے جہنم میں عمر گزار جاتے ہیں۔ کون جانے چار دیواری کے اندر کتنے حادثے ہوتے ہیں۔ کتنے اچھے بھلے آدمی دق کے مریض بن جاتے ہیں۔ اخباروں میں آئے دن خبریں چھپتی ہیں کہ فلاں آدمی نے گھریلو جھگڑوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی اور کتنے بچے اس قسم کے گھروں سے بھاگ کر چور اچکے بن جاتے ہیں۔ آج جب میں اپنے ایک بھائی کو دیکھتی ہوں تو دل میں خنجر اتر جاتا ہے۔ اسے ڈاکٹر یا انجینئر ہونا چاہیئے تھا۔ ابّا جان نے جانے کس امید پر اسے سکول میں داخل کرایا تھا مگر وہ ایک بینک میں چپڑاسی ہے اور دوسرا پختہ کار چور اور رہزن بن گیا ہے اور اب کسی جیل میں قید ہے۔ خود میری حالت یہ ہو گئی تھی کہ میں

نے فلمی گانوں میں جا پناہ لی تھی اور تصوّروں میں فلموں کی ہیروئن بن گئی تھی۔ مجھ میں اگر کوئی اچھی عادت ہے تو صرف یہ کہ پڑھنے کا شوق تھا اور میرے دل کے کسی کونے میں پیار اور شفقت چوری چھپے پرورش پا رہا تھا۔ یہ پیار پہلی جماعت کی استانی والا تھا مگر اس پیار پر گھر کے جہنمی ماحول کے اثرات غالب تھے۔

نہ جانے میرا حشر کیا ہوتا۔ میں ایف۔ اے کے دوسرے سال میں تھی کہ ابّا جان فوت ہو گئے۔ ان کی موت کا باعث میری امیّ تھی۔ جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں کہ دو لڑکوں کی آوارگی نے ابا جان کو بوڑھا کر دیا تھا۔ اس صدمے کے ساتھ امیّ کی لڑائیاں پہلے سے زیادہ ہو گئی تھیں۔ ابّا جان اب لڑنے کی بجائے یا تو باہر نکل جاتے تھے یا کمرے میں دبک کر بیٹھ جاتے تھے۔ ایک روز امیّ معمولی سی بات پر بھڑک اٹھی اور ابّا جان کو روزمرّہ کی طرح کوسنے لگی۔ وہ ابھی ابھی دفتر سے آئے تھے۔ بہت تھکے ہوئے تھے۔ میں نے چائے بنائی۔ ابا جان کو چائے دینے گئی تو دیکھا کہ وہ کرسی پر بیٹھے تھے۔ سر ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور آگے کو جھکے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں بلایا تو وہ نہ بولے۔ میں نے پھر بلایا تو بھی سر جھکائے چپ بیٹھے رہے۔ میں نے پیالی تپائی پر رکھ کر ان کا سر اوپر اٹھایا تو دیکھا کہ ان کے آنسو بہہ رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھوں سے آنسو پونچھ ڈالے اور رندھی ہوئی آواز میں کہا ——
”بیٹی! میں تمہارے لیے تھوڑا عرصہ اور زندہ رہنا چاہتا تھا۔ تمہارے بھائی مرد ہیں۔ اپنا اپنا ٹھکانہ بنا لیں گے۔ سوچتا ہوں تمہارا کیا بنے گا“—— امیّ کی سخت تیکھی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ابا جان بولتے بولتے چپ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے بائیں کندھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا پھر ہاتھ کو دل تک سرکا کر کہنے لگے —”درد ہونے لگا ہے“— اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ان کا سر ایک طرف لڑھک گیا۔ آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔ میں نے کہا —— ”ابّا جان اٹھ کر لیٹ جایئے“—— وہ چپ رہے۔ میں نے انہیں کندھوں سے پکڑ کر اٹھانا چاہا تو ان کا سر پیچھے کو لڑھک گیا۔ میں نے

ان کے سر کو سنبھال کر کہا ـــــ "ابّا جان" ـــــ وہ نہ بولے۔ میں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ سفید ہو گیا تھا ـــــ ابّا جان امّی کے جہنم سے آزاد ہو گئے تھے۔

میں نے امّی کو بلایا۔ ہم دونوں نے ابّا جان کو ہلایا، بلایا مگر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکے تھے۔ امّی نے اس قدر زور سے چیخ ماری کہ میں لرز گئی۔ اس ایک چیخ سے محلے کی کئی عورتیں بھاگتی آئیں۔ مرد بھی جمع ہو گئے۔ ابّا جان کا ایک دوست دوڑتا گیا اور ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا کہ حرکتِ قلب بند ہو چکی ہے۔

میری حالت ہر اُس بیٹی کی طرح ہوئی جس کا باپ اچانک مر جاتا ہے وہی امّی جس نے ابّا جان کو ازدواجی زندگی کے پچیس سال ایک لمحہ بھی چین اور سکون کا گزارنے نہ دیا تھا، چیخ چیخ کر آسمان کو بھی ہلا رہی تھی۔ اس کے رونے میں بناوٹ نہیں تھی، دکھ تھا اور غم تھا۔ اس کے بین برداشت نہیں ہوتے تھے۔ میں تو پاگل ہوتے ہوتے بچی تھی۔ ایک بار جی میں یہ بھی آئی کہ سارے محلے کے لوگوں کے سامنے امّی سے کہوں کہ روتی کیوں ہو؟ تم ہی نے انہیں مارا ہے۔ تم میرے باپ کی قاتل ہو لیکن امّی اپنے بال نوچ نوچ کر بڑی بلند اور دکھ بھری آواز میں بین کر رہی تھی۔ "اب کس کے سر پر کودوں گی۔ تم ہی تھے جس پر سارا غبار نکالا کرتی تھی۔ جتنی تم نے میری سہی ہیں اتنی تو میرے باپ نے کبھی نہیں سہی تھی۔ ہائے میں بے آبرو ننگی ہو گئی لوگو! اب کس کے لئے زندہ رہوں گی۔ مجھے بھی دفن کر آؤ۔"

مرے ہوؤں کے ساتھ کبھی کوئی دفن نہیں ہوا۔ ہم ماں بیٹی رونے دھونے کے لیے زندہ رہیں۔ بڑے بھائی کو باپ کے جنازے کے ساتھ دیکھا تھا پھر وہ گھر نہ آیا۔ چھوٹے نے نوکری ڈھونڈی تو بنک میں چپڑاسی بن گیا۔ میں نے ایف اے پاس کر لیا۔ امّی کی تو دنیا ہی بدل گئی۔ جب دیکھو روتی نظر آتی تھی اور رہ رہ کر ایک ہی بات کہتی تھی کہ میرا فخر اور غرور مر گیا ہے۔

ابّا جان ریلوے کے ملازم تھے۔ ملازمت کا عرصہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ ان کے فنڈ کا پندرہ ہزار روپیہ مل گیا۔ امّی نے یہ عقل مندی کی کہ پیسہ ملتے ہی

میری شادی کا بندوبست شروع کر دیا۔ کہنے لگی کہ یتیم بیٹی کا گھر میں بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہوتا۔ رشتے کے لیے دو تین گھرانے پہلے ہی کوشش کر رہے تھے۔ ابّا جان کی وفات کے ایک سال بعد امی نے ایک گھر میں میرا رشتہ دے دیا۔ میں ہونے والے خاوند کو بالکل نہیں جانتی تھی نہ اسے کبھی دیکھا تھا۔ ابّا جان کو فوت ہوئے ایک سال گزر گیا تھا۔ وقت نے غم کی تلخی کو خاصا کم کر دیا تھا۔ میں پھر فلمی گانوں اور فلموں کی دنیا میں واپس آ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی انگریزی اور اردو کی کوئی نہ کوئی کتاب یا رسالہ پڑھتی رہتی تھی۔ جب میرا رشتہ طے ہو گیا تو مجھے یہ صدمہ ہوا کہ مجھے اپنی پسند کا خاوند تلاش کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن میں امّی سے یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکی کہ مجھے ایسا موقع دیا جائے۔

پھر میری شادی ہو گئی۔ خاوند کو دیکھتے ہی میرے تصوّرات ذہن میں ہی کچلے گئے۔ جب اس نے باتیں شروع کیں تو ان میں ذرّہ بھر رومانیت یا فلمی مکالموں والی لذّت نہیں تھی۔ مجھے آج یاد آتا ہے کہ اس کی باتیں ان حقائق سے متعلق تھیں جن کا سامنا میاں بیوی کو ازدواجی زندگی میں ہوتا ہے۔ اُس وقت مجھے یہ باتیں بہت ہی بُری لگیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دل میں بچپن سے نفرت کا جو جذبہ پرورش پا رہا تھا وہ بیدار ہو گیا اور میں نے دل ہی دل میں اس خاوند کو دھتکار دیا۔

جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، میں اپنی امّی کی طرح کی عورت بنتی جا رہی تھی۔ مجھے ساس بھی اچھی نہیں لگتی تھی اور نندیں بھی اور سسرال کی ہر چیز مجھے ناپسند تھی۔ میں جب امّی کے پاس آتی تو شکایتوں کا دفتر ساتھ لاتی تھی۔ امّی نے مجھے کبھی بھی نہیں کہا تھا کہ بیٹی! اب وہی تمہارا گھر ہے، دل لگانے کی کوشش کرو۔ بلکہ امّی مجھے الٹے سبق پڑھاتی تھی۔ وہ مجھے اپنی مثالیں دے کر ذہن نشین کراتی تھی کہ میری طرح جب تک ان لوگوں کے سر پر نہ کودو گی تو وہ تمہارا جینا حرام کیے رکھیں گے۔ چنانچہ میرے دل سے خاوند کی عزّت بھی نکل گئی۔

ازدواجی زندگی کا چھٹا مہینہ تھا کہ میرے خاوند کی تبدیلی ایک اور شہر میں ہو گئی۔ اس نے وہاں جاتے ہی کرائے کا مکان لے لیا اور ایک روز آ کر مجھے ساتھ لے گیا۔ اس میں کوئی نقص نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ میرے ذہن میں جو فلمی ہیرو چھایا ہوا تھا وہ اس سے بہت مختلف تھا اور دوسرے یہ کہ وہ خاموش طبع انسان تھا۔ جہاں تک خلوص اور پیار کا تعلق تھا، وہ مجھ پر جان چھڑکتا تھا اور میری ہر بات مان لیتا تھا۔ وہ ان مردوں کی طرح نہیں تھا جو بیویوں کو زر خرید لونڈیاں سمجھتے ہیں۔ یہ اس کی خوبی تھی لیکن میں اسے بہت بڑی کمزوری سمجھ کر کہا کرتی تھی کہ میرا خاوند بدھو ہے، جابر قسم کا مرد نہیں۔

تھوڑے دنوں بعد میں نے اس پر حکومت کرنی شروع کر دی۔ لڑائی جھگڑا کرنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں تو جنی پلی ہی لڑائی جھگڑے کے ماحول میں تھی۔ حقارت اور اذیّت کے سوا میں نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا۔ میں خاوند کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہو گئی۔ میں بالکل امّی کی طرح لڑنا چاہتی تھی لیکن میں نے جب بھی لڑنے جھگڑنے کا ارادہ کیا، کسی اندرونی طاقت نے مجھے روک دیا اور میں ناک بھوں چڑھا کر چپ ہو گئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری یہی چپ اور بے رخی میرے خاوند کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے اور یہی چپ مجھے بھی پریشان کرنے لگی۔ لڑائی کرنے کے ارادے کے باوجود میں لڑ نہیں سکتی تھی۔ اس سے میں سڑیل مزاج ہو گئی۔

ایک روز خاوند نے مجھ سے التجا کی ——— "میں دفتر سے بہت تھکا ہوا آتا ہوں۔ ذرا سی دیر کے لیے میرے ساتھ مسکرا کر دو باتیں کر لیا کرو۔ بڑی خواہش ہے کہ کبھی تمہیں مسکراتے ہوئے بھی دیکھوں" ——— میں اسی بات پر بھڑک اٹھی اور اسے دو چار جلی کٹی سنا دیں۔

اس روز کے بعد وہ زہر پک کر سامنے آ گیا جو گھر کے زہریلے ماحول نے بچپن سے میری رگوں میں ڈالنا شروع کیا تھا۔ مجھے گھر کی ہر چیز سے نفرت اور خاوند کی ہر بات سے چڑ ہو گئی۔ وہ کوئی بھی بات کہہ بیٹھے تو میں لوٹ پڑتی تھی یا جواب

دیئے بغیر دوسرے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ اس کے برعکس خاوند کی یہ عادت کہ میرے کسی طعنے اور کسی کوسنے کا جواب تک نہ دیتا تھا، آہ بھر کر خاموش رہتا تھا۔ اس سے مجھے ذرہ بھر تسکین نہیں ہوتی تھی کہ میں نے خاوند کو لتاڑ لیا ہے بلکہ کتنی ہی دیر میں خود جلتی بھنتی رہتی تھی۔ میرے لیے کوئی سکون نہ تھا۔ محلے کی لڑکیاں شروع شروع میں میرے گھر آئی تھیں مگر میری سڑیل عادت کو دیکھ کر کنارہ کش ہو گئی تھیں۔

کرتے کرتے مجھ پر خاموشی طاری ہو گئی۔ خاوند کے ساتھ بات چیت بند ہو گئی۔ میرے دل میں جو غبار تھا وہ آنسوؤں کے راستے بہنے لگا لیکن آنسو خشک ہوتے ہی غبار پھر بھر جاتا اور میں گھر کے لیے، خاوند کے لیے اور اپنی ذات کے لیے آفت بن جاتی۔

میں نے پہلے بچّے کو جنم دیا تو سسرال والوں نے شادی جیسی خوشی منائی۔ صرف میں تھی جو دل ہی دل میں ماتم کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بچہ کس قدر اذیّت دے کر پیدا ہوتا ہے اور یہ لوگ میری اذیت پر خوشیاں منا رہے ہیں۔ حالانکہ ساس اور نندوں نے دل کھول کر میری خدمت کی تھی۔ جب میں تندرست ہو گئی تو بھی وہ مجھے چارپائی سے اٹھنے نہ دیتی تھیں۔ لیکن یہ احساس میرے دل میں اب پیدا ہوا ہے۔ اُس وقت جب وہ مجھے گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھیں تو میں اپنے آپ سے کہا کرتی تھی کہ وہ نہیں چاہتیں کہ میں ان کے گھر کے کسی کام میں دخل دوں۔ دل میں شکایتیں ہی شکایتیں بھرتی چلی جا رہی تھیں۔

تین مہینے بعد مجھے خاوند اپنے ساتھ لے گیا۔ اب تو میں اسے دشمن سمجھنے لگی تھی اور وہ پہلے سے زیادہ میرے آگے بچھنے لگا تھا۔ میرے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مجھے اس کے خلاف کوئی اتنی بڑی شکایت نہیں ملتی تھی جس کی بنا پر میں ماں کے گھر جا بیٹھتی۔ بچّے کی وجہ سے میری مصروفیت بڑھ گئی تھی جسے میں نے ذہنی طور پر قبول نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری اذیّت میں

اضافہ ہوگیا۔ میں اسے بھی خاوند کا جرم قرار دے کر اس سے اور زیادہ نفرت
کرنے لگی۔ بچے کے ساتھ مجھے اتنا ہی پیار تھا کہ اسے دودھ پلا دیتی تھی۔ اس کا
باپ جب گھر آتا تھا تو کتنی ہی دیر بچے کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا لیکن میں ان کے پیار
بھرے کھیل میں کبھی شامل نہ ہوئی تھی۔

بچہ جوں جوں بڑا ہوتا جارہا تھا ایسی پیاری پیاری حرکتیں کرنے لگا تھا
جن سے میں لاتعلق نہ رہ سکی۔ میں اس کے قریب سے گزرتی تو وہ پوپلا سا منہ
کھول کر مسکرانے لگتا اور نظروں سے میرا تعاقب کرنے لگتا۔ میں دودھ پلانے
لگتی تو میرا ہاتھ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں پکڑ کر چوسنے لگتا اور ایسی بہت سی حرکتیں
تھیں جو آپ جانتے ہیں کہ ہر بچہ کرتا ہے۔ وہ آخر میرا خون اور میرے جسم کا حصہ
تھا، میں اس سے لاتعلق کس طرح رہ سکتی تھی لیکن مجھے پیار کرنا اور مسکرانا نہیں
آتا تھا۔ لیکن بچہ مجھے ایسی زنجیروں میں جکڑتا جارہا تھا جو صرف محسوس ہوتی تھیں،
دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ جب خاوند گھر میں ہوتا تھا تو میں بچے سے بظاہر لاتعلق
ہو جاتی تھی۔ منہ لبسور لیتی تھی اور چہرے پر نفرت کے آثار عادت کے مطابق از
خود آجاتے تھے۔

بچہ سات آٹھ ماہ کا ہوا تو ایک دن امی کا خط آیا۔ اس نے لکھا تھا کہ میرا
بڑا بھائی جیل میں دو سال کی سزا بھگت رہا ہے۔ وہ چوری کرتے پکڑا گیا تھا۔ یہ
بھی پتہ چلا کہ وہ عادی مجرم بن چکا ہے۔ اس کے خلاف چوری کے دو اور کیس
بھی چل رہے ہیں۔

اس خبر نے سر تا پا ہلا کے رکھ دیا۔ مجھے بچپن یاد آگیا۔ بچپن کی ایک ایک
بات یاد آنے لگی اور میں اپنے گھر کے جہنم سے نکل کر ماں باپ کے گھر کے جہنم میں
پہنچ گئی۔ ابا جان یاد آئے۔ ان کے ساتھ امی کی آخری لڑائی اور ابا جان کی اچانک
موت یاد آگئی۔ پھر دوسرا بھائی یاد آیا جو بنک میں چپڑاسی ہے اور جب یہ خیال
آیا کہ بڑا تو عادی مجرم بن چکا ہے اور اب اس کی عمر جرم اور جیل کے چکر میں گزرے

گی تو میں نے اس طرح گھٹن محسوس کی جیسے کسی نے میری گردن میں پھانسی کا رسّہ
ڈال دیا ہو۔

میں نے خط پڑھا۔ دوبارہ پڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ غیرارادی طور پر میں سنگار
میز کے سامنے جا بیٹھی۔ میں سخت اداس تھی۔ ایسے وقت مجھے کسی ساتھی کی ضرورت تھی
جسے میں حالِ دل سناتی اور خوب روتی۔ میرا خاوند گھر آچکا تھا لیکن اسے میں نے کبھی بھی
اپنا غمخوار نہیں سمجھا تھا۔ خط گھر کے پتے پر اور میرے نام آیا تھا جو میں نے اسے نہیں دکھایا
تھا۔ خاوند برآمدے میں چارپائی پر لیٹ گیا تھا اور بچہ اس کے پیٹ پر لیٹا اس کے ساتھ
کھیل رہا تھا۔ بچہ بہت ہی خوش تھا۔ میں نے باپ بیٹے کو دیکھا۔ دونوں ہنس کھیل رہے
تھے۔ میں نے سوچا کہ دونوں خوش قسمت ہیں جنہیں ہنسنا آتا ہے۔

میں نے غیرارادی طور پر سنگار میز کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اپنا چہرہ تو میں
ہر روز دیکھا کرتی تھی مگر اس روز مجھے اپنا چہرہ کسی اور ہی روپ میں دکھائی دیا۔ میں
نے اپنے چہرے پر امی کے اُس وقت کے نمایاں آثار دیکھے جب وہ ابا جان سے
لڑا کرتی تھی۔ کرتے کرتے یہ چہرہ امی کا چہرہ بن گیا پھر اس کے خدوخال بدلنے لگے
اور میرے چہرے نے میری پہلی جماعت کی استانی کی شکل اختیار کر لی۔ آپ شاید
میری بات پر یقین نہ کریں۔ ہو سکتا ہے یہ محض واہمہ ہو کیونکہ میری اس وقت ذہنی
حالت بہت ہی بُری تھی۔ میرا ضمیر مجرم تھا۔ دل پر منوں بوجھ تھا۔ شاید یہ اسی کا اثر
ہو۔ لیکن میں نے جو دیکھا، وہ بیان کر رہی ہوں۔ میں استانی کے چہرے کو دیکھتی
رہی اور میری ذات میں پُرسکون سی تبدیلی آنے لگی۔

برآمدے سے میرے بچے کی چیخ سنائی دی تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
وہ باپ کے پیٹ پر لیٹا اس کے کان پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب باپ کا ایک کان
اس کے ہاتھ میں آگیا تو اس نے خوشی سے چیخ ماری تھی۔ بچے کے نیچے کے دو دانت
نکل آئے تھے۔ انہیں وہ اکثر میری انگلی یا گال پر کاٹ دیا کرتا تھا۔ جب میں درد سے
"سی" کرتی تھی تو وہ بہت ہنستا تھا۔ میں بچے کو دیکھتی رہی۔ اس نے باپ کے سینے

پر منہ رکھ کر دانت گاڑ دیئے تو باپ نے ہنس کر کہا — "ارے، یہاں درد ہوتا ہے۔"
میرے خاوند نے اس کا سر اٹھا کر ہاتھ دل پر رکھ لیا۔

میں نے جب خاوند کو دل پر ہاتھ رکھ کر یہ کہتے سنا کہ یہاں درد ہوتا ہے تو خدا کی قسم میرے دل کو شدید دھکا لگا اور مجھے ابا جان یاد آ گئے جب انہوں نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا — "درد ہوتا ہے" — اور وہ فوت ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ماں کے بین یاد آ گئے۔ میرا سراپا لرزنے لگا۔ کیا میں بھی امی کی طرح اپنے بچے کے باپ کو قتل کر رہی ہوں؟ — یہ احساس تیر کی طرح دل سے پار ہو گیا۔ میرا سر خود ہی آئینے کی طرف گھوم گیا اور مجھے اپنا چہرہ نظر آیا۔ مگر اب کے یہ چہرہ میری امی کا تھا۔ انتہائی پُرنفرت چہرہ، اُس وقت کا چہرہ جب وہ اباجان پر آخری بار چیخی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے دونوں بھائی یاد آ گئے۔ وہ بھی امی کی اسی چیخ و پکار کا شکار ہو گئے تھے۔ ایک جیل میں تھا، دوسرا بنک میں چپڑاسی۔

اور اُس وقت مجھے اچانک خیال آ گیا کہ میں نے بھی گھر کو جہنم بنا رکھا ہے اور میں نے بھی گھر میں چین و سکون نہیں رہنے دیا۔ اب جو میں نے اپنے بچے کی طرف دیکھا تو مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرے اس پھول جیسے بچے کو پولیس ہتھکڑیوں میں جکڑ کر جیل خانے میں لے جا رہی ہو، میرے ہونٹ کانپے، میرے ہاتھ بھی کانپے اور جب یہ خیال آیا کہ بڑے ہو کر بچے کو جب گھر سے پیار نہیں ملے گا تو وہ میرے بڑے بھائی کی طرح گھر سے بھاگ جائے گا۔ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائے گا۔

میں اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکی۔ میں پاگلوں کی طرح اٹھی اور اس طرح بچے کو جھپٹ کر اسے اٹھا کے سینے سے لگا لیا جس طرح چیل مرغی کے بچے کو اُٹھا لیتی ہے۔ میرا خاوند ہکا بکا مجھے دیکھنے لگا۔ وہ نہایت آہستہ آہستہ اٹھا اور میں بچے کو سینے سے لگائے کمرے میں آ گئی۔ اچانک ضبط کے بند ٹوٹ گئے اور میں ہچکیاں لے لے کے رونے لگی۔ خاوند مجھ سے شاید گھبرا گیا تھا۔ میرے سامنے کھڑا مجھے دیکھتا رہا اور میں بے اختیار روتی رہی۔ آخر خاوند نے التجا کے لہجے میں کہا — "کیا بات ہے؟ — کیا بچے پر

بھی میرا حق نہیں رہا؟ اس بے دردی سے اٹھا لائی ہو؟" — میں نے بچہ اس کی طرف بڑھایا اور چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔

خاوند نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بڑے پیار سے پوچھا "کچھ بتاؤ تو سہی" — میں روئے چلی جا رہی تھی اور وہ مجھ سے رونے کی وجہ پوچھ رہا تھا۔ میں نے اپنے بالوں میں اس کی انگلیوں کو رینگتا ہوا محسوس کیا تو مجھے سکون محسوس ہونے لگا جیسے ان مردانہ انگلیوں نے مجھے اس آگ سے نکال لیا ہو جو میں نے اپنے اندر خود ہی جلا رکھی تھی یا میری امی نے جلائی تھی۔ میرا سر لڑھک کر خاوند کے سینے پر جا پڑا۔ میں بے بس تھی۔ غموں میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ مل گیا تو میں نے اپنا آپ اس کے سپرد کر دیا۔

خاوند گھبرا اٹھا اور پھر رونے کی وجہ پوچھنے لگا۔ جب میں نے رونے کے سوا کوئی اور جواب نہ دیا تو اس نے جھنجھلا کر کہا — "تم چاہتی ہو کہ میں تمہاری نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔ میں تو اب اس بچے کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں ورنہ میں تو اس دنیا کی ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتا" — وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے یوں لگا، جیسے یہ سہارا چھن جانے سے میں ڈوب جاؤں گی۔ میں نے اس کی کلائی تھام کر کہا —

"نہیں، ایسا نہیں، تم میرے لیے زندہ رہو" — وہ پھر میرے پاس بیٹھ گیا۔ بچہ بھی رونے لگا تھا۔ بچہ تو رویا ہی کرتا تھا۔ میں نے کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔ لیکن اس روز بچہ رویا تو میں نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ مجھے اپنے اور اپنے بھائیوں کے بچپن کا رونا یاد آ گیا۔ ہم رویا کرتے تھے تو ہمیں کوئی چپ نہیں کرایا کرتا تھا بلکہ ہمیں ایک دو تھپڑ مار کر اور زیادہ رُلایا جاتا تھا۔

میں نے خاوند کو رونے کی وجہ یہی بتائی کہ دل بہت اداس ہو گیا تھا۔ بس رونے کو جی چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو چند دنوں کے لیے اپنی امی کے پاس چلی جاؤ۔ میں نے بے اختیار کہا — "اب امی کے پاس نہیں جاؤں گی" — وہ حیرت زدہ سا ہو گیا۔ میں نے اور کچھ نہ کہا۔ میں یہ بھی سوچ رہی

تھی کہ اگر مجھے اپنے تصوّروں جیسا خوبصورت خاوند نہیں ملا تو اس میں میرے اس خاوند کا کیا قصور ہے ؟ وہ مجھے اغوا کر کے تو نہیں لایا۔ ہو سکتا ہے کہ میں اس کی پسند کی بیوی نہ ہوں ، پھر بھی وہ مجھ پر فدا ہوا جا رہا ہے۔ اس سوچ نے مجھے بہت سہارا دیا۔

میرے اندر انقلاب تو بپا ہو گیا تھا مگر بچپن اور گھر کے ماحول کے جو زہریلے اثرات میری فطرت کا جزو بن چکے تھے، ان سے آزادی ممکن نظر نہیں آتی تھی۔ میں خاوند کی یہ خواہش پوری کرنا چاہتی تھی کہ وہ جب دفتر سے آئے تو میں مسکراہٹ سے اس کا استقبال کروں لیکن کوشش کے باوجود میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں آتی تھی بلکہ غصہ آجاتا تھا۔ میں جب غصے پر قابو پانے میں ناکام رہتی تھی تو مجھے غصے پر غصہ آجاتا تھا۔ یہ کیفیت بہت اذیت ناک تھی۔

میں کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ کرتی رہتی تھی۔ مجھے انگریزی کے ایک رسالے میں اپنے جیسی ایک عورت کا خط نظر آیا۔ خط پڑھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ کیونکہ اس نے بڑی مضحکہ خیز بات لکھی تھی لیکن مجھے اس نے نجات کا ایک راستہ دکھا دیا۔ میں نے اسی وقت اس پر عمل شروع کر دیا۔ عمل یہ تھا کہ میں آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور اپنے آپ کو یقین دلایا کہ آئینے میں جو عورت کھڑی ہے، وہ سٹریل اور بدمزاج عورت ہے۔ میں عکس کو دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی حتیٰ کہ مجھے اپنے عکس سے نفرت ہونے لگی۔ میں نے اسے کوسنا شروع کر دیا۔ میں اکیلی تھی، کوئی سننے والا نہیں تھا۔ میں نے بلند آواز سے کہنا شروع کر دیا ــــ "تم ڈائن ہو، اپنے بچے کو ڈاکو بنا رہی ہو۔ خاوند تم سے اتنا پیار کرتا ہے اور تم نے اس بے چارے کا جینا حرام کر رکھا ہے" ــــ اور اس طرح میں نے خاصا وقت صرف کر کے تمام تر غصہ اپنے عکس پر نکال دیا۔ میں نے اپنے آپ میں ایسا سکون محسوس کیا جیسے بہت عرصے بعد بخار اتر گیا ہو۔

اچانک بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ سویا ہوا تھا۔ میں دوڑتی گئی اور بچے کو گود میں لے کر اسے دودھ پلانے لگی۔ وہ دودھ پی رہا تھا تو میں اس کے ننھے ننھے

ہاتھوں سے کھیلنے لگی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا ــــ "یہ پھول جیسے ہاتھ کسی چور کے ہاتھ نہیں ہو سکتے ــــ" میں نے بے تابی سے اس کے ہاتھوں کو چوم لیا۔ اتنے میں صحن میں قدموں کی آواز سنائی دی۔ بچہ اپنے باپ کے قدموں کی آواز کو خوب پہچانتا تھا۔ اس نے دودھ چھوڑ دیا اور گود میں مچل کر کہنے لگا ــــ "اُو ... با ... با ... اُو" باپ کو دیکھ کر وہ کھل کر ہنسا۔ اس کے ساتھ ہی میری بھی ہنسی نکل گئی ــــ یہ میری پہلی قدرتی ہنسی تھی ــــ تھوڑی دیر بعد بچہ باپ کی گود میں بیٹھا تھا اور اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر ہم دونوں کے ہاتھ میرے خاوند کے ہاتھ میں آگئے۔

اس روز کے بعد میں نے اس طریقے کو جاری رکھا کہ جب مزاج میں سٹریل پن یا غصہ آنے لگتا تو میں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر سارا غصہ اپنے عکس پر نکال دیتی۔ میں عکس کو گالیاں دے دے کر کہتی ــــ "تم اپنے خاوند کو قتل کرنا چاہتی ہو، اپنے بچے کو ڈاکو بنانا چاہتی ہو" ــــ یہ طریقہ کامیاب تھا لیکن آپ اسے آسان نہ سمجھیں۔ اپنے خلاف یا اپنی فطرت میں رچی بسی ہوئی بدی کے خلاف جدوجہد ایک جاں لیوا مہم ہے لیکن ناممکن بھی نہیں۔ میری جدوجہد کی کامیابی میں عبادت اور دعا کا جو دخل ہے میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ ایک روز میں نے علی الصبح اٹھ کر نماز پڑھی۔ یقین جانیے کہ میں نے خدا سے دولت نہیں مانگی۔ صرف یہ التجا کی کہ یا خدا، مجھے اپنی فطرت کی تاریکیوں سے نکلنے کی ہمت اور ہدایت عطا فرما۔ چونکہ یہ دعا میری بھٹکی ہوئی روح کی گہرائیوں سے نکلی تھی، اس لیے سنی گئی اور مجھے اپنے آپ میں انوکھی سی قوت کا احساس ہوا۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں نے عبادت اور دعا کے متعلق بہت کچھ پڑھا تھا مگر کبھی دھیان نہ دیا تھا۔ اب میں اپنے تجربے کی بنا پر کہتی ہوں کہ نماز رکوع اور سجدوں کا نام نہیں۔ اگر روح بھی آپ کا ساتھ دے رہی ہو تو خدا بھی آپ کا ساتھ دے گا۔

خدا نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے تاریکیوں سے نکال لیا ہے۔ ایک سال گزر گیا ہے۔ اب مجھے آئینے میں اس پُر نفرت عورت کے عکس کو کوسنے کی ضرورت

محسوس نہیں ہوتی کیونکہ وہ اب میری پہلی جماعت کی استانی کا عکس بن گیا ہے۔ پیار اور شفقت کا بہت خوبصورت عکس!

یہ ایک راز تھا

شجاع الدین

لاش کی طرح اکڑی ہوئی لڑکی نے ہولناک چیخ ماری اور اس طرح چارپائی سے فرش پر آ پڑی جیسے نظر نہ آنے والے تین چار انسانوں نے اسے اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا ہو۔ لڑکی کے بال جو بہت ہی دلکش ہوا کرتے تھے گرد آلود رسیاں بن گئے تھے۔ تین دنوں اور تین راتوں سے اس کی یہ حالت تھی کہ ہاتھ مڑ جاتے تھے، آنکھیں اُبل کر باہر آجاتی تھیں، جسم اکڑ جاتا تھا اور وہ دانت باہر کو نکال کر چیخیں مارتی تھی۔ کوئی اسے پکڑے تو اس کا منہ نوچ لیتی تھی، منہ یا پیٹ میں ایسا گھونسہ مارتی تھی کہ انسان اوندھے منہ گرتا تھا، چارپائی سے فرش پر جا پڑتی تھی۔ فرش کچا تھا۔ وہ فرش کی مٹی بالوں میں ڈالتی اور اپنے بال نوچتی تھی۔ دن رات میں کئی بار یہی ایک بات دہراتی تھی۔ "میں اس کے خاوند کا کلیجہ منہ کے راستے باہر نکالوں گا"۔۔۔ یہ اس جن کی آواز تھی جس نے اس لڑکی پر قبضہ کر رکھا تھا اور لڑکی کا خاوند گھر سے بھاگ گیا تھا۔

میں نے جب اس لڑکی کو دیکھا تو فوراً مان گیا کہ اس پر جن کا قبضہ ہے اور یہ چڑیل بن چکی ہے۔ وہ دیہاتن تھی اور میں شہری نوجوان۔ اس کے سیاہی مائل بھورے بالوں اور مستانی سی آنکھوں نے مجھ پر جادو کر ڈالا تھا۔ بڑی حسین لڑکی تھی۔ اس کی معصومیت، سادگی اور خوش خلقی اس کے حسن کو دوبالا کیا کرتی تھی۔ میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تھا تو میں نے بے اختیار ہو کر اسے کہہ دیا تھا۔۔۔ "تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو"۔

میں اسے بار بار کہنا چاہتا تھا کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو لیکن میرے اور اس کے درمیان ایک دیوار حائل تھی ۔۔۔ وہ ہمارے مزارعوں کی بہو بیٹی تھی۔ زمینداروں

اور جاگیرداروں کی بادشاہی کی روایت تو یہی ہے کہ مزارعوں کی بہو بیٹیوں کے مالک زمیندار اور جاگیردار ہوتے ہیں۔ جب چاہیں انہیں گھر بلا کر ہوس کی تسکین کر لیں لیکن ہمارے والد صاحب مرحوم مزارعوں کو اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے کسی مزارعے کی بیٹی جوان ہو جائے یا کسی مزارعے کے گھر نئی نویلی دلہن آ جائے، اسے والد صاحب کھیتوں میں نہیں جانے دیتے تھے۔ مرحوم رحم دل انسان تھے مگر ایک بار میں نے انہیں قصاب کے روپ میں بھی دیکھا۔

قصہ یوں ہوا کہ ایک نوجوان مزارعہ نے ایک مزارعہ کی بیٹی پر دست درازی کی والد صاحب کو رپورٹ ملی۔ انہوں نے لڑکی سے پوچھا۔ پھر اس مزارعہ سے پوچھا تو اس کا جرم ثابت ہو گیا۔ والد صاحب نے تمام مزارعوں کو اکٹھا کیا اور مجرم کی ٹانگیں ٹخنوں سے بندھوا کر اسے درخت کے ساتھ الٹا لٹکا دیا۔ بید کی چھڑی لی اور مجرم کی پیٹھ پر ایسی بے رحمی سے بید مارے کہ اس کا خون پھوٹ آیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے پرہیزگار اور زاہد والد صاحب جلاد بن گئے تھے۔ ان کے منہ سے جھاگ پھوٹ آئی تھی۔ جب مجرم بے ہوش ہو گیا تو انہوں نے غضب ناک آواز میں کہا "مزارعوں کی بیٹیاں میری بیٹیاں ہیں۔ میری بیٹیوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کون کر سکتا ہے"۔۔۔۔ اور وہ گھر چلے گئے۔

میں جب گھر گیا تو دیکھا کہ والد صاحب کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ہم مشرقی پنجاب (ہندوستان) کے ایک بڑے قصبے میں رہتے تھے۔ ہماری اراضی قصبے سے ڈیڑھ ایک میل دور تھی۔ وہیں چند ایک کچے پکے مکان تھے جن میں ہمارے مزارعے رہتے تھے۔ والد صاحب نے میرے بڑے بھائی کو قصبے کے ہسپتال کے ایک کمپاونڈر کو بلانے کے لیے بھیج دیا تھا۔ کمپاؤنڈر بہت دیر بعد مرہم پٹی وغیرہ لے کے آ گیا۔ یہ ہماری برادری کا ایک لڑکا تھا۔ والد صاحب نے مجھے کہا کہ میں اسے اس مزارعے کے گھر لے جاؤں اور اس کی مرہم پٹی کراؤں۔ انہوں نے کمپاؤنڈر سے کہا کہ وہ ہر روز اس کی مرہم پٹی وغیرہ کر کے پیسے ہم سے لے جایا کرے۔ اس

کمپاؤنڈر نے آٹھ دس دنوں میں مزارعے کے زخم ٹھیک کر دیے۔

ہماری اراضی بے شمار تھی جس میں زیادہ تر دادا جان کی وہ انعامی جاگیر تھی جو انہیں انگریز بادشاہ نے کسی زمانے میں عطا کی تھی۔ باقی خریدی ہوئی تھی۔ اتنی زیادہ جاگیر اور اتنے سارے مزارعے اور ان کی نوجوان بہو بیٹیاں جاگیرداروں اور ان کے بیٹوں کا دین و ایمان ٹھکانے نہیں رہنے دیا کرتیں۔ انسان دولت اور ہوس کا غلام بن جاتا ہے لیکن دادا جان نے جو روایت قائم کی تھی، اسے والد صاحب نے زندہ رکھا اور جب ہم جوان ہوئے تو والد صاحب نے ان الفاظ میں یہ روایت ہمارے خون میں شامل کر دی ۔۔۔۔ "رزق خدا دیتا ہے۔ تم بتاؤ کہ کیا تم دونوں بھائی اور میں مل کر اتنی ساری زمین سے اتنا اناج اگا سکتے ہیں جو یہ مزارعے اگا رہے ہیں؟ ان غریبوں کو خدا نے ہمیں رزق دینے کا سبب بنایا ہے۔ یہ لوگ دھوپ میں جل جل کر اور سردی میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر ہمارے لیے اناج اگاتے ہیں۔ یہ خدا کے نیک بندے ہیں۔ انہیں ناراض کرو گے تو خدا کو ناراض کرو گے۔ خدا سے ڈرو اور اس کی ذاتِ باری نے ہمارے رزق کا جو سبب پیدا کیا ہے اس کی عزت کرو"۔

میں نے دل و جان سے تسلیم کر لیا تھا کہ مزارعوں کی عزت ہماری اپنی عزت ہے لیکن یہ لڑکی میرے دل میں اتر گئی تھی۔ اس سے پہلے میں کبھی کبھار کھیتوں میں جاتا تھا۔ جانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔ یہ لڑکی آئی تو میں ہر روز کھیتوں میں جانے لگا۔ یہ مزارعوں کا ایک نیا کنبہ تھا۔ ایک ہی مہینہ پہلے ایک مفلوک الحال ادھیڑ عمر آدمی والد صاحب کے پاس آیا اور ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ وہ ایک آدمی کا مزارعہ ہے جو بدکردار ہے۔ اس مزارعہ کا ایک ہی بیٹا تھا جس کی اس نے تھوڑا ہی عرصہ گزرا شادی کی تھی۔ زمیندار نے اس کی بہو کو گھر بلانا شروع کر دیا۔ بہو غیرت والی تھی۔ زمیندار کے جال سے بچ کے نکل آئی۔ زمیندار سارے کنبے کو پریشان کرنے لگا۔ کسی نے اس ادھیڑ عمر مزارعہ کو میرے والد صاحب کے پاس آنے کا مشورہ دیا تو وہ آ گیا۔ والد صاحب نے اس کی بات سن کر کہہ دیا کہ اپنے سارے

کنبے اور مال مویشی کو لے آؤ۔

اس طرح اس لڑکی کا کنبہ ہماری اراضی میں اور یہ لڑکی میرے دل میں داخل ہوگئی۔ ان کے کنبے میں ایک تو یہ آدمی تھا جو میرے والد صاحب کے پاس آیا تھا، اس کی بیوی تھی۔ ان کا ایک جواں سال بیٹا اور اس بیٹے کی یہ بیوی جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔

جہاں ہمارے مزارعے رہتے تھے وہ قصبے کی ایک مضافاتی بستی بن گئی تھی۔ وہاں مزدور پیشہ اور مزارعہ قسم کے لوگ رہتے تھے اور اس بستی میں ایک شاہ جی بھی رہتے تھے جو اس بستی کی چھوٹی سی مسجد کے پیش امام تھے اور ان کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے قبضے میں جن ہیں اور جن نکالتے بھی ہیں۔ بعض اوقات وہ آدھی رات کے وقت اپنے مکان کی چھت پر بیٹھ کر زور زور سے چھت پر ہاتھ مارتے اور یا علیؓ کے نعرے لگایا کرتے تھے یا دھما کا نما آواز میں حق اللہ ہُو اور الا اللہ ہُو کا ورد کرتے تھے۔ ان کی آواز کے یہ دھماکے بستی والوں کو ڈرا دیا کرتے تھے۔ دن کے وقت وہ عجیب سے لب و لہجے میں بستی کے لوگوں کو رات کے قصے سنایا کرتے تھے۔ ان قصّوں میں صرف جنّوں کا ذکر ہوتا تھا۔ وہ اَن پڑھ اور پسماندہ لوگ ہی نہیں، ہم بھی شاہ جی کے قائل ہوگئے تھے۔ دور دور سے ان کے پاس آسیب زدہ مریض لائے جاتے تھے۔

اب یہی لڑکی جس کا بھولا بھالا حُسن میرے دل و دماغ پر قابض ہوگیا تھا، ایک جن کے قبضے میں تھی۔ اس کا دلکش چہرہ اس قدر ڈراؤنا ہوگیا تھا کہ میں نے اسے ایک نظر دیکھا اور وہاں سے بھاگ آیا۔

شاہ جی اس کے پاس بیٹھے دبدبے سے کہہ رہے تھے کہ میں اس مردود کو جلا کر دم لوں گا۔ اس وجہ سے شاہ جی مجھے بہت اچھے لگ رہے تھے

میں شام کے بعد شاہ جی کو مسجد میں ملا اور ان سے پوچھا کہ وہ کب تک لڑکی کو جن سے آزاد کرا سکیں گے؟ میں نے انہیں منہ مانگا انعام دینے کا وعدہ کیا، تو شاہ جی نے مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ـــــ "انسانوں کی طرح بعض جن

بھی عادی مجرم ہوتے ہیں۔ وہ سلیمانؑ کی قسم کھا کر بھی قسم توڑ دیتے ہیں۔ اس لڑکی والا جن اسی نسل کا ہے۔ یہ نسل بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ اس نے فلاں گاؤں کی ایک لڑکی پر قبضہ کر لیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے لڑکی کو چھڑایا۔ یہ جن بہت دن میری قید میں رہا اور سلیمانؑ کی قسمیں کھاتا رہا۔ میں نے ایک رات ایک اور جن پکڑ لیا اور اسے چھوڑ دیا۔ اس نے آزاد ہوتے ہی اس لڑکی پر قبضہ کر لیا ہے۔ اتنا چالاک ہے کہ قابو میں نہیں آرہا۔ اس نے اس شرط پر لڑکی کو چھوڑنے کا وعدہ کیا ہے کہ اسے اس کا خاوند طلاق دے دے۔ اگر خاوند نے اسے طلاق نہ دی، تو یہ جن لڑکی کو تو شاید بخش دے اس کے خاوند کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

جن کی یہ شرط کہ یہ خاوند اس لڑکی کو طلاق دے دے، مجھے بہت اچھی لگی۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ یہ لڑکی مجھے بہت اچھی لگتی تھی بلکہ یہ خاوند اس لڑکی کے قابل نہیں تھا۔ وہ کوئی بدصورت نہیں تھا۔ وہ چرس کا نشئی تھا۔ چرس نے اس کا جسم دُبلا پتلا اور چہرہ مہرہ زرد کر رکھا تھا۔ شادی سے کئی سال پہلے یعنی لڑکپن میں اس نے قصبے کے قبرستان کے تکیے پر چرس کا پہلا کش لگایا تھا۔ لڑکا آوارہ ہو کر جواریوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا تھا۔ وہیں سے اسے چرس کی لت پڑی تھی۔ وہ جوان ہوا تو چرس کا پکّا نشئی بن چکا تھا۔ اب اس کی یہ حالت تھی کہ چہرے کی مُردنی سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ نہیں۔ زرد پیلی آنکھیں کھوپڑی کے اندر چلی گئی تھیں۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا اور کندھے سکڑ کر آگے کو جھک گئے تھے۔

اس کے مقابلے میں لڑکی صرف خوبصورت ہی نہیں تھی بلکہ اس کی صحت نہایت اچھی تھی۔ وہ انہی سیدھی سادی دیہاتی لڑکیوں میں سے ایک بے زبان لڑکی تھی جنہیں ماں باپ اٹھا کر جلتے تنور میں پھینک دیں تو وہ اُف نہیں کیا کرتیں۔ یہ لڑکی اپنے خاوند کی خالہ کی بیٹی تھی۔ خاوند اور لڑکی کے ماں باپ نے مل جل کر یہ احمقانہ فیصلہ کیا تھا کہ لڑکے کی شادی کر دی جائے تاکہ پابند ہو کر بُری عادتوں سے باز آجائے۔

انہیں معلوم نہیں تھا کہ چرس کی سالوں پرانی عادت اتنی جلدی ترک نہیں کی جاسکتی۔ انہوں نے مل جل کر ایک معصوم اور خوبصورت لڑکی کو ایک ایسے آدمی کے حوالے کر دیا جس کے جسم میں خون کی جگہ چرس کا دھواں بھرا ہوا تھا۔

جب شادی ہوئی تو یہ لڑکی اپنے ماں باپ کے ساتھ کسی اور گاؤں میں تھی۔ اس کے خاوند کے ہاں باپ کسی اور جگہ کسی کے مزارعے تھے۔ وہاں سے یہ لوگ ہمارے ہاں آ گئے۔ شادی کا پانچواں مہینہ تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا، وہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ جب وہ مجھے تنہا ملی تو میں نے اسے بلا جھجک کہہ دیا کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ اس کے بعد اسے تنہائی میں ملنے کے موقعے تلاش کرنے لگا جو مجھے مل ہی جایا کرتے تھے۔ میں نے جب اس کے خاوند کو دیکھا تو مجھے لڑکی پر بہت ترس آیا۔ وہ گھر سے زیادہ دیر باہر ہی رہتا تھا۔ باپ کا ہاتھ بھی نہیں بٹاتا تھا۔ اس کی ماں اپنے خاوند کے ساتھ کھیتوں میں چلی جایا کرتی تھی۔ لڑکی گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ میں کسی نہ کسی بہانے اس کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ میں شاید دادا جان اور والد صاحب کی قائم کی ہوئی پاکیزہ روایت کو توڑ دیتا لیکن میں نے پہلے روز ہی جان لیا کہ لڑکی سیدھی سادی اور نیک ہے۔ میں نے جب اس کے ساتھ بے تکلفی سے بات کی تو اس نے نہایت احترام سے کہا ـــ "آپ دھن دولت والے ہیں۔ ہم نوکر چاکر آپ کی برابری نہیں کر سکتے۔ آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں"۔ اس کے کہنے کا انداز ایسا تھا کہ میں اپنے آپ میں آگیا اور میں نے یہ ضرورت بھی محسوس کی کہ اس کے دل سے یہ وہم نکال دوں کہ میں اپنے آپ کو اس کا آقا سمجھ کر کسی اور خیال سے اس کے پاس آیا ہوں۔

میں نے سنجیدگی سے کہا ـــ "میں آقا نہیں ہوں جس کی بدنیتی سے بھاگ کر تم لوگ یہاں آئے ہو۔ کہو تو میں کبھی بھی تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔ بات صرف یہ ہے کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو صرف باتیں کرنے آیا ہوں"۔ ـــ وہ میری سنجیدگی کو سمجھ گئی اور مجھے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا ـــ "میں تمہارے جسم کو کبھی ہاتھ نہیں لگاؤں۔ لیکن مجھے یہ بات کہنے سے کبھی نہ روکنا کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو"۔ ـــ وہ مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں

میں آنسو آ گئے۔ میں نے وجہ پوچھی تو وہ آنسو پونچھ کر کہنے لگی ـــ "میری قسمت میں شاید یہی کچھ لکھا ہے کہ اپنی عزت غیروں کے ہاتھوں برباد کراؤں۔ جہاں سے ہم بھاگ کر آئے ہیں وہاں بھی اس آدمی نے مجھے ایسی ہی باتیں کہی تھیں"۔ اس نے آہ بھر کر کہا ـــ "خدا کسی کو اتنا غریب بھی نہ کرے کہ پیٹ کی خاطر عزت آبرو بھی بیچنی پڑے"۔

اس کی یہ بات میرے دل میں زہریلے تیر کی طرح اتر گئی۔ میرا سارا جسم کانپ اٹھا۔ میں نے اسے بہت سی باتیں کہہ کر یقین دلا دیا کہ اس کی عزت میری اپنی عزت ہے اور کبھی بھول کر بھی اسے بدنیتی سے نہیں دیکھوں گا۔ اسے یقین آ گیا اور میں تقریباً ہر روز اسے تنہائی میں ملنے لگا۔ اگر وہ معصوم اور سیدھی سادی نہ ہوتی تو شاید مجھے اتنی اچھی نہ لگتی۔ پہلے دو تین دن وہ کھل کر بات بھی نہیں کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ میرے ساتھ کھل گئی۔ ایک روز میں نے اسے دو روپے دیئے تو اس نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ ـــ "پیسہ بہت بُری چیز ہے اگر ہمارے درمیان پیسہ آ گیا تو محبت ختم ہو جائے گی۔ پیسہ محبّت کو ناپاک کر دیتا ہے"۔

میں زیادہ دیر اس کے معصوم سے حُسن میں جذب رہتا تھا اور اس کے ناک نقشے کی تعریفیں کرتا رہتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ میں اس سے آگے نہیں بڑھوں گا۔ اپنی تعریفیں سن کر اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ یہ کیفیت نشے کی طرح تھی۔ میں اُس وقت نوجوان تھا۔ عقل کی کمی تھی۔ میں نے کبھی بھی محسوس نہیں کیا تھا کہ میں اس پر جو نشہ طاری کر رہا ہوں اس میں سے ایک ایسا طوفان اٹھے گا جو انسان کے پرخچے اڑا دیتا ہے۔ میں اسی بات پہ خوش تھا کہ میری محبت پاک ہے اور میرا ضمیر مجرم نہیں۔

چند دنوں بعد یہ تبدیلی آئی کہ ہم تنہائی میں بیٹھتے تو میں کوئی اِدھر اُدھر کی بات شروع کر دیتا۔ میں نے دیکھا کہ لڑکی اس بات کا رُخ موڑ کر اپنی طرف لے آتی اور مجھے مجبور کر دیتی کہ میں اس کی آنکھوں یا بالوں یا اس کے چہرے مہرے

کی تعریفیں کروں۔ وہ ایسی باتوں میں لذّت لینے لگی تھی۔ وہ اب میرے ساتھ دل کی ہر بات اس طرح کر ڈالتی تھی جیسے میں اس کی ہمراز سہیلی ہوں اور یہ بھی حقیقت کہ ہم عمر ہونے کی وجہ سے ہم بچّوں کی طرح ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔ ہم بھول گئے تھے کہ ہم جوان ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بچّوں کی طرح باتیں کرتے اور ہنستے کھیلتے تھے۔

ایک روز مجھے والد صاحب نے ایک کام سے لدھیانہ بھیج دیا۔ وہاں مجھے آٹھ نو روز لگ گئے۔ واپس آیا تو پہلی خبر یہ سنی کہ لڑکی پر جِن کا قبضہ ہوگیا ہے اور جِنّ اتنا سخت ہے کہ لڑکی کو جان سے مار کر ہی نکلے گا۔ میں اس کے گھر پہنچا۔ لڑکی کو تو میں پہچان نہ سکا۔ اس کے سر اور منہ پر مٹی پڑی ہوئی تھی۔ وہ دلنشیں آنکھیں جنہوں نے مجھ پر جادو کر رکھا تھا، لال سرخ ہو کر اتنی ڈراؤنی ہوگئی تھیں کہ جب اس نے میری طرف دیکھا تو میں سرک کر ایک طرف ہوگیا۔ گرد آلود چہرہ کسی چڑیل کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ بکھرے ہوئے بال رسیّوں کی طرح ہو گئے تھے۔ وہ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی اس نے مجھے اس طرح دیکھا کہ آنکھوں کے ڈھیلے جیسے باہر نکل آئیں گے۔ اس نے بازو لمبا کر کے میری طرف بڑھایا۔ اس کی انگلیاں شیر کے پنجے کی طرح اندر کو مڑی ہوئی تھیں۔ اس نے دانت پیس کر کہا —— "تم اس لڑکی کو بہت اچھی طرح جانتے ہو۔ اسے خاوند سے طلاق لے دو نہیں تو میں اس کے خاوند کا کلیجہ منہ کے راستے باہر نکال دوں گا" —— اس کا مطلب یہ تھا کہ لڑکی کی زبان سے جِن بول رہا تھا۔ بات کرتے ہوئے لڑکی کے ہونٹ اس طرح کھلے ہوئے تھے کہ اتنے حسین دانت بھیڑیے کے دانتوں کی طرح نظر آتے تھے۔ مجھ پر خوف طاری ہوگیا۔

لڑکی کی ساس اور سسر کمرے کی دہلیز پر بیٹھے تھے۔ کمرے میں لوبان جل رہا تھا۔ شاہ جی فرش پر بیٹھے لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے مسکرا کر لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا —— "دیکھو بیٹا! تم اس کی جان چھوڑ دو۔ ورنہ تمہارا وہی حشر کروں گا۔ جو تمہارے بڑے بھائی کا کیا تھا۔ زندہ جلا دوں گا" —— لڑکی قہقہہ لگا کر ہنسی۔ یہ ہنسی

یقیناً اس لڑکی کی نہیں تھی۔ بڑی ہی خوفناک ہنسی تھی جیسے رات کے وقت بھیڑیے بھونک رہے ہوں۔ اس نے کہا —— "اب تم مجھے نہیں پکڑ سکتے۔ مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ میں ڈرنے والی ذات کا جِنّ نہیں ہوں" —— لڑکی نے اس سے بھی زیادہ خوفناک قہقہہ لگایا اور وہ اس طرح چارپائی سے فرش پر آ پڑی جیسے تین چار آدمیوں نے لاش کو اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا ہو۔ لڑکی شیر کے پنجوں جیسی انگلیوں سے اپنے بال نوچنے لگی اور فرش پر زور زور سے ہاتھ مار مار کر مٹی سر اور منہ پر ڈالنے لگی۔

لڑکی کا سسر اسے سنبھالنے کے لئے اٹھا۔ میں بھی ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا تو شاہ جی نے ہمیں روک دیا۔ کہنے لگے —— "اسے کرنے دو جو کچھ کرتا ہے۔ میں اس مردود کو سنبھال لوں گا۔ اسے اپنا زور آزما لینے دو"

میں دل پر خوف اور رنج کا بوجھ اٹھائے کھسک آیا۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ اگر لڑکی پر کسی انسان کا قبضہ ہوتا تو میں اس انسان کا خون کر دیتا۔ جِنّ کے خلاف میں منہ سے بات بھی نہیں نکال سکتا تھا۔ میں اسی شام شاہ جی سے ملا اور انہیں کہا کہ میں انہیں منہ مانگا انعام دوں گا، وہ لڑکی کو جِن سے آزاد کرائیں۔ شاہ جی نے مجھ سے جو باتیں کیں وہ میں بیان کر آیا ہوں۔

تیسرے روز میں لڑکی کے دروازے کے باہر کھڑا تھا کہ قصبے کا تھانیدار دو کانسٹیبلوں کے ساتھ بستی میں آیا۔ کسی گاؤں میں قتل یا ڈاکے کی واردات ہوگئی تھی۔ اس کی تحقیقات کے لیے وہ اس بستی کے کسی گھر کی تلاشی لینے آیا تھا۔ وہ سکھ تھا۔ والد صاحب کا معتقد تھا۔ مجھے بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے کھڑا دیکھ کر میرے پاس آگیا اور بولا —— "چھوٹے چوہدری کیا ہو رہا ہے؟ بڑے اداس کھڑے ہو" —— میں نے اسے بتایا کہ ہمارے مزارعے کی بہو جِنّوں کے قبضے میں آگئی ہے۔ اسے دیکھنے آیا تھا۔ اس نے اشتیاق سے کہا —— "مجھے بھی دکھاؤ چوہدری" —— اور میں اسے اندر لے گیا۔

شاہ جی اسے دیکھ کر گھبرا گئے۔ بوکھلا کر اٹھے اور تھانیدار کو سلام کیا۔ تھانیدار نے لڑکی کو دیکھا تو اس پر بھی خوف طاری ہوگیا۔ لڑکی کی حالت ہی بڑی ڈراؤنی

تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر لڑکی سے (بلکہ جنّ سے) کہا —— "واہگورو، کرپا کرے مہاراج! ہم سلام کرنے آئے ہیں"—— لڑکی نے اس کی طرف لال انگارہ آنکھیں پوری کی پوری کھول کر دیکھا تو سکھ تھانیدار الٹے قدم پیچھے ہٹا اور ہاتھ جوڑ کر کہا —— "ہم سلام کرنے آئے تھے حضور ... سلام۔ سلام۔ حضور"—— اور تھانیدار باہر نکل آیا۔ اس کی زبان ہکلا گئی تھی۔ شاہ جی بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آگئے۔ باہر آکر جنّ کے متعلق باتیں ہونے لگیں تو شاہ جی نے کہا —— "جناب! میری جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یہ جنّ بڑا ظالم ہے۔ جس طرح آپ کو عادی ڈاکوؤں سے پالا پڑتا ہے اسی طرح مجھے ایسے ہی جنّوں سے پالا پڑتا ہے جو عادی گناہگار ہوتے ہیں۔ جس طرح بعض تھانیدار ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں، بالکل اسی طرح میرے جیسے عامل جنّوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ اس جن سے مجھے ایسا ہی خطرہ ہے۔ میں نے بڑے بڑے جابر جنّوں کو مٹی کے لوٹے میں بند کر لیا ہے لیکن یہ جنّ مجھے دھمکیاں دے رہا ہے۔ میں نے اپنے گرد حصار کھینچ لیا ہے جس کے لیے مجھے ہر وقت باوضو رہنا پڑتا ہے۔ جب کبھی اس جنّ نے مجھے بے وضو دیکھ لیا یہ میری گردن مروڑ دے گا"۔

"سنبھل کر شاہ جی، سنبھل کر"۔ سکھ تھانیدار نے کہا اور خوفزدہ حالت میں چلا گیا۔ میں پہلے سے زیادہ دہشت زدہ ہو گیا اور میں بھی گھر کی طرف چل پڑا۔

میں نے دل میں طے کر لیا تھا کہ اب اس لڑکی کو دیکھنے نہیں آؤں گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنّ میری گردن بھی مروڑ دے لیکن دل میں لڑکی کی محبت ایسی تھی کہ میں دوسرے دن پھر اس کے گھر چلا گیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ لڑکی گھر میں اکیلی تھی۔ وہ چارپائی پر لیٹی ہوئی چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا حال حلیہ پہلے سے زیادہ بگڑا ہوا تھا۔ گال پچک گئے تھے اور رنگ زرد تھا۔ اسے اکیلے دیکھ کر میں ڈر گیا۔ جب اس نے میری طرف دیکھا تو خوف سے میرا دل بیٹھ گیا۔ اس نے مریضوں کی سی آواز میں کہا۔ "آ جاؤ۔ میرے قریب بیٹھو"—— وہ شاید میرے چہرے سے بھانپ گئی تھی کہ میں خوف زدہ ہوں۔ اس نے کہا —— "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرے پاس بیٹھو۔ میں تمہیں یہ راز بتانا چاہتی ہوں۔ میں ایک مصیبت میں پھنسنے والی ہوں۔ اگر تمہارے دل میں میری محبت ہے تو میری مدد کرو"۔

میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور پوچھا کہ سب لوگ کہاں ہیں؟ اس نے جواب دیا۔ "وہ ذرا دیر سے آئیں گے"—— میری اس کے ساتھ بے تکلفی ایسی تھی کہ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپایا کرتی تھی۔ وہ مجھے اپنے راز میں شریک کرنے میں حق بجانب تھی۔ اس نے مجھے جو باتیں سنائیں وہ اس طرح یاد ہیں جیسے یہ کل رات کی بات ہو۔ باتیں بڑی لمبی ہیں۔ مختصراً سناتا ہوں۔

اس نے کہا —— "مجھے تم نے ہی بتایا تھا کہ میں بہت ہی خوبصورت لڑکی ہوں اور مجھے تم نے ہی بتایا تھا کہ میں کسی محل کی رانی بننے کے قابل ہوں۔ مجھے پیار اور محبّت کا نشہ تم نے ہی پلایا تھا۔ تمہاری اس قسم کی باتیں سننے سے پہلے میں اپنے آپ کو بے زبان جانور سمجھا کرتی تھی۔ میں یہی کچھ جانتی تھی کہ لڑکی کو جس مرد کے حوالے کر دو، وہ اسی کی غلام ہوتی ہے۔ وہ اس پر کتنا ہی ظلم کرے، لڑکی کا فرض ہے کہ ظلم برداشت کرے۔ میں غریبوں کے گھر میں گوبر اور اُپلوں میں پل کر جوان ہوئی ہوں۔ ہم غریبوں کی قسمت میں صرف مشقت اور دوسروں کی نوکری لکھی ہوئی ہے۔ مجھے ایک چرسی کے ساتھ بیاہ دیا گیا تو میرا وجود مٹی کے تودے کی طرح ایک گھر سے اٹھ کر دوسرے گھر میں آگیا۔ میرے دل میں یہ چبھن ضرور تھی کہ میرا خاوند دوسری لڑکیوں کے خاوندوں کی طرح ہٹا کٹا نہیں۔ نہ وہ ہل چلاتا ہے، نہ مردوں کی طرح مردوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے پھر بھی میں اسے اپنی قسمت سمجھ کر سہہ رہی تھی۔ دو تین بار اس نے مجھے مارا پیٹا بھی تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ مارنا خاوند کا حق ہے اور مار کھانا بیوی کا فرض ہے"۔

وہ دھیمی دھیمی آواز میں بولے جا رہی تھی اور میں خود سپردگی کے عالم میں سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی —— "جب تم نے پہلی بار مجھے کہا کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو تو میں کتنی دیر سوچتی رہی تھی کہ تم نے کیا کہہ دیا ہے۔ تم چلے گئے تو مجھے تمہارا یہ کلمہ سنائی دیتا رہا اور میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ تم پھر آؤ اور مجھ سے یہی بات کہو۔ پھر تم نے میری خوبصورتی کی تعریفیں شروع کر دیں۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ تم مجھے ایک روز وہی بات کہو

گے جو ہمارے پہلے زمیندار نے مجھ سے گھر بلا کر کہی تھی۔ میں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ میری عزّت کا مالک صرف میرا خاوند ہے مگر تم نے مجھے یقین دلا دیا کہ تم میری عزت کو بُری نظر سے کبھی نہیں دیکھو گے۔ پھر تم مجھے اچھے لگنے لگے۔ میرا تمہارا خون کا کوئی بھی رشتہ نہیں تھا۔ پھر بھی میں تمہیں اپنے ماں باپ کا خون سمجھنے لگی۔ میرا خاوند تو بہت دنوں بعد کبھی ذرا سی دیر کے لیے گھر آیا کرتا تھا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ وہ گھر آیا جایا کرے اور میں اس کی خدمت کیا کروں لیکن میری خواہش پوری نہ ہو سکی۔۔۔

"اس کی جگہ تم ہر روز آنے لگے اور ایسی پیاری پیاری باتیں کرنے لگے کہ میرے دل میں پیار پیدا ہو گیا۔ اس سے پہلے میں یہی جانتی تھی کہ پیار بچوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو اسے کھیتوں میں بھیج دیا جاتا ہے پھر اس کے لیے پیار ختم ہو جاتا ہے۔ وہ کھیتوں کی مٹی کے ساتھ مٹی اور مویشیوں کے ساتھ مویشی بن جاتا ہے۔ مگر تم نے میرے ساتھ بچوں کی طرح پیار کیا تو میرے دل میں بھی پیار پیدا ہو گیا۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ تم نے پیار کو ناپاک نہیں کیا۔ اس لیے میرے دل میں بھی ناپاک خیال نہ آئے جب تم چلے جایا کرتے تھے تو میں اداس ہو جایا کرتی تھی۔ میں تو چاہنے لگی تھی کہ تم میرے پاس بیٹھے رہا کرو اور میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہا کرو۔۔۔۔

"پھر تم بہت دنوں کے لیے باہر چلے گئے تو میرا دل تڑپنے لگا۔ تمہاری باتوں کا جو نشہ تھا وہ پورا نہیں ہوتا تھا۔ تمہارے جانے کے دوسرے دن کی بات ہے کہ تمہاری یاد نے بہت ستایا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ اچانک میرا خاوند آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ میں تو خدا اور رسولؐ کے نام پر اس شخص کی ملکیّت ہوں اور میں ایک غیر مرد کی یاد میں رو رہی ہوں۔ مجھے شرم آ گئی۔ میں نے سوچا کہ مجھے جو باتیں تم کہا کرتے ہو وہ میرے خاوند کے منہ سے نکلیں تو میری روح بھی خوش ہو جائے۔ میں نے اسی خواہش سے اس کے ساتھ ذرا کھل کر بات کی تو اس نے کھانستے کھانستے مجھ سے پوچھا کہ تمہارے پاس تھوڑے سے پیسے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں ہیں۔ اس نے بڑے زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا اور کہنے لگا کہ تم جھوٹ بولتی ہو۔ نکالو

پیسے۔ سچی بات ہے کہ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ مزارعوں کی بہو بیٹیوں کے پاس پیسے کہاں؟ گھر میں جو دو چار پیسے ہوتے تھے وہ اس کی ماں اپنے پاس رکھتی تھی۔ ماں گھر نہیں تھی۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ پیسے تمہاری ماں کے پاس ہوں گے۔ میرے خاوند نے گھر کی تلاشی لینی شروع کر دی تو میں نے اسے یہ کہہ کر روکا کہ تمہاری ماں مجھ پر چوری کا شک کرے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ان پیسوں سے چرس پیئے گا۔۔۔

"میں نے اسے روکا تو اس نے مجھے اتنا مارا پیٹا کہ میں فرش پر گر پڑی۔ اس نے مجھے ٹھڈ مار مار کر میری ہڈی پسلی ایک کر دی۔ کمبخت نشے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ مجھے ادھ موا کر کے چلا گیا۔ اس سے پہلے بھی اس نے مجھے دو تین بار اسی طرح پیٹا تھا لیکن میں نے اسے اپنا فرض سمجھ کر برداشت کر لیا تھا۔ اب تم نے مجھے پیار بھری باتوں سے ایک اور دنیا دکھا دی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ ایسی پیاری باتیں ایک غیر مرد کے منہ سے سننے کی بجائے اپنے خاوند کے منہ سے سنوں۔ مگر اس کے منہ سے ننگی گالیاں سنیں اور پٹائی کرائی۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ تم نے مجھ پر کتنا ظلم کیا ہے۔ میں جس زندگی میں مطمئن تھی، تم نے مجھے اس سے نکال کر ایک خوبصورت زندگی دکھا دی۔ مگر میرا خاوند اس زندگی کے قابل نہ تھا۔ میں نے خاوند سے کبھی نفرت نہیں کی تھی۔ تمہاری محبت نے میرے دل میں اس کے خلاف نفرت پیدا کر دی اور میں بے حال ہو گئی۔۔۔

"وہ مجھے مار پیٹ کر چلا گیا تو تمہاری یاد اور خاوند کے ظلم نے میرا ایسا بُرا حال کر دیا کہ دل میں یہی ایک بات جم گئی کہ اس خاوند سے طلاق لوں گی یا خود کشی کر لوں گی۔ تم جانتے ہو کہ ہماری ہر مشکل پیر فقیر اور سیّد بادشاہ حل کیا کرتے ہیں۔ میں مسجد والے شاہ جی کو اچھی طرح جانتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کے قبضے میں جنّ ہیں اور ان کے ہاتھ میں بڑی برکت ہے۔ اسی حال میں اٹھی اور ان کے حجرے میں چلی گئی۔"

حجرے میں شاہ جی نے اسے نجات کا جو راستہ دکھایا، اسے میں اپنی زبان

میں بیان کرتا ہوں۔ لڑکی نے مجھے ساری بات سنائی تھی۔ اس نے شاہ جی کو صاف الفاظ میں کہا کہ وہ خاوند سے طلاق لینا چاہتی ہے۔ شاہ جی اس کے خاوند کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے وہ خاوند کے خلاف لڑکی کی نفرت کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ شاہ جی پہلے دو تین روز لڑکی کو حجرے میں بلا کر "دم درود" کرتے رہے اور اسے ایک تعویذ بھی لکھ دیا۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بڑی سختی سے کی کہ وہ گھر میں کسی کو پتہ نہ چلنے دے کہ وہ ان کے حجرے میں جاتی ہے۔ ایک روز شاہ جی نے اسے کہا ــــ "دیکھو لڑکی، یہ کام تعویذ دھاگے سے اتنی جلدی نہیں ہوگا۔ میں نے فال نکالی ہے۔ فال میں مجھے ایک ایسے طریقے کا اشارہ ملا ہے جس سے طلاق جلدی ہو جائے گی۔ اگر تم یہ طریقہ کامیابی سے کر گزرو تو اس ظالم جرسی سے فوراً آزاد ہو جاؤ گی۔"

لڑکی ان کا ہر حکم ماننے پہ آمادہ ہو گئی۔ لڑکی کی مشکل اور اس مشکل سے نجات حاصل کرنے کی بے تابی کو دیکھتے ہوئے شاہ جی نے لڑکی پہ یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ یہ کام ان کے لیے بے حد خطرناک ہے۔ انہوں نے کہا ــــ "تم جانتی ہو کہ میرے قبضے میں جنّ ہیں۔ اس لیے بہت سے جنّ میرے دشمن ہیں۔ میں جو طریقہ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ وہ جنّوں کی مدد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ اگر ذرا سی گڑبڑ ہو گئی تو جنّ مجھے یا تمہیں جان سے مار ڈالیں گے۔ جنّوں کو خوش کرنے کے لیے ہمیں پہلے سے کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔"

لڑکی نے پوچھا کہ جنّوں کو خوش کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ لڑکی نے مجھے بتایا کہ شاہ جی نے آنکھیں بند کر کے ہوا میں اس طرح ہاتھ لہرایا جیسے کسی چیز کو پکڑ لیا ہو۔ مٹھی بند کر کے نہ جانے کس سے پوچھنے لگے ــــ "کیوں بھئی! تم کون سی چیز پسند کرو گے؟ اس بچّی کا کام ضرور کرنا ہے۔" ــــ لڑکی نے بتایا کہ شاہ جی چپ ہو گئے اور کہنے لگے ــــ "نہ نہ کوئی اور چیز بتاؤ۔ یہ نہیں مل سکتا۔ . . اس سے کم

پہ راضی نہیں ہو گے؟ . . . اچھا، تمہاری مرضی۔ بس ہمارا کام کرا دینا۔ یہی ملے گا۔" پھر شاہ جی نے لڑکی سے کہا ــــ "جن کہتا ہے مجھے تھوڑا سا سونا چاہیئے۔ تمہارے پاس کچھ زیور تو ہوگا؟" ــــ لڑکی نے انہیں بتا دیا کہ اس کے ماں باپ نے اسے جو زیور دیا تھا وہ انہیں دے دے گی۔ شاہ جی نے کہا ــــ "مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ یہ زیور جنّ کو دینا ہے۔ ورنہ ہم دونوں کی جان خطرے میں ہے۔"

سودا طے ہو گیا۔ شاہ جی نے لڑکی کو بتایا کہ گھر جا کر اپنے ہاتھ موڑ لے، جسم کو اکڑا لے اور زور زور سے چیخیں مارے۔ گھر کا کوئی فرد اسے پکڑے تو اسے پوری طاقت سے دھکا مار کر خود فرش پر گرے اور اپنے بال نوچ نوچ کر بالوں اور منہ پر مٹی ڈالے۔ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے وہ پوری طرح چڑیل بن جائے۔ مختصر یہ کہ لڑکی اب جو کچھ کر رہی تھی وہ اس سے شاہ جی کرا رہے تھے۔

لڑکی نے گھر جا کر وہی کچھ کیا جو اسے شاہ جی نے بتایا تھا۔ اس کی ساس اس کے قریب گئی تو لڑکی جو بھرپور جوان تھی اور اس کے دل میں بے پناہ نفرت موجزن تھی چڑیل بن گئی۔ اس نے ساس کو اکڑا ہوا ایک بازو لاٹھی کی طرح گردن پہ مارا۔ بڑھیا دیوار سے جا لگی اور وہ دہشت زدہ ہو کر شاہ جی کے پاس پہنچی۔ شاہ جی بھاگے ہوئے آئے۔ لڑکی کو دیکھا اور اعلان کر دیا کہ یہ جنّ ہے اور انہوں نے کمرے میں لوبان سلگا کر اپنا عمل شروع کر دیا۔

لڑکی نے متواتر تین دن نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ فاقے سے اس کا چہرہ اتر گیا اور آنکھیں اندر گھس گئیں۔ شاہ جی کچھ وقت کے لیے گھر والوں کو باہر نکال دیا کرتے تھے اور دروازہ بند کر کے لڑکی کو پانی میں کچھ گھول کر پلاتے تھے۔ لڑکی نے مجھے بتایا کہ اسے پی کر اس میں عجیب سی طاقت آ جاتی تھی۔ ایسی حالت میں شاہ جی اسے جو کچھ کہتے تھے، وہ بڑی خوشی سے اس طرح کرتی تھی۔ یہ محلول اس میں نیا جوش بھر دیتا تھا (میرا خیال ہے کہ شاہ جی اسے کوئی نشہ آور چیز پلاتے تھے) دو تین دن بعد شاہ جی کے کہنے کے مطابق لڑکی نے یہ کہنا شروع کر دیا ــــ "میں اس کے خاوند کا

. . . گا۔"

ایک روز ساس کا خاوند گھر آیا تو اس نے لڑکی کے منہ سے یہ دھمکی سنی جو جن کی آواز سمجھی جا رہی تھی۔ خاوند گھر سے ایسا بھاگا کہ واپس نہ آیا۔ لڑکی کے گھر والے ہی نہیں، ساری بستی تسلیم کر چکی تھی کہ یہ جن ہے اور شاہ جی نکالنے کے جتن کر رہے ہیں۔ وہ سیدھے سادے لوگ شاہ جی کو جنوں کا بادشاہ سمجھ رہے تھے۔ بعض لوگوں نے لڑکی کی ساس اور سسر کو کہنا شروع کر دیا تھا کہ اپنے بیٹے کی خیریت چاہتے ہو تو لڑکی کو طلاق دے دو۔ ورنہ جن اس کا کلیجہ نکال کھائے گا۔ لیکن ماں باپ بے چارے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

لڑکی مجھے یہ ساری واردات سنا رہی تھی اور مجھ پر شاہ جی اور ان کے جنوں کا پول کھلتا جا رہا تھا۔ میرا خون کھولنے لگا لیکن لڑکی کہہ رہی تھی کہ شاہ جی نے مجھ پر جن قابض کر دیا ہے۔ اب یہ جن مجھے خاوند سے طلاق لے دے گا۔ لڑکی بالکل محسوس نہیں کر رہی تھی کہ شاہ جی اس کے اندر جن نہیں کوئی نشہ داخل کر رہے ہیں اور اسے اپنے اشاروں پر نچا رہے ہیں۔ لڑکی اس حالت میں مطمئن تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ شاہ جی کو زیور دے چکی ہے؟ اس نے بتایا کہ شاہ جی نے آج اس کی ساس اور سسر کو ایک ایسی خانقاہ کی چٹکی بھر لانے کو بھیج دیا ہے جو یہاں سے پندرہ میل دور ہے۔ وہ شام سے پہلے پہلے واپس نہیں آسکیں گے۔ اس نے بتایا کہ ان کے جانے کے بعد شاہ جی نے اس سے زیور مانگا اور کہا کہ جن نے کہا ہے کہ میرا انعام مجھے دے دو، بس کام ہو گیا ہے۔ لڑکی نے انہیں کانٹوں کی جوڑی اور دو انگوٹھیاں دے دیں جو شاہ جی حجرے میں لے گئے تھے۔

لڑکی نے کہا — "کل شاہ جی میرے سسر اور ساس کو کہہ دیں گے کہ لڑکی کو طلاق دے دو ورنہ تمہارا بیٹا جہاں کہیں بھی ہے اسے جن جان سے مار کر اس کا کلیجہ نکال لیں گے۔"

لڑکی کی سادگی اور پسماندگی کی انتہا تھی کہ وہ شاہ جی کی بتائی ہوئی اداکاری کر رہی تھی لیکن اسے اداکاری نہیں سمجھ رہی تھی۔ یہ اسی کے نشے کا اثر تھا۔ اس

نشے کے دوران وہ جانے اسے کیسے کیسے خوبصورت خواب دکھاتے رہتے تھے۔

باتوں باتوں میں لڑکی نے بتایا کہ شاہ جی نے اسے کہا ہے کہ وہ آج رات اس کے حجرے میں گزارے — "ایک جن کو خوش کرنا ہے تاکہ وہ کل سارا کام کر دے۔" لڑکی جانے پہ تیار تھی۔ شاہ جی نے اسے کہا تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد وہ ان کے حجرے میں پہنچ جائے۔

میں نوجوان تھا۔ دماغ بالکل کچا تھا۔ میں اسی قدر سمجھ سکا کہ لڑکی شاہ جی کے فریب میں آ گئی ہے لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں والد صاحب کو یہ ساری باتیں نہیں بتا سکتا تھا۔ ورنہ وہ فوراً پوچھتے کہ اس لڑکی کے ساتھ میری اس قدر بے تکلفی کس طرح پیدا ہوئی کہ اس نے ساری بات مجھے بتا دی۔ لڑکی اور اس کے سسر اور ساس کو کچھ سمجھانا بھی بے کار تھا کیونکہ وہ شاہ جی اور ان کے جنوں کے قائل تھے۔

میں سر جھکائے ہوئے وہاں سے اُٹھ آیا اور سوچنے لگا کہ میں اس فریب کو کس طرح بے نقاب کر سکتا ہوں۔ کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے بار بار لڑکی کے خاوند کا خیال آ رہا تھا لیکن وہ کئی دنوں سے گھر نہیں گیا تھا۔ میں قبرستان کے تکیے کی طرف اس امید پر چل پڑا شاید وہ وہاں مل جائے۔ خدا نے کرم کیا کہ وہ مجھے راستے میں ہی مل گیا۔ وہ تکیے کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر رک گیا اور جھک کر سلام کیا۔ میں نے اسے پہلے تو بہت ساری گالیاں دیں۔ پھر اسے شرم دلائی کہ وہ کتنی حسین بیوی پر ظلم کر رہا ہے اور اسے بتایا کہ اس کے سلوک کی وجہ سے آج رات اس کی بیوی شاہ جی کے حجرے میں جا رہی ہے۔

میں نے دیکھا کہ اس کا زرد پیلا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ اس نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "کیا کہا تم نے چوہدری؟ میری عزت شاہ جی کے حجرے میں جا رہی ہے؟ وہ شاہ جسے ہم تکیے سے چرس کے سگریٹ مفت بھیجا کرتے ہیں میری عزت کو . . ." وہ کہتے کہتے رک گیا اور دانت پیس کر بولا — "چوہدری، اللہ تیری بادشاہی قائم رکھے۔ مجھے سارا قصہ سنا دے۔"

میں نے اسے سارا ناٹک پوری تفصیل کے ساتھ سنا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ آج رات عشاء کی نماز کے بعد اس کی بیوی شاہ جی کے حجرے میں ہوگی۔

اس نے میری اور کوئی بات نہ سنی اور سر جھکائے ہوئے چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے آہستہ سے کہا ــــ "جو مولا کرے گا۔"

میں اپنے گھر چلا گیا۔ بے چینی کا یہ عالم کہ بھوک بھی مر گئی اور رات نیند بھی نہ آئی۔ رات بھر یہ تلخی ستاتی رہی کہ جس لڑکی سے میں نے محبت کی تھی وہ آج رات شاہ جی کے حجرے میں ہوگی۔ رات اسی تلخی اور بے قراری میں گزر گئی۔ صبح طلوع ہوئی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ ایک مزارعے نے میرے والد صاحب کو آکر یہ خبر سنائی کہ شاہ جی اپنے حجرے میں مرے پڑے ہیں۔ والد صاحب باہر نکل گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ شاہ جی کے دروازے کے سامنے ان کے معتقدوں کا سوگوار ہجوم کھڑا تھا۔ میں نے والد صاحب کے ساتھ اندر جا کے دیکھا۔ شاہ جی کی لاش زمین پر بچھے ہوئے گدّے پر اس طرح پڑی تھی کہ ایک بازو لاش کے نیچے تھا۔ دوسرا ایک طرف پھیلا ہوا تھا۔ ایک ٹانگ دوہری اور دوسری سیدھی تھی۔ لاش اوندھے منہ پڑی تھی۔ گدے پر بچھی ہوئی چادر اس طرح اکٹھی ہو گئی تھی جیسے مرنے سے پہلے شاہ جی تڑپتے رہے ہوں۔ ان کا منہ بھی کھلا ہوا اور آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں بلکہ اُبلی ہوئی تھیں۔ زبان آدھی باہر نکلی ہوئی تھی۔

والد صاحب نے مجھے تھانے میں رپورٹ دینے کے لیے دوڑا دیا۔ میں نے سکھ تھانیدار کو گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا کہ شاہ جی اپنے کمرے میں مرے پڑے ہیں۔ تھانیدار دو سپاہیوں کو ساتھ لیے میرے ساتھ آ گیا۔ راستے میں اس نے کہا "معلوم ہوتا ہے شاہ جی کو جن ٹھکانے لگا گئے ہیں۔ تمہیں یاد ہے نا، چھوٹے چوہدری، پرسوں شاہ جی نے کہا تھا کہ اس لڑکی کے جن سے انہیں بہت خطرہ ہے؟"

اسے خوش قسمتی ہی سمجھئے کہ تھانیدار بھی شاہ جی کے جنوں کا قائل تھا۔ اس نے لاش کو دیکھا۔ کمرے کے فرش پر اور کمرے سے باہر کھرا کھوج ڈھونڈنے لگا لیکن

وہاں اب معتقدوں کے کھرے تھے۔ تھانیدار نے سب سے پہلے جس کے متعلق پوچھا وہ یہ لڑکی تھی۔ اس نے اس لڑکی کو جن کے قبضے میں دیکھا تھا۔ تھانیدار نے باہر چارپائی بچھوا کر لڑکی کو بلایا۔ میں اور والد صاحب بھی اس کے پاس بیٹھ گئے۔ باقی لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ لڑکی کو بلایا گیا۔ وہ آ گئی۔ میں نے اسے دیکھا۔ اس کا حلیہ ذرا بہتر تھا لیکن سخت سہمی ہوئی تھی۔ وہ ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ تھانیدار نے اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ تھانیدار نے اس سے پوچھا۔

"کاکی! تم کچھ بتا سکتی ہو کہ شاہ جی کس طرح مرے ہیں؟ ــــ ڈرو نہیں۔ تم ہماری بہو بیٹی ہو۔"

لڑکی کے آنسو بہ نکلے۔ اس نے دبی دبی زبان میں کہا ــــ "مجھے ڈر لگتا ہے۔"

میرے والد صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور بڑے پیار سے کہا ــــ "نہ بیٹی، ڈرو نہیں۔ تم تو میری بیٹی ہو تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

لڑکی نے ڈرے ڈرے لہجے میں بولنا شروع کر دیا ــــ "شاہ جی نے مجھے کہا تھا کہ رات کی نماز کے بعد میرے حجرے میں آنا۔ میں اپنے ساس اور سسر سے پوچھ کر چلی گئی۔ شاہ جی گدّے پر بیٹھے تھے۔ ان کے قریب مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ میں ان سے ذرا ہٹ کر بیٹھی تو انہوں نے مجھے اپنے قریب کر لیا۔ جوں ہی میں ان کے قریب ہوئی شُوں کی سی آواز آئی اور دیا بجھ گیا پھر اندھیرے میں شاہ جی اس طرح تڑپنے لگے جیسے انہیں کسی چیز نے پکڑ لیا ہو۔ اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ مجھے خراٹے کی طرح کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں اتنی ڈری کہ وہاں سے بھاگ آئی۔ صبح سنا کہ شاہ جی مرے پڑے ہیں۔"

تھانیدار نے لڑکی سے بہت سوال پوچھے، بہت جرح کی لیکن لڑکی جو بات سنا چکی تھی، اس کے سوا اور کچھ بھی نہ بتا سکی۔ تھانیدار نے اس سے اس کے خاوند کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ بہت دنوں سے غائب ہے۔ گھر آتا ہی نہیں۔ تھانیدار نے کئی اور آدمیوں سے چند ایک باتیں پوچھیں۔ لڑکی کے خاوند کے متعلق سب نے بتایا ۔۔۔ آیا۔ تھانیدار کو اس آدمی پر شبہ تھا لیکن یہ ثابت ہو گیا

کہ وہ کئی دنوں سے غائب ہے۔ واردات کی رات بھی بستی میں یا گھر میں نہیں تھا۔
تھانیدار نے میرے والد صاحب سے کہا ــــ "یہ جنّوں کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔ ایسے درویش انسان کا اور کون دشمن ہو سکتا ہے" ــــ اور وہ لاش کو اٹھوا کر تھانے لے گیا۔

دوسرے دن کا واقعہ ہے۔ میں گھر سے باہر نکلا تو لڑکی کا خاوند آتا دکھائی دیا۔ میں اسے دیکھ کر رک گیا۔ وہ میرے پاس آ رکا اور کہنے لگا ــــ "چوہدری! بہت ضروری بات کرنے آیا ہوں۔ یہاں سنو گے یا باہر چلے چلیں؟" ــــ میں اسے کمرے میں لے گیا۔

اس نے کہا ــــ "تم نے چوہدری کل مجھے جس طرح شرم دلائی تھی، اس سے مجھے یقین ہے کہ تمہیں میری عزت کا بہت خیال ہے۔ میں تمہارا غلام ہوں چوہدری، تمہارا دیا کھاتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے مجھے اپنا بھائی بنا سکتے ہو؟"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ــــ "اگر تمہیں اپنا بھائی نہ سمجھتا تو کل تمہیں اتنی گالیاں نہ دیتا۔ تمہاری بیوی خواہ کسی کے گھر جا کے رات گزارے، مجھے کیا؟ لیکن میں نے تمہیں بھائی سمجھ کر شرم دلائی تھی کہ اپنی عزت کو سنبھالو۔"

"قسم کھاتے ہو چوہدری؟" اس نے میرے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر پوچھا ــــ
"مردوں کی طرح قسم کھاؤ اور میری بات سنو" ــــ میں نے اللہ پاک کی قسم کھا کر اسے کہا کہ میں اسے دھوکا نہیں دوں گا۔

اس نے ذرا سی دیر میرے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کے دیکھا۔ اس کے ہونٹ ذرا سے کانپے اور اس کے منہ سے جیسے بے اختیار نکل گیا ہو ــــ "شاہ مردود کو میں نے قتل کیا ہے۔ اس کے قبضے میں کوئی جنّ نہیں تھا۔ اس کے گھر ہمارے تکیے سے چرس کے سگریٹ جایا کرتے تھے۔"

میں نے کبھی کوئی قاتل نہیں دیکھا تھا۔ اب ایک قاتل کو اپنے سامنے بیٹھے دیکھا تو میرے دل پر ڈر سا طاری ہونے لگا۔

"میں تمہیں یہ بھید اس لیے بتا رہا ہوں چوہدری، کہ کل تم میرے ہمدرد بن

گئے تھے" ــ اس نے کہا۔ "آج تم نے قسم کھائی ہے۔ میری عزّت تمہاری عزّت ہے۔ میں اب سمجھا ہوں کہ قتل کر لینا کوئی مشکل نہیں لیکن خون ہضم کر لینا بہت مشکل ہے۔ شاہ کو قتل کر کے میں تکیے پر گیا تو وہاں ملنگوں نے دیا جلا رکھا تھا۔ دیے کو دیکھ کر مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے شاہ بھی تکیے کے اندر آ گیا ہو۔ پھر مجھے یقین سا ہونے لگا کہ شاہ تکیے کے باہر کھڑا ہے اور وہ مجھ سے اپنے قتل کا انتقام لے گا۔ میں اتنا کبھی نہیں ڈرا تھا۔ میں نے چرس کے کش پہ کش لگانے شروع کر دیے، میں اتنی چرس پی گیا جو چھ آدمیوں کو اندھا کرنے کے لیے کافی تھی لیکن مجھ پر ذرہ بھر اثر نہ ہوا۔

اس نے دیا جلایا اور گدّے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میری بیوی آ گئی۔ شاہ نے مستانہ سی آواز میں اس کا نام لیا۔ میری بیوی اس سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئی۔ شاہ نے اسے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا اور بازو اس کی کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ ان دونوں کو گمان تک نہ تھا کہ پلنگ کے نیچے موت چھپی ہوئی ہے۔ دیا شاہ سے ذرا پیچھے تھا اور مجھ سے دور نہیں تھا۔ میں نے منہ آگے کیا اور زور سے پھونک مار کر دیا بجھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بہت تیزی سے مینڈک کی طرح پھدک کر شاہ پر جا پڑا اور اس کی گردن کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اندھیرے میں مجھے اپنی بیوی کی چیخ سنائی دی اور وہ بھاگ گئی۔ شاہ نے میری کلائیاں پکڑ لیں۔ وہ مجھ سے زیادہ طاقتور تھا۔ اس نے زور سے جھٹکا دیا۔ میں دوسری طرف جا پڑا اور شاہ میرے اوپر ہو گیا لیکن میں نے اس کی گردن نہ چھوڑی جس سے وہ بے بس رہا ورنہ مجھ جیسا کمزور انسان اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ دونوں انگوٹھوں سے اس کی شاہ رگ کو اچھی طرح دبائے رکھا۔ وہ اتنی زور زور سے تڑپنے لگا کہ ہم دونوں اوپر تلے ہوتے رہے، کمبخت مرتا ہی نہیں تھا . . .

"میں نے پوری طاقت لگا کر اس کی شاہ رگ کو انگوٹھوں سے دبایا۔ اس وقت وہ میرے اوپر تھا۔ وہ ایک بار بہت زور سے تڑپا اور بے جان ہو گیا۔ میں نے اس کی گردن دبائے رکھی اور اسے ایک طرف دھکیلا تو وہ پرے جا پڑا۔ میں نے گردن کو چھوڑا اور اس کے دل پہ

ہاتھ رکھا پھر اس کی ناک پر انگلی رکھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مر گیا ہے۔ میں وہاں سے نکلا اور تکیے پر چلا گیا۔ مگر اس وقت سے میں اتنا بے چین اور ڈرا ہوا ہوں کہ مجھے ہر طرف شاہ گھومتا پھرتا نظر آ رہا ہے۔ اب تمہیں ساری بات سنا دی ہے تو دل کو ذرا سکون آیا ہے۔ میں ساری رات تکیے میں پڑا، ڈر سے تھر تھر کانپتا رہا۔ باہر ذرا سی آہٹ ہوتی تو میں دروازے پر نظریں جما لیتا۔ یہی ڈر لگا رہا کہ شاہ آ رہا ہے . . .

رات گزر گئی۔ دن بھی اسی طرح کونوں کھدروں میں چھپ چھپ کر گزارا۔ اگلی رات بھی اسی طرح گذری۔ دل میں یہی ایک بات آتی تھی کہ کسی کو یہ راز بتا دوں یا تھانے جا کر اقبال جرم کر لوں۔ یہ خونی راز مجھے اندر ہی اندر بچھوؤں کی طرح ڈنک مار رہا ہے۔ چوہدری! رہ رہ کر تمہارا ہی نام دل میں آتا تھا۔ اب چاہو تو مجھے پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دو۔ چاہو تو مجھے سینے سے لگا لو۔ تم ہی نے میرا خون گرمایا تھا۔ میری جگہ تم ہوتے تو یہی کرتے جو میں نے کیا ہے۔"

"تم پھانسی کے تختے پر کھڑے نہیں ہو گے۔" میں نے اسے خود اعتمادی سے کہا اور اس سے پوچھا — "تم نے اسے قتل کس طرح کیا ہے؟"

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد میری بیوی اس کے گھر جائے گی۔" اس نے راز اگلا — "یہ تو تم جانتے ہو کہ ہماری بستی کے لوگ شام ہوتے ہی سو جاتے ہیں۔ میں چوری چھپے مسجد تک پہنچا۔ شاہ مسجد میں تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ گھر کے دروازے کو تالا لگا کر مسجد میں نہیں جایا کرتا۔ اس کا بیوی بچہ تو کوئی ہے نہیں۔ میں اس کے گھر چلا گیا۔ وہ فرش پر بچھے ہوئے گدّے پر بیٹھا کرتا تھا۔ گدّے کے بالکل قریب پلنگ پڑا تھا۔ میں نے پلنگ کی چادر ایک طرف سے اور زیادہ نیچے لٹکا دی اور پلنگ کے نیچے چھپ گیا۔ پلنگ کے ساتھ ہی لکڑی کا چراغ دان رکھا تھا۔ جس پر مٹی کا بجھا ہوا دیا پڑا تھا . . .

"میں پلنگ کے نیچے چھپا ہوا قتل کی ترکیب دل میں دہراتا رہا۔ شاہ آیا۔" میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کے راز کو اپنے سینے میں چھپائے رکھوں گا۔

لیکن جس راز میں کسی انسان کا خون ملا ہوا ہو اسے کوئی انسان ہضم نہیں کر سکتا۔ یہ آدمی اپنا راز میرے حوالے کر کے پورے سکون سے چلا گیا۔ مگر دوسرے دن وہ پھر میرے پاس آیا اور رو پڑا۔ اس نے کہا — "چوہدری، میں تھانے جا کر اقبال جرم کر لوں؟ کیا دن اور کیا رات، مجھے چین نہیں آتا، سینے میں ایسی تلخی ہے جیسے کسی نے زہر پلا دیا ہو۔ چرس پی پی کر پاگل ہو گیا ہوں۔ نشہ آتا ہی نہیں۔ کبھی تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے شاہ کی گردن ابھی تک میرے ہاتھ میں ہے۔"

میں نے اسے بہت تسلیاں دیں اور اسے بتا دیا کہ مجھے والد صاحب نے بتایا ہے کہ سکھ تھانیدار شاہ کی موت کو جنّوں کی کارستانی قرار دے کر تحقیقات ختم کر رہا ہے اس کے باوجود قاتل کو چین نہ آیا۔ دو روز تک وہ مجھے نظر نہ آیا، نہ میں اس کی بیوی کو دیکھنے گیا۔ اس سے اگلے روز خبر ملی کہ نہر سے لڑکی کے خاوند کی لاش ملی ہے۔ نہر قصبے سے کوئی ایک میل دور سے گزرتی تھی۔ لاش دور آگے کنارے پر اٹکی ہوئی تھی۔ لاش اس کے گھر لائی گئی۔ لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے لیکن میرے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ مرنے والا اس قدر کمزور دل تھا کہ قتل جیسے بھیانک جرم کو ہضم نہیں کر سکا اور اس نے خودکشی کر لی ہے۔

جب میں اس کی لاش دیکھنے گیا تو اس وقت پتہ چلا کہ اس کی بیوی کی حالت بہت بُری ہو گئی ہے۔ وہ شاہ اور اپنے خاوند کی موت کو جنّوں کی انتقامی کارروائی سمجھے ہوئے تھی۔ شاہ نے اسے بھوکا رکھ کر نشہ پلا پلا کر اس کی جسمانی اور ذہنی حالت بہت زیادہ کمزور کر دی تھی۔ اب جو اس کی حالت ہو رہی تھی وہ اداکاری نہیں تھی۔ اس کے دل پر جنّوں کا خوف سوار ہو گیا تھا۔ میں لوگوں کے سامنے اس کے ساتھ بات کرنے سے گھبراتا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ گھر میں ماتم کی فضا ختم ہو جائے تو اسے اکیلے ساری حقیقت سنا دوں گا پھر اسے چین آ جائے گا اور اسے خوشی ہو گی کہ جس خاوند سے وہ گلوخلاصی کرانا چاہتی تھی وہ مر گیا ہے اور اب وہ اپنی مرضی کی شادی کرنے کے لیے آزاد ہو گئی ہے۔

لیکن مجھے ایسا موقع نہ مل سکا۔ دوسرے دن اطلاع ملی کہ لڑکی رات کے وقت باہر کو بھاگ اٹھی اور چلانے لگی —"جنّ آگئے جنّ آگئے۔ مجھے قتل کر دیں گے۔ جنّ مجھے قتل کرنے آئے ہیں"— وہ بھاگتی اور چیختی چلّاتی چلی گئی۔ اس کی ساس اور سسر اور اس کی اپنی ماں اور باپ جو اس کے خاوند کی موت پر آئے ہوئے تھے، اس کے پیچھے دوڑے۔ آگے کھلا کنواں تھا۔ کسی کو علم نہیں کہ لڑکی نے خود کنوئیں میں چھلانگ لگا دی یا دیکھ نہ سکی اور کنوئیں میں گر پڑی۔ شور شرابا سن کر ساری بستی جاگ اٹھی۔ ایک آدمی کو رسّے سے کنوئیں میں اتارا گیا۔ اس نے لڑکی کو پانی سے اٹھا کر کندھوں پر ڈالا اور جب دونوں کو باہر نکالا گیا تو لڑکی مر چکی تھی۔

جی میں آتا تھا کہ یہ راز ساری بستی کو سناؤں اور انہیں بتاؤں کہ یہ پیر فقیر اور عامل محض فریب ہیں لیکن ایک تو میں خود اس راز کا ایک حصہ تھا اور دوسرے اس لیے چپ رہا کہ یہ پیر فقیر لوگوں کے اعصاب پر اس حد تک سوار ہیں کہ میری بات کو وہ کفر کہہ کر مجھے دھتکار دیں گے۔ میں نے دیکھا کہ بستی والوں نے شاہ کے حجرے کو باقاعدہ زیارت بنا دیا اور اگست ۱۹۴۷ء تک یعنی ہجرت کے وقت تک وہاں ہر جمعرات دیے جلاتے رہے۔

کم بخت آسیب زدہ ہے

الف۔ب

گمنام خاتون نے جس بے باکی سے اپنی کہانی "میں کسی کی بیٹی نہیں" حکایت ستمبر ۱۹۷۰) سنائی ہے، اس سے وہ خود تو ننگی ہو گئی ہے لیکن معاشرے کو بھی اس نے خوب ننگا کیا ہے۔

گمنام خاتون کی بے باکی نے مجھے اور میری ایک عزیز ترین سہیلی کو اتنی دلیری عطا کی ہے کہ ہم بھی اپنا ایک راز فاش کرنے پر تُل گئی ہیں۔ یہ چار دیواری کی دنیا کا ایک راز ہے۔ میری سہیلی نے مجھے اجازت دی ہے کہ میں اس کا نام دیے بغیر یہ راز فاش کر دوں بلکہ اس نے خواہش ظاہر کی ہے کہ میں ایسا کروں۔ اسے اب کسی کا ڈر نہیں۔ میں یہ کہانی اس درخواست کے ساتھ سنا رہی ہوں کہ کہانی پر میرا نام "ا۔ب" لکھیں اور میری سہیلی کے اصلی نام کی بجائے اسے باجی لکھیں۔ کہانی کی تصدیق کے لیے میں اپنے اور باجی کے خاوند کی تحریریں بھیج رہی ہوں۔ دونوں تحریریں تلف کر دیجیے گا۔

ہم دونوں اس وقت سہیلیاں بنی تھیں جب ہم دوسری جماعت میں پڑھا کرتی تھیں۔ ہمارے گھر دو مختلف محلّوں میں تھے۔ ہم دونوں کی گہری محبت کی وجہ یہ تھی کہ میرے والد صاحب فوت ہو گئے تو دوسرے دن باجی کے والد صاحب فوت ہو گئے۔ ہم دونوں چھوٹی چھوٹی بچّیاں تھیں۔ دونوں کو اپنے اپنے والد صاحب کے ساتھ بہت ہی پیار تھا۔ والد صاحب بھی ہم سے بہت ہی پیار کرتے تھے۔ ہم دونو کا دل کلاس میں نہیں لگتا تھا۔

ہم اپنے اپنے والد کی پیاری پیاری باتیں کلاس کی بچیوں کو سنانا چاہتی تھیں کیونکہ اس طرح غم ہلکا ہوتا تھا لیکن بچیوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ ہمارے رونے سننے بیٹھ جاتیں۔ سبھی بچیاں تھیں جو درد بھری باتیں سننے کی بجائے ہنسنے کھیلنے کو زیادہ پسند کرتی تھیں۔ اس وقت تک باجی میری سہیلی نہیں تھی۔ والد صاحب کی وفات کے تھوڑے دنوں بعد ہم سکول گئیں، تفریح کی گھنٹی بجی تو ساری بچیاں چیختی چلاتی باہر بھاگ گئیں۔ میں کلاس میں ہی بیٹھی رہی۔ میں زور زور سے رونا اور ابا جان کو پکار پکار کر بلانا چاہتی تھی۔ جی میں یہ بھی آئی کہ گھر بھاگ جاؤں اور امی کی گود میں چھپ کر اتنا روؤں کہ ابا جان قبر سے اٹھ آئیں اور مجھے بہلا لیں۔

میں نے دیکھا کہ باجی بھی کلاس میں بیٹھی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے ابا جان بھی فوت ہو گئے ہیں۔ وہ رو رہی تھی۔ میں اس کے پاس جا بیٹھی تو مجھے بھی رونا آ گیا۔ وہ روتے روتے چپ ہو گئی اور مجھ سے پوچھنے لگی ــــ "تمہارے ابا جان تمہارے لیے روز دو ٹانیاں لایا کرتے تھے؟" ــــ میں نے کہا ــــ "وہ جب دفتر جانے لگتے تھے تو مجھے دو آنے دے جایا کرتے تھے"۔ اس نے کہا ــــ "میرے ابا جان دفتر سے آتے تھے تو سب سے پہلے مجھے اٹھاتے تھے اور پوچھتے تھے کہ دن بھر کیا کیا کھایا ہے اور کیا کرتی رہی ہو؟ پھر میں انہیں سارے دن کی کہانی سنایا کرتی تھی۔۔۔ سچی، میرے ابا جان اتنے اچھے تھے"۔

اس نے بات ختم کی تو میں نے اپنے ابا جان کی بات شروع کر دی۔ جسے وہ دلچسپی سے سنتی رہی۔ اتنے میں تفریح کا وقت ختم ہو گیا۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ چھٹی ہوئی تو ہم دونوں اکٹھی گھر کو چلیں۔ راستے میں ہم باری باری اپنے اپنے ابا جان کی باتیں سناتی رہیں۔ اس روز سے ہم اتنی پکی سہیلیاں بن گئیں کہ کلاس میں بھی اکٹھی بیٹھنے لگیں۔ سکول بھی اکٹھی جانے لگیں۔ پھر ہم ایک دوسرے کے گھر جانے لگیں۔ اس کی امی کے دل میں بھی وہی زخم تھا جو میری امی کے دل میں تھا۔ باجی کی امی مجھ سے اور میری امی باجی سے بہت ہی پیار کرنے لگیں۔

اسی پیار میں ہم اتنی اتنی بڑی ہو گئیں کہ ہماری مائیں اور بڑے بھائی ہماری شادی کی باتیں کرنے لگے۔ ہم جوان ہو گئی تھیں اور تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا گیا تھا۔ ہم

دونوں کو کڑے پردے میں بٹھا دیا گیا۔ ہمارا یہ معمول بن گیا تھا کہ ہفتے میں دو تین بار باجی میرے گھر آتی اور اتنی ہی بار میں اس کے گھر جاتی۔ ہم پورا پورا دن ایک دوسری کے گھر گزارا کرتی تھیں۔ ہم الگ تھلگ کمرے میں بیٹھ جاتیں اور راز و نیاز کی باتیں کیا کرتیں۔ ہم دونوں کو علم نہیں تھا کہ ہماری شادی کس کس کے ساتھ ہو رہی ہے۔ اتنا پتہ چل گیا تھا کہ بات پکی ہو گئی ہے۔ ہم دونوں تنہائی میں بیٹھیں اپنے اپنے ہونے والے خاوندوں کی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ وہ مجھے بتایا کرتی کہ وہ کس قسم کے خاوند کو پسند کرے گی اور میں اسے اپنی پسند بتایا کرتی۔ اللہ کا اتنا کرم ضرور تھا کہ ماں باپ نے تربیت ایسی کی تھی کہ ہم نے کبھی اس قسم کی بات نہیں کی تھی کہ "مجھے محلے کا فلاں لڑکا بہت پسند ہے"۔ ہم پردہ نشین اور باحیا لڑکیاں تھیں لیکن تنہائی میں ہم کبھی کبھی بکواس بھی کر گزرتی تھیں جو صرف ہم دونوں تک محدود تھی۔

پھر وہ دن آ ہی گیا جب مجھے ایسے مرد کے سپرد کر دیا گیا جسے میں نے کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ پچیس روز بعد باجی کو بھی ڈولی میں بٹھا کر اپنے ابا جان کے گھر سے رخصت کر دیا گیا۔ اس کے لئے بھی اس کا خاوند اجنبی تھا۔ میں نے شادی کے بعد سسرال سے آ کر باجی کو ساری ہی باتیں سنا دی تھیں۔ اسی طرح باجی جب تیسرے روز میکے آئی تو میں رات اس کے گھر اس کے ساتھ سوئی۔ ہم سوئی کہاں تھیں۔ رات باتیں کرتے گزر گئی تھی۔ باجی نے مجھ سے کوئی بھی بات نہ چھپائی۔ ہماری محبت ہی ایسی تھی۔ ہم ایک دوسری سے کوئی بات چھپا ہی نہیں سکتی تھیں۔ ہم دونوں کو خاوند اچھے مل گئے۔ وہ ہمیں دل و جان سے چاہتے تھے۔ میرے خاوند نے پہلی رات مجھے کہا تھا کہ ہمارے ہاں شادی لڑکی اور لڑکے کی نہیں ہوتی بلکہ دو خاندانوں کی ہوتی ہے۔ اکثر اوقات دو خاندانوں کی سیاست بازی اور ذرا ذرا سی نوک جھونک لڑکی لڑکے کی ازدواجی زندگی کو جہنم بنا دیتی ہے۔ آؤ، ہم ایک دوسرے سے وعدہ کریں کہ تم اپنے خاندان کا اثر قبول نہیں کرو گی اور میں اپنے خاندان کی کسی ایسی بات پر کان نہیں دھروں گا جو ہماری محبت کے لئے خطرناک ہو۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر وعدہ کیا کہ ہم اپنی محبت پر اپنے

بزرگوں کی محبت کو قربان کر دیں گے۔

بالکل یہی بات باجی نے مجھے سنائی۔ اس کے خاوند نے بھی اسے پہلی رات اسی قسم کی بات کہی اور دونوں نے ایک دوسرے سے ہم جیسا ہی وعدہ کیا لیکن ان کا وعدہ زیادہ پختہ تھا کیونکہ ان کے کمرۂ عروسی کی الماری میں قرآن رکھا تھا۔ باجی کے خاوند نے قرآن سامنے رکھ کر اپنا ہاتھ قرآن پر رکھ دیا۔ باجی نے بھی اپنا ہاتھ قرآن پر رکھا۔ اس کے خاوند نے کہا کہ میں اللہ کے پاک کلام کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ خواہ کیسے ہی طوفان آئیں، تمہیں دھوکا نہیں دوں گا نہ تمہارا ساتھ چھوڑوں گا۔

باجی نے مجھے سنایا کہ میں نے قرآن سے ہاتھ اٹھا لیا۔ میں ڈر سے کانپ گئی۔ میں نے اپنے خاوند سے کہا کہ آپ نوجوان مرد ہیں اور میں نوجوان لڑکی ہوں۔ آپ صرف رومانی جذبات سے مغلوب ہو کر اتنی بڑی قسم کھا بیٹھے ہیں۔ یہ مت بھولئے کہ ہمارے گھروں میں ایسے ایسے طوفان آتے ہیں کہ قسمیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ خدا کے حضور توبہ کیجئے اور دعا کیجئے کہ خدا ہمیں اتنی ہمت دے کہ ہم ہر طوفان میں ایک دوسرے کو سہارا دے سکیں۔

میں باجی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ بات گہری سوچ سے کیا کرتی ہے۔ لڑکپن میں بھی اس کا دماغ نہایت پختہ اور عقلمندانہ باتیں سوچ لیا کرتا تھا۔ اس نے سنایا کہ خاوند نے اس کا ہاتھ پکڑ کر قرآن پر رکھ دیا اور کہا ——— "میں نے سچے دل سے قسم کھائی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ خدا کا پاک کلام مشکل کے وقت میری ضرور مدد کرے گا۔ تم بھی قسم کھاؤ ورنہ میں سمجھوں گا کہ تمہارے دل میں میری محبت نہیں ہے۔"

باجی نے بھی قسم کھالی ——— اور چھ سات سال بعد ایسا تیز و تند طوفان آیا کہ میاں بیوی کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ بڑی مضبوطی سے تھامے رکھا تھا مگر ہاتھ چھوٹنے لگے اور کلام پاک کی قسم ٹوٹنے لگی۔

اب میں آپ کو اسی طوفان اور طوفان کے بعد کی کہانی سناتی ہوں۔ یہ کہانی چار دیواری کی دنیا کا ایک سربستہ راز ہے۔ کون جانے چار دیواری کی دنیا میں ایسے کتنے ہی راز پوشیدہ ہیں اور کتنی ہی ازدواجی زندگیاں پیار و محبت کے باوجود تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔

شادی کے بعد میرا اور باجی کا پیار اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ ہمارے خاوند بھی ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ دونوں مختلف محکموں میں ملازم تھے۔ باجی نے میرے خاوند سے اور میں نے باجی کے خاوند سے پردہ ہٹا دیا تھا۔ شادی کے ایک سال بعد میرے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا۔ میں نے باجی سے پوچھا کہ تم پہلا بچہ کب پیدا کرو گی؟ اس نے ہنس کر کہا ——— "ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ دو چار سال ہنس کھیل لیں پھر دیکھی جائے گی۔"

دو سال بعد میرے ہاں دوسرا بچہ پیدا ہوا تو باجی اور اس کا خاوند تحفوں کا انبار لے کے پہنچے اور بہت ہی خوشی منائی۔ میں نے باجی سے پھر کہا ——— "معلوم ہوتا ہے تم میرا ساتھ نہیں دینا چاہتی" ——— اس نے دو سال پہلے کی طرح ہنس کر کہا ——— "ابھی نہیں" ——— اور وہ خوش باش رہی۔ وہ طبعاً خوش باش رہنے والی لڑکی تھی۔ اس کا خاوند اس پر جان چھڑکتا تھا بلکہ باجی نے اکثر کہا تھا کہ وہ مجھ سے بچوں کی طرح پیار کرتے ہیں جس سے میں کبھی کبھی پریشان بھی ہو جاتی ہوں۔ دراصل باجی جتنی شگفتہ مزاج تھی، اتنی ہی سنجیدہ اور متین تھی۔ وہ جذباتی ہوتے ہوئے بھی حقیقت پسند تھی۔

تین سال اور گزر گئے تو میرے ہاں بچی پیدا ہوئی۔ باجی آئی تو میں نے اسے پہلی بار اداس دیکھا۔ یہاں تک کہ بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے بتایا کہ جب اس کے گھر میری بچی کی پیدائش کی اطلاع پہنچی تو اس کی ساس نے ناک سکیڑ کر کہا ——— "یہ اس کا تیسرا بچہ ہے۔ ایک ہم ہیں کہ تھوہر کے پودے کے ناز نخرے برداشت کئے چلے جا رہے ہیں" ——— باجی کی شگفتہ مزاجی پر اداسی پڑ گئی اور وہ چپ چاپ کمرے میں چلی گئی۔ اسے باورچی خانے میں سے ساس کی دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسے یہ زہریلی آواز بھی سنائی دی ——— "ہمارے بھاگ کہاں جا پھوٹے۔ کیا پتہ تھا کہ اس بیدعلی ہوئی کلموئی کی کوکھ ہمیشہ سوکھی رہے گی۔"

شادی کا ساتواں سال شروع تھا۔ باجی کی کوکھ ابھی تک سوکھی تھی۔ پیدائش اور موت تو اللہ کے ہاتھ ہے مگر یہاں باجی مجرم بن گئی۔ یہیں سے وہ طوفان اٹھا جس

سے کلام پاک کی قسمیں ٹوٹنے لگیں۔ طوفان اچانک ہی اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی تندی اور تیزی بڑھ گئی۔ وہی باجی جسے ساس اور نندیں گھر کی رونق سمجھتی تھیں، ڈائن اور کلموئی ہوگئی۔ پہلے تو گھر کی عورتوں نے اس سے بے رخی برتی۔ پھر بول چال بند ہوئی اور پھر اسے طعنے دینے لگیں۔ باجی گھبرا کر میرے ہاں بھاگ آتی تھی اور اس پر جو گذر رہی تھی وہ مجھے سناتی اور دل کھول کر روتی تھی۔ ان آندھیوں میں اس کا واحد سہارا تو خدا ہی تھا۔ خدا کے بعد اس کا سہارا خاوند تھا جو تنہائی میں اس کی دل جوئی کر کے اس کے دل کے زخموں پر مرہم رکھ دیتا تھا۔

ایک روز محلے کی ایک عورت اس کے پاس آ بیٹھی اور اسے رازداری سے بتایا کہ اس کی ساس اور نندیں باجی کے خاوند کی دوسری شادی کی باتیں کر رہی ہیں بلکہ انہوں نے ایک گھرانے کی لڑکی کے متعلق فیصلہ بھی کر لیا ہے۔ اس خبر نے باجی کے پاؤں اکھاڑ دیے۔ اسی رات باجی نے اپنے خاوند سے ذکر کیا تو خاوند نے اسے بتایا —— "یہ پرانی خبر ہے جو تمہیں آج سنائی گئی ہے۔ مجھے چھ مہینوں سے ماں اور بہنیں دوسری شادی کے لئے اکسا رہی ہیں۔ پرسوں کی بات ہے کہ میں نے انہیں صاف کہہ دیا ہے کہ میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔ ان کے ساتھ اتنی جھک جھک ہوئی ہے کہ وہ مجھ سے ناراض ہوگئی ہیں" —— خاوند نے اسے کلام پاک کی قسم یاد دلا کر کہا —— "میں اپنی قسم کو کبھی نہیں بھولوں گا اور مجھے یقین ہے کہ کلام پاک ہماری مدد ضرور کرے گا۔"

مگر باجی کے سسرال میں تو جیسے اللہ اور اللہ کے پاک کلام کا احساس ہی مٹ گیا تھا۔ ایک روز میں باجی کے گھر گئی۔ وہ اپنے کمرے میں قید تھی۔ اس کی ساس مجھے الگ لے گئی اور باجی کے خلاف ایسے ایسے الزام سنائے کہ میں لرز گئی۔ میں جانتی تھی کہ باجی کا اصل جرم صرف یہ ہے کہ اس نے ابھی تک بچہ نہیں جنا لیکن اس کی ساس اصل بات پر پردہ ڈال کر یہاں تک کہ گئی کہ یہ بدکار ہے اور پیروں کی بددعائی ہوئی ہے۔ اس نے خاوند پر جادو کر رکھے ہیں۔ پرسوں ہمارے لڑکے نے ہماری بے عزتی کر

دی ہے اور ایسی بے شمار بیہودہ باتیں تھیں جو مجھے سننی پڑیں۔

میں باجی کے پاس گئی تو وہ رو رہی تھی کہنے لگی —— "سن آئی ہو؟" —— میرے آنسو نکل آئے۔ باجی کا چہرہ جو ہر وقت ہنستا کھیلتا اور کھلا ہوا رہتا تھا، بجھا ہوا تھا۔ مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے سسکیاں نکل رہی تھیں اور آنکھیں آنسو بہائے جا رہی تھیں۔ میں نے اسے تسلیاں دیں جو سب جھوٹی تھیں۔ میں اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ گھر میں اس کی حیثیت اچھوت کی سی ہوگئی ہے۔ اگر اس کا خاوند اس کا دردمند نہ ہوتا تو کبھی کی خودکشی کر چکی ہوتی۔ وہ صرف خاوند کے لیے زندہ تھی۔

میں نے اپنے خاوند سے بات کی تو اس نے باجی کے خاوند کے ساتھ اس مسئلے پر تبادلہ خیالات کیا۔ باجی کے خاوند نے اسے بتایا کہ وہ پختہ عزم کر چکا ہے کہ وہ باجی پر سوت نہیں لائے گا، نہ اسے طلاق دے گا خواہ اسے اپنے ماں باپ کو ہمیشہ کے لیے ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔ میں نے اور میرے خاوند نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ہمیں یقین تھا کہ یہ شخص اپنی قسم پر اپنی جان بھی قربان کر دے گا۔

باجی کو تو پریشان ہونا ہی تھا لیکن جو حالت اس کی بیوہ ماں کی ہوئی جا رہی تھی وہ دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس کی بیٹی کا سہاگ اجڑ رہا تھا۔ اسے کسی نے ایک خانقاہ کا پتہ بتایا اور کہا کہ وہاں ایک بکرا لے جا کر ذبح کرو اور خانقاہ کے گدّی نشین کو نذرانہ دو تو اولادِ نرینہ پیدا ہوگی۔ ماں نے بکرا خریدا اور بھاگی بھاگی اس خانقاہ پر جا پہنچی۔ بکرا ذبح کر کے گدّی نشین کے حضور پیش کیا اور بیس روپے نقد دے کر خانقاہ کی دہلیز پر ماتھا رگڑا اور گدّی نشین کے پاؤں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ وہاں سے اسے تعویذ ملے اور یہ ہدایت کہ ایک اپنی بیٹی کو پانی میں گھول کر پلاؤ اور دوسرا اپنے داماد کو پلاؤ۔

کسی نے اسے بتایا کہ جامع مسجد کے خطیب صاحب اولاد کے لیے تعویذ دیتے ہیں۔ ماں بے چاری ان کے ہاں بھی گئی اور تعویذ لے آئی۔ خطیب صاحب نے کہا کہ مراد کے

آثار ظاہر ہونے تک لڑکی ہر جمعرات کی شام ایک تعویذ پانی میں گھول کر پیئے۔

محلّے کی مسجد کے پیش امام صاحب کو معلوم نہیں کس طرح باجی کی ماں کی پریشانی کا علم ہو گیا۔ ایک روز وہ اس کے گھر چلے گئے اور ماں سے ساری کہانی سنی۔ امام صاحب نے انہیں یقین دلایا کہ وہ اس کی مراد پوری کرنے کے لیے چلّہ کریں گے۔ انہوں نے اسی رات چلّہ شروع کر دیا اور ماں توفیق سے بڑھ کر ان کی خاطر و مدارات کرنے لگی۔ بے بس ماں اپنی بیٹی کے سہاگ کی خاطر ہر جتن کر رہی تھی اور روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہا رہی تھی۔

باجی اور اس کے خاوند نے ڈاکٹری معائنہ کروایا اور دوائیوں کا استعمال بھی شروع کر دیا۔ یہ دوائیوں کا اثر تھا یا دعاؤں کا کہ ایک روز باجی نے مجھے خوشخبری سنائی۔ اس کا چہرہ جو اداسیوں سے پیلا پڑ گیا تھا پھر کھل اٹھا۔ مراد پوری ہونے کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے مگر ایک مہینے بعد اطلاع ملی کہ باجی کو رات ہسپتال اٹھا لے گئے ہیں۔ آثار ایسے زائل ہوئے کہ باجی کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ اللہ نے کرم کیا کہ باجی کی جان بچ گئی مگر گھر میں اس کا جینا محال ہو گیا۔ اس کی ساس اور نندوں نے کہا — "کمبخت آسیب زدہ ہے" — شادی شدہ لڑکیوں کو اس کے پاس بیٹھنے سے منع کر دیا گیا۔ انہیں بتایا گیا کہ باجی کا سایہ منحوس ہے جس پر اس کا سایہ پڑ گیا اسے کبھی بچّہ پیدا نہیں ہو گا۔

ممکن ہے بعض خواتین و حضرات کو یہ عجیب لگے لیکن چار دیواری کے اندر اس سے بھی زیادہ بے بنیاد توہمات کو برحق مانا جاتا ہے ~~سائے والی عورت کو بہت ہی خطرناک~~ سمجھا جاتا ہے۔ اسے سہاگنوں میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ شاید اس قسم کے توہمات ہندوؤں سے مسلمانوں کے گھروں میں آ گئے ہیں۔ باجی کو بھی سائے والی عورت قرار دے دیا گیا۔ عورتوں نے مجھے بھی اس سے ملنے سے روکا لیکن میں باز نہ آئی۔ ہماری محبت ایسے توہمات سے متاثر ہونے والی نہیں تھی۔

باجی کے خاوند پر دوسری شادی کے لیے اس قدر دباؤ ڈالا گیا کہ گھر سے بھاگ جانے کے سوا اس کے سامنے اس مسئلے کا کوئی حل نہ رہا۔ اس نے باجی کو اس جہنّم سے نکالنے کے لئے اسے اس کی ماں کے پاس بھیج دیا اور خود اس کوشش میں مصروف ہو گیا کہ اپنے شہر سے بہت دور تبدیلی ہو جائے۔ اس کی کوشش میں میرا خاوند بھی شریک

تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ مغربی پاکستان کو ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ ون یونٹ بن جانے سے پشاور اور کراچی تک تبدیلی کا امکان پیدا ہو گیا۔ باجی کے خاوند کی تبدیلی کراچی ہو گئی۔ جب وہ جانے لگا تو اس کی ماں اور بہنوں نے اس بات پر اس کا ناک میں دم کر دیا کہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جائے مگر اس نے ایک نہ سنی اور باجی کو ساتھ لے گیا۔

کراچی سے باجی کا پہلا خط آیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ انہیں سرکاری کوارٹر مل گیا ہے جس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ساس اور نندوں کی گھرکیاں اور طعنے نہیں۔ ایک مدّت بعد گھر کی چار دیواری میں سکون اور اطمینان محسوس ہوا ہے۔ باجی نے آخر میں لکھا کہ یہ سکون عارضی ہے۔ ہم کب تک کراچی میں رہیں گے۔ آخر اسی جہنّم میں جانا ہے جو میرے خاوند کا گھر ہے۔ اس نے اپنے خاوند کے متعلق لکھا کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہمارے ہاں بچّہ پیدا نہ ہوا تو ہم ہمیشہ کراچی میں رہیں گے۔ ماں باپ کے گھر کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیں گے۔ باجی نے خاوند کے ایثار کے متعلق لکھا تھا کہ میں خودکشی کر لوں گی لیکن خاوند کو یوں جلاوطن نہیں ہونے دوں گی۔ اب تو میں نے بھی انہیں کہہ دیا ہے کہ وہ اولاد کی خاطر دوسری شادی کر لیں لیکن وہ دو دن مجھ سے ناراض رہے۔ بڑی مشکل سے انہیں منایا ہے۔ وہ میرے منہ سے ایسی بات نہیں سننا چاہتے۔

باجی کی ماں کا یہ حال تھا کہ درگاہوں، پیروں فقیروں کے آستانوں اور مسجدوں کے چکر کاٹ کاٹ کر ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ کسی نے جو ٹونہ ٹوٹکا بتا دیا وہ پورا کر دیتی تھی۔ ہمارے گھر اکثر آتی اور بہت روتی تھی۔ میں نے بھی اپنی عزیز سہیلی کے لیے ختمِ قرآن کرایا تھا اور ہر نماز کے بعد اس کے لیے دعا کرتی تھی۔ صرف یہی ایک حقیقت مجھے یقین دلاتی تھی کہ باجی اس طوفان سے صاف نکل آئے گی کہ اس کے خاوند نے کلامِ پاک کی قسم توڑی نہیں تھی۔ مجھے اللہ کے کلام پر پورا پورا بھروسہ تھا۔

مجھے باجی کی ساس اور نندوں کی سرگرمیوں کا علم ہوتا رہا۔ وہ اپنے بیٹے کی شادی

کی تیاریاں جوش و خروش سے کر رہی تھیں۔ انہوں نے لڑکی کے ماں باپ کو یقین دلا رکھا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ان کی بیٹی کے ساتھ ضرور بیاہیں گے۔ باجی کی ماں کو یہ خبریں ادھ موا کر رہی تھیں۔ کراچی سے باجی کے خط باقاعدگی سے آ رہے تھے۔ وہ مجھے لکھتی تھی کہ اس کی ساس اپنے بیٹے کو خطوں کے ذریعے دوسری شادی کے لیے قائل کرا رہی ہے۔

پھر یہ بھی پتہ چلا کہ باجی کی ساس نے ایک عامل سے اپنے بیٹے پر جادو کروایا ہے۔

سچی بات ہے کہ ہم کالے علم اور جادو کو سچ مانا کرتی تھیں۔ بڑے بھیانک قصے سننے میں آیا کرتے تھے۔ یہ تو بالکل سچ ہے کہ ہمارے ہاں ایسے عامل موجود ہیں جو منہ مانگے پیسے لے کر کالے علم کے ذریعے دشمن کو نقصان پہنچانے کا عمل کرتے ہیں۔ ایسے عامل حاجت مند عورتوں سے خوب پیسے بٹورتے ہیں۔ جب ہم نے سنا کہ باجی کی ساس نے جادو کروایا ہے تو میری امی نے ہاتھ مل کر کہا ـــــ "ہائے، اب نگوڑی کی قسمت پھوٹی، جادو کے زور سے تو بڑے بڑے شاہ زور مرد گھٹنے ٹیک دیتے ہیں" ـــــ میرا دل بھی ڈر سے دھک دھک کرنے لگا۔ میرے پاس کالے علم اور جادو کو بیکار کرنے کا صرف ایک ہی نسخہ تھا، وہ تھا قرآنِ کریم اور عبادت۔ میں نے قرآن کی تلاوت اور نفل شروع کر دیے اور خدا سے دعا مانگنے لگی کہ خدائے ذوالجلال دنیا کے سارے جادوؤں کو صرف تیری ذات بیکار کر سکتی ہے۔ میں بعض اوقات دعا مانگتے مانگتے رو پڑتی تھی اور خدا سے کہتی تھی کہ تیرے ان دو ناچیز اور بے بس بندوں نے تیرے پاک کلام کی قسم کھائی تھی کہ وہ شر اور فتنے کے طوفانوں میں ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ آج ان کی قسمیں ٹوٹ رہی ہیں۔ میرے اللہ، اپنے کلام کی لاج رکھ لے۔

پورا ایک سال گذر گیا۔ یہ سال میرے لیے، باجی، باجی کی ماں اور باجی کے خاوند کے لیے تکلیف دہ سال تھا۔ ہر لمحہ دل پر عجیب سا خوف سوار رہتا تھا۔ باجی کے خط آتے رہتے تھے جن میں وہ اطمینان اور سکون کا اظہار کرتی تھی لیکن اس خدشے کا اظہار بھی ضرور ہوتا تھا کہ خدا جانے کل کیا ہو جائے۔

پھر ایک دن اَن ہونی بات ہو گئی۔ جیسے آسمان کے سارے ہی ستارے ٹوٹ کر

ذہن پر بکھر گئے ہوں۔ کسی نے بتایا کہ باجی کے خاوند کا تار آیا ہے کہ باجی کے لڑکا پیدا ہوا ہے۔ کسی پہلو قابلِ یقین خبر نہیں تھی۔ باجی نے مجھ سے تو کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ اس نے مجھے پہلے کیوں نہ لکھا کہ اسے بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ شاید وہ مجھے یہ خبر اچانک سنا کر حیران کرنا چاہتی ہو گی۔ میں اس کے سسرال کے گھر گئی تو وہاں شادی کا سماں بندھا ہوا تھا۔ میں نے باجی کی ساس سے تار لے کر خود پڑھا تو انگریزی میں لکھا تھا "مبارک ہو، لڑکا پیدا ہوا ہے" ـــــ میں نے ساس اور نندوں کو مبارک دی تو ساس بولی ـــ "میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں ہے اتنی سگھڑ اور بھاگوان لڑکی ہے۔ ایسی لڑکیاں قسمت والوں کو ملتی ہیں" ـــــ باجی جو ڈائن کلموئی، سائے والی اور منحوس تھی، سگھڑ اور بھاگوان بن گئی۔

باجی کی نندوں کا تو یہ حال تھا کہ زچگی میں باجی کی خدمت کرنے کے لیے بیقرار ہوئی جا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے بھائی کو مبارک کا تار دے کر خط لکھ دیا تھا کہ وہ کراچی آنا چاہتی ہیں۔ ہمیں فوراً لکھو کہ ہم کب آئیں۔ پانچویں روز باجی کے خاوند کا جواب آ گیا۔ اس نے لکھا کہ ماں اور بچہ بالکل تندرست ہیں اور کسی کے آنے کی ضرورت نہیں۔ بچہ ہسپتال میں پیدا ہوا ہے۔ دو روز بعد ماں اور بچہ ہسپتال سے آ جائیں گے۔ گھر میں نوکر ہے جو ہانڈی روٹی کر لیتا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ ڈیڑھ ایک مہینے بعد چھٹی لے کے آ رہا ہے۔

باجی کی ماں کی مراد پوری ہو گئی مگر اسے یہ منت بقیمت ادا کرنی پڑی۔ مسجد کے امام صاحب نے کہا کہ یہ میرے چلے کا کرشمہ ہے۔ وہ پچیس روپے نقد اور شلوار قمیض کا کپڑا لے کے ٹلے۔ تعویذ دینے والے پیروں فقیروں اور ٹونے ٹوٹکے بتانے والوں نے اس سے بھی زیادہ قیمت وصول کی۔ ہر کوئی اسے اپنی کرامات ثابت کر رہا تھا۔ باجی کی ماں ہر اُس درگاہ اور خانقاہ پر شکرانے کا سجدہ کرنے گئی، جہاں وہ اپنی بیٹی کے سہاگ کے لیے جا کر روتی رہتی تھی۔ اس نے مجاوروں اور گدی نشینوں کو قرض لے لے کر نذرانے دیے۔

میں نے باجی کو مبارک باد کا خط لکھا اور یہ گلہ بھی لکھا کہ اس نے یہ راز کیوں چھپائے رکھا تھا۔ باجی نے خوشیوں سے بھرپور خط لکھا اور میرے گلے کا وہی جواب دیا جو میں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ وہ مجھے اچانک یہ خبر سنا کر حیران کرنا چاہتی تھی۔ بہرحال میری عزیز ترین سہیلی بڑے ہی خوفناک طوفان سے صاف نکل آئی تھی۔ خدا نے میری دعا قبول کر لی تھی۔

دو مہینے بعد باجی آگئی۔ وہ گھر پہنچی تو تھوڑی دیر بعد میں اسے ملنے گئی۔ وہی ساس وہی نندیں جو اس کے نام سے بیزار تھیں، اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔ محلے کی عورتیں بھی ہجوم کرکے آگئی تھیں۔ ساس انہیں سنا رہی تھی کہ میں نے اس کی گود ہری کرنے کے لیے جو جتن کیے ہیں، وہ کسی کو معلوم ہی نہیں۔ کوئی خانقاہ اور کوئی پیر نہیں چھوڑا۔ جس نے جو نذرانہ مانگا اس سے دگنا اس کی جھولی میں ڈال دیا۔ اتنا تو کوئی اپنی سگی بیٹی کے لیے بھی نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ ساری عورتیں گواہ تھیں کہ ساس نے میری سہیلی کا سہاگ اجاڑنے کے لیے زمین و آسمان ایک کردیے تھے۔ اس کی زبان پر یہی ایک اعلان تھا کہ اپنے بیٹے کی دوسری شادی کروں گی۔ بہرحال مجھے خوشی اسی بات پر تھی کہ میری سہیلی کا سہاگ بال بال بچ گیا تھا۔

اس کا گول مٹول سا بچہ بڑا ہی پیارا تھا۔ میں نے اس پیارے سے کھلونے کو ہاتھوں پر اٹھایا تو وہ رونے لگا۔ باجی اچک کر اٹھی اور بوتل میں دودھ لے آئی۔ میں نے اسے کہا ــــ "بوتل سے کیوں دودھ پلاتی ہو؟ پہلے ہی بچے کی پیدائش سے دودھ سوکھ گیا ہے؟" ــــ اس نے کہا "ڈاکٹر نے میرے خون کا معائنہ کرکے کہا تھا کہ بچے کو دودھ بوتل سے پلانا۔"

چار پانچ روز بعد میں نے باجی اور اس کے خاوند کو شام کے کھانے پر مدعو کیا۔ ہم سب نے کھانا تو اکٹھے کھایا لیکن کھانے کے بعد دونوں خاوند الگ کمرے میں جا بیٹھے۔ میرے بچے باجی کے بچے کو اٹھالے گئے اور ہم دونوں سہیلیاں دوسرے کمرے میں جا بیٹھیں۔ ہمیں پورے ایک سال کی باتیں سننی اور سنانی تھیں۔ میرے دل میں اتنی

باتیں بھری ہوئی تھیں کہ میں پریشان ہوگئی کہ کون سی بات پہلے سناؤں۔ میں نے باجی سے بچے کے متعلق پوچھا کہ یہ معجزہ کس طرح رونما ہوا ہے۔ مجھے توقع تھی کہ باجی یہی کچھ کہے گی کہ اللہ نے کرم کیا مگر اس نے سر جھکا لیا۔ وہ کتنی ہی دیر خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا سر اوپر کیا تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے کیونکہ باجی کے آنسو بہ رہے تھے۔ اس نے دھیمی سی آواز میں کہا ــــ "یہ بچہ ہمارا نہیں۔ یہ ایک مری ہوئی ماں کا بچہ ہے۔ میں تمہیں اس راز میں شریک کرنا چاہتی ہوں۔ یہ راز میری روح میں کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے۔ مجھے یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ تم یہ راز اپنے سینے میں ہی رکھو گی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ہم ہمراز سہیلیاں تھیں۔ اس نے اس قدر بھیانک راز مجھے بتا کر غلطی نہیں کی تھی۔ اس نے جو کہانی سنائی وہ اس طرح ہے کہ کراچی میں باجی اور اس کے خاوند نے کئی ایک ڈاکٹروں اور لیڈی ڈاکٹروں سے معائنہ کرایا۔ علاج بھی کرایا۔ آخر تین ڈاکٹروں نے متفقہ رائے دے دی کہ باجی کی گود کبھی ہری نہ ہوگی۔ اس کا انجام میاں بیوی کو صاف نظر آرہا تھا۔ باجی کی قسمت میں سوت یا طلاق لکھی گئی تھی لیکن اس کے خاوند نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ عمر بھر کے لیے کراچی میں سکونت اختیار کرلیں گے۔ ان کے پیار کا تقاضا یہی تھا۔ خاوند نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ تمہاری محبت اور اپنی قسم پر جان تک قربان کردوں گا۔

باجی کے خاوند کے دفتر میں ایک چپراسی تھا جو دمے کا مریض تھا۔ وہ جے پور (ہندوستان) کا مہاجر تھا اور کراچی میں ایک جھگی میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا کوئی اور رشتہ دار نہیں تھا۔ میاں بیوی اکیلے تھے۔ باجی کا خاوند ملنسار اور نیک آدمی ہے۔ اس نے ایک روز اس چپراسی سے کہا کہ وہ کسی اچھے سے ڈاکٹر سے دمے کا علاج کرائے ورنہ مرض پرانا ہو کر لا علاج ہو جائے گا۔ چپراسی کے آنسو نکل آئے۔ اس نے بتایا کہ اس کی تنخواہ اس قدر قلیل ہے کہ بڑی مشکل سے میاں بیوی دو وقت کی روٹی کھاتے ہیں۔ بیوی کو بچہ ہونے والا ہے لیکن وہ بہت کمزور ہے۔ ڈاکٹروں نے خون کی کمی بتائی ہے۔ انہوں نے جو دوائیاں لکھ کر دی ہیں وہ بہت

مہنگی ہیں۔ اب یہ حال ہے کہ نہ خاوند کا علاج ہو رہا تھا نہ بیوی کا۔ بچے کی پیدائش میں ابھی کئی مہینے باقی تھے۔

باجی کے خاوند نے چپراسی کا علاج اپنے ذمے لے لیا اور اسے دوائیوں کے لئے پیسے دینے لگا۔ دو مہینے علاج ہوتا رہا مگر اسے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ مرض بہت پرانا ہو چکا تھا۔ پھر بھی باجی کا خاوند اسے دوائیوں کے لیئے پیسے دیتا رہا۔ دو مہینے گزر گئے۔ کوئی افاقہ نہ ہوا۔ باجی کا خاوند ڈاکٹر سے ملا اور اسے کہا کہ مریض کی طرف پوری توجہ دے، یہ ٹھیک کیوں نہیں ہوتا؟ ڈاکٹر نے کہا کہ یہ شخص سگریٹ، حقہ یا بیڑیاں پیتا ہوگا۔ چپراسی نے قسم کھائی کہ وہ تمباکو نوشی کا عادی نہیں۔ باجی کا خاوند ایک دن اس کے گھر چلا گیا تاکہ اس کی بیوی سے پوچھے کہ اس کا خاوند تمباکو نوشی کا عادی ہے یا نہیں۔

اس کی بیوی کو اس نے بتایا کہ اس کے خاوند کا علاج ہو رہا ہے لیکن وہ ٹھیک نہیں ہو رہا۔ چار مہینوں سے وہ دوائی لے رہا ہے۔ چپراسی کی بیوی نے حیران ہو کے کہا کہ یہ اپنی دوائی تو کبھی بھی نہیں لایا نہ میں نے اسے دوائی کھاتے دیکھا ہے۔ یہ تو میرے لیے دوائیاں لاتا اور مجھے کھلاتا ہے۔ چپراسی نے باجی کے خاوند کو بتا دیا کہ وہ اس سے اپنے علاج کے لیے پیسے لے کر ڈاکٹر سے اپنے لیے نسخہ لکھواتا تھا۔ لیکن ایک اور ڈاکٹر سے اس نے اپنی بیوی کے لیے نسخہ لکھوا لیا تھا۔ چنانچہ وہ باجی کے خاوند سے اپنے علاج کے لیے جو پیسے لیتا تھا ان سے وہ اپنی بیوی کے لیے دوائیاں لے جاتا تھا۔

باجی کا خاوند اتنا امیر نہیں تھا کہ دونوں کا علاج کراتا۔ اسے چپراسی کے ایثار نے بہت متاثر کیا لیکن اسے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ اتنی دوائیاں کھانے کے باوجود بیوی کا رنگ لاش کی طرح سفید تھا اور وہ بہت کمزور تھی۔ باجی کا خاوند انہیں یہ کہہ کر چلا آیا کہ میں تم لوگوں کو پیسے دیتا رہوں گا۔ ان سے تم میں سے کسی ایک کا بھی علاج ہو گیا تو مجھے خوشی ہوگی۔

وہ میاں بیوی کو پچاس روپے ماہوار دیتا رہا۔ چار مہینوں سے علاج ہو رہا تھا جس کوئی اثر نہ ہوا۔ تین مہینے اور گزر گئے۔ وہ انہیں پچاس روپے دیتا رہا۔ ان تین مہینوں میں چپراسی کی بیماری اتنی بڑھ گئی کہ وہ نوکری کے قابل نہ رہا اور اس کی نوکری ختم ہو گئی۔ اب اس کے پھیپھڑے بالکل ہی بند ہو چلے تھے۔ باجی کا خاوند کبھی کبھی ان کی جھگی میں چلا جاتا، انہیں دیکھ آتا اور پیسے دے آتا۔

ایک روز، جب باجی اور اس کے خاوند کو کراچی میں ایک سال پورا ہو گیا تھا۔ باجی کا خاوند چپراسی کی جھگی میں گیا۔ دیکھا کہ چپراسی دمے کے دورے سے نیم غشی کی حالت میں فرش پر پڑا تھا اور بیوی پیدائش کے وقت کے دردوں سے تڑپ رہی تھی۔ باجی کا خاوند گھبرا گیا۔ چپراسی نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور رکی ہوئی سانسوں کو بڑی مشکل سے رواں کر کے کہا — "آج ہمارا بچہ پیدا ہوگا۔ اس سے پہلے ہمارے دو بچے مر چکے ہیں۔ یہ بچہ پیدا ہوگا تو مجھے یقین ہے کہ میری بیوی بھی مر جائے گی۔ اب میرا زندہ رہنا بھی محال ہے۔ آپ ہمارے لیے فرشتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ آپ کی نیکیاں ہماری جان نہ بچا سکیں۔ آپ آخری نیکی کریں۔ جب ہمارا بچہ پیدا ہو تو اسے آپ اٹھا لے جائیں اور اسے کسی یتیم خانے کے حوالے کر دیں۔ بچہ زندہ رہنا چاہیئے۔ ہماری روحیں بھی آپ کو دعائیں دیتی رہیں گی۔"

بعد میں جب باجی کے خاوند نے اپنی زبان سے مجھے اور میرے خاوند کو اس وقت کی کہانی سنائی تو میں ڈر گئی۔ وہ کہتا ہے کہ جھگی کے اندر کا منظر اتنا ہولناک تھا کہ میں نے بھاگ جانے کی ٹھان لی۔ ایک انسان پیدا ہو رہا تھا اور دو انسان مر رہے تھے۔ چپراسی کی بیوی کی چیخیں اس طرح ڈراتی تھیں، جیسے گھپ اندھیری رات میں بد روحیں چیخ رہی ہوں۔ کراچی کی دنیا میں نفسا نفسی کا عالم طاری رہتا ہے۔ پڑوسی کو پڑوسی کی خبر نہیں ہوتی۔ چپراسی کی جھگی کے قریب چند اور جھگیاں بھی تھیں۔ یہ جھگیاں تین منزلہ فلیٹوں کے پچھواڑے میں تھیں۔ فلیٹوں میں بھی انسان ہی رہتے تھے۔ جو آرام اور چین کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان تین منزلہ عمارتوں کے سائے میں دو انسان بھوکے پیاسے مر رہے تھے اور کسی کو خبر نہیں تھی۔

باجی کا خاوند دوسری جھگیوں میں گیا اور وہاں کے رہنے والوں کو جو اسی
اور اس کی بیوی کے متعلق بتایا۔ وہاں سے دو عورتیں آ گئیں۔ باجی کا خاوند باہر
کھڑا رہا اور عورتیں اندر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد اسے بتایا گیا کہ بچہ پیدا ہوا ہے اور
بچے کی ماں مر گئی ہے۔ اسے مرنا ہی تھا۔ جسم میں خون تھا ہی نہیں۔ جھگیوں کی
چند اور عورتیں آ گئیں۔ دو تین بوڑھے بھی آ گئے۔ تمام جوان سال مرد محنت
مزدوری کے لیے گئے ہوئے تھے۔ بچے کو سنبھالنے اور بچے کی ماں کے کفن دفن
کا مسئلہ پیش آ گیا۔ اتنے میں باہر اطلاع آئی کہ بچے کا باپ بھی مر گیا ہے۔ ایک تو
دمے کا مرض عروج پر تھا، اس کے ساتھ بیوی کے مرنے کا صدمہ مریض کی موت
کا باعث بنا۔

باجی کے خاوند نے جھگیوں والوں سے کہا کہ بچے کو وہ لے جائے گا۔ ان
لوگوں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے جھگیوں والوں سے یہ بھی کہا کہ اسے ایک
عورت کی بھی ضرورت ہے جو بچے کو سنبھال سکے۔ جھگیوں والے تو اسی انتظار میں
رہتے تھے کہ کہیں محنت مزدوری مل جائے۔ ایک عورت تیار ہو گئی اور اس کی
تنخواہ بھی طے ہو گئی۔ اس عورت نے بچہ اٹھا لیا اور باجی کا خاوند اسے اپنے گھر
لے آیا۔ اس نے باجی سے کہا کہ یہ لو خدا نے اپنے کلام کی اور میری قسم کی لاج رکھ
لی ہے، اس نے باجی کو ساری بات کہہ سنائی۔ پھر وہ گھر سے پیسے لے کر جھگیوں میں چلا
گیا اور ایک بوڑھے سے کفن دفن کا حساب کروا کے پیسے اس کے ہاتھ میں ڈال
دیے اور تجہیز و تکفین کا بندوبست کر دیا۔

دوسرے دن باجی کے خاوند نے گھر تار دے دیا کہ مبارک ہو بچہ پیدا ہوا ہے۔
ملازمہ نے دو مہینوں میں باجی کو بچے کی دیکھ بھال سکھا دی اور میاں بیوی بچے کو
گھر لے آئے۔ یہ وہی گھر تھا جہاں سے باجی کلموئی اور ڈائن کے روپ میں نکلی اور
کراچی گئی تھی، اب اس گھر میں وہ شہزادی بن گئی تھی۔ اس کا سہاگ ہرا ہو گیا تھا۔
باجی نے مجھے یہ ساری بات سنا کر کہا ـــــ "میرے سہاگ کو دو انسانوں نے جانیں دے
کر ہرا کیا ہے۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔" ـــــ مگر میں کہ امام صاحب، پیر فقیر

اور ٹونہ ٹوٹکا کرنے والے اسے اپنی اپنی کرامات کہہ رہے تھے۔

بچہ جو جھگی میں پیدا ہوا تھا، چودہ سال کی عمر میں شہزادہ لگتا ہے۔ ماں باپ
کا اکلوتا لڑکا ہے۔ باجی اسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ میں نے اور
میرے خاوند نے باجی اور اس کے خاوند کو یقین دلا دیا تھا کہ یہ تمہارا ہی بچہ ہے۔ اسے
تم نے زندگی دی ہے۔ اسے خدا نے تمہاری گود میں ڈالا ہے۔ تم وہاں نہ ہوتے
تو یہ ماں باپ کے ساتھ ہی مر جاتا۔

دو سال ہوئے باجی کی ساس مر گئی ہے اور سسر بھی۔ ہم چار انسانوں نے
یہ راز چودہ سال اپنے سینوں میں چھپائے رکھا ہے۔ باجی اور اس کا خاوند، میں
اور میرا خاوند ـــــ ایک روز میرا خاوند "حکایت" کا پرچہ لایا۔ کہنے لگا کہ یہ ہمارے
مانوس ایڈیٹروں کا اپنا پرچہ ہے۔ یہ "حکایت" کا جنگِ ستمبر نمبر تھا۔ میری نظر سب
سے پہلے "میں کسی کی بیٹی نہیں" کے عنوان پر پڑی۔ میں نے کہانی پڑھی تو دل میں
ایسا ابال آیا کہ میرے سامنے باجی کی ساری کہانی آ گئی۔ گو باجی کی کہانی گمنام خاتون
کی کہانی سے مختلف ہے لیکن اس میں معاشرے کی چند ایک خرابیوں کو بیان کیا گیا
تھا۔ میں نے "حکایت" کے ایک صفحے پر "چار دیواری کی دنیا" کے عنوان کے
تحت سچی کہانیاں لکھنے کی دعوت پڑھی تو جی میں آئی کہ کیوں نہ باجی کی کہانی لکھ
ڈالوں۔ گمنام خاتون نے چار دیواری کے باہر کی دنیا کا راز فاش کیا ہے۔ کیوں
نہ میں چار دیواری کے اندر کی دنیا کا بھید کھول دوں۔

میں نے اپنے خاوند سے بات کی۔ انہوں نے باجی کے خاوند سے بات کی۔ ہم
چاروں نے میٹنگ کی اور فیصلہ ہوا کہ اب یہ راز لوگوں کو سنا ہی دیا جائے۔ شاید
کسی کے دل میں ان لڑکیوں کے لیے رحم پیدا ہو جائے جنہیں صرف اس لیے
طلاق دے دی جاتی ہے یا ان پر سوت لائی جاتی ہے کہ قدرت نے انہیں بچہ
پیدا کرنے کی صلاحیت عطا نہیں کی۔

کیا میں بے غیرت ہوں ؟

محمد ناظر

میرے نانا نے اپنے آپ کو شکاری بندوق سے گولی مار کر خودکشی کر لی تھی اور یہ کہانی مجھے نانی نے سنائی تھی۔

یہ واردات پاکستان بننے سے دس سال پہلے کی ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ تو بہت پرانی کہانی ہے مگر جناب! ہم نے اس کہانی کو پرانا نہیں ہونے دیا۔ دیہات میں آکر دیکھیے۔ ہم عملی طور پر ابھی تک اس کہانی کو دہرائے چلے جا رہے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کتنے سو سال پرانا ڈرامہ ہے جو ابھی تک کھیلا جا رہا ہے۔ اس میں صرف یہ تبدیلی آتی ہے کہ ایکٹر بدلتے رہتے ہیں۔

کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے کہ مشرقی پنجاب (بھارت) میں دو گاؤں تھے جن کا درمیانی فاصلہ ایک میل تھا۔ دونوں گاؤں میں مسلمانوں کی دوسری ذاتوں کے چند ایک گھرانے بھی تھے لیکن زیادہ تر آبادی مسلمان راجپوتوں کی تھی۔ یہ اس علاقے کے "حاکموں" کی قوم تھی جن کی ہر بات اونچی اور ناک تو بہت ہی اونچی تھی۔ ان کے ہاں عزت اور آبرو جسے ناک کہتے ہیں کا تصور کچھ اور ہی تھا۔ ذرا ذرا بات پر لڑائی جھگڑا کرنا، قتل کرنا، گرفتار ہونا، قید ہونا، بیٹیوں کو بیاہ کر ایسے حالات پیدا کرنا کہ بیٹی طلاق لے کر گھر آ بیٹھے اور طلاق لینے اور دینے کو باعزت حرکت سمجھنا اور کوئی انگریز پرندوں کے شکار کے لیے گاؤں کے قریب سے گزرے تو اس کے آگے بچھ بچھ جانا ان مسلمان راجپوتوں کے ہاں بڑی اونچی باتیں سمجھی جاتی تھیں۔

ان کی اولاد کی شادیاں کسی دوسری ذات سے نہیں ہو سکتی تھیں خواہ وہ ذات کتنی ہی اونچی کیوں نہ ہو۔ بعض اوقات لڑکوں کی کمی کی وجہ سے لڑکیاں بن بیاہی بوڑھی ہو جاتی تھیں اور ایسا تو کئی بار ہوتا تھا کہ دولہا کی عمر بارہ سال ہے اور دُلہن کی اٹھارہ سال اور ایسا بھی ہوا ہے کہ دلہن دس سال کی ہے اور دولہا بیس سال کا۔

شادی کے بعد لڑکی کے باپ کا اپنے داماد کے گھر جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق باپ کے لیے بیٹی کے گھر کی روٹی حرام ہوتی ہے، اور ایسے ہی بہت سے رسم و رواج تھے جو ان لوگوں نے اپنے اردگرد زنجیروں کی طرح لپیٹ رکھے تھے۔ ان رسم و رواج کے نتیجے میں ناچاقیاں پیدا ہوتی تھیں۔ میاں بیوی کے والدین مل بیٹھ کر جھگڑے طے کرنے کو توہین سمجھتے تھے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر اپنی اولاد کی ازدواجی زندگی تباہ کر دیا کرتے تھے۔ ایسے ہی گھریلو جھگڑے بات کا بتنگڑ بن کر خون خرابے کا باعث بنتے تھے اور یہ بتنگڑ قتل اور پھانسی کے تختے پر جا کر بھی ختم نہیں ہوتے تھے بلکہ یہ سلسلہ ان کے پسماندگان آگے چلاتے تھے جو وہ آنے والی نسل کو ورثے کے طور پر دے جایا کرتے تھے۔

۱۹۳۶ میں ایسی ہی ایک شادی ہوئی۔ لڑکی ایک گاؤں کی اور لڑکا دوسرے گاؤں کا تھا۔ راجپوتوں نے خزانوں کے منہ کھول دیئے۔ پیسے کی کمی زمین بیچ کر پوری کی۔ لڑکی کا جہیز تین بیل گاڑیوں پر لد کر گیا۔ دونوں اطراف کا زیور ستر تولے سونا تھا جو اُس زمانے میں بے حد زیادہ تھا۔

لڑکی کی ڈولی چلی گئی۔ تیسرے روز لڑکی واپس آ گئی۔ دو روز بعد دُولہا دُلہن کو لینے آیا تو ساتھ خالی ڈولی لیتا آیا۔ چار کہار ساتھ تھے۔ وہ خود گھوڑے پر سوار تھا۔ لڑکی کے سسرال نے شاید ڈولی بھیج کر لڑکی والوں کی عزت افزائی کی تھی لیکن لڑکی کے باپ کو ڈولی اچھی نہ لگی۔ اس نے اپنے داماد سے کہا کہ لڑکی ایک ہی بار ڈولی میں جایا کرتی ہے ـــــ "میں اپنی بیٹی کو دوبارہ ڈولی میں نہیں بٹھاؤں گا، لوگ کہیں گے کہ چوہدری کی بیٹی دوبارہ ڈولی میں بیٹھی ہے۔"

داماد نے کہا ــــ "چچا جی! ڈولی لے جانے والا تو ایک ہی آدمی ہے۔ اللہ نہ کرے لڑکی کا پہلا خاوند مر تو نہیں گیا کہ وہ دوسرے خاوند کے ساتھ ڈولی میں جا رہی ہے۔ میں ڈولی اس لیے لایا ہوں کہ آپ کی بیٹی آرام سے جائے گی۔ دھوپ بھی تو بہت تیز ہوتی ہے۔"

لڑکی کا باپ نہ مانا۔ اس نے کہا ــــ "لڑکی میری گھوڑی پر جائے گی اور تم اپنی گھوڑی پر سوار نہیں ہو گے۔ پیدل ساتھ جاؤ گے۔"

داماد کی رگوں میں بھی انہی راجپوتوں کا خون تھا۔ اس نے کہا ــــ "اگر آپ اپنی بیٹی کو ڈولی میں بھیجنے کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ میرے ماں باپ اسے اپنی بے عزتی سمجھیں کہ لڑکی کو ڈولی میں نہیں بھیجا گیا۔ ڈولی میں تو نہیں لایا یہ انہوں نے بھیجی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ میں پیدل نہیں جاؤں گا۔ لڑکی کو ساتھ لے کر اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر گاؤں سے نکلوں گا۔"

معاملہ بگڑ گیا اور داماد خالی ڈولی لے کے چلا گیا۔ لڑکی کے سسرال بھی راجپوت تھے۔ وہ بھلا اس بے عزّتی کو کیسے برداشت کر لیتے کہ ان کا بیٹا خالی ہاتھ واپس آ گیا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک مزارع کی زبانی پیغام بھیجا کہ لڑکی آئے گی تو ڈولی میں آئے گی ورنہ بیٹی کو گھر بٹھائے رکھو۔ لڑکی کے باپ کے لیے یہ چوٹ بہت سخت تھی، مگر ناک کا مسئلہ تھا۔ اس نے جواب بھیجا کہ لڑکی میری گھوڑی پر جائے گی۔ میں یہ رعایت دے سکتا ہوں کہ تمہارا بیٹا میرے گاؤں سے پیدل نکلے، گاؤں سے باہر جا کر گھوڑی پر بیٹھ سکتا ہے۔

اصل جھگڑا ڈولی اور گھوڑی کا نہیں بلکہ یہ پرانی کدورتوں کا فتور تھا۔ دونوں گاؤں کے لڑکے لڑکیوں کی شادیاں اُس دن سے ہو رہی تھیں جس دن دونوں گاؤں آباد ہوئے تھے اور اسی دن سے گھریلو جھگڑے بھی شروع ہو گئے تھے۔ یہ جھگڑے ہر نئی شادی پر منحوس سائے کی طرح چھائے رہتے تھے۔ پرانی کدورت کو ذرا تسکین دینے کے لیے نئی بات پیدا کر لی جاتی تھی۔ اب وہ بات اس لڑکی لڑکے کے معاملے میں بھی پیدا کر لی گئی اور نئی رنجش کی ابتدا ہو گئی۔

بزرگوں کے کہنے کہلانے پر دونوں فریق ذرا ذرا جھک گئے اور لڑکی کو بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد لڑکی آتی جاتی رہی۔ تیسرے مہینے لڑکی میکے آئی۔ دو تین دن ہی گزرے ہوں گے کہ اس کے سسرال کا کوئی قریبی رشتہ دار مر گیا۔ اطلاع ملتے ہی لڑکی اتنی عجلت میں سسرال چلی گئی کہ کانٹوں کی ایک جوڑی، سونے کے دو کڑے اور ایک انگوٹھی میکے بھول گئی۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ ماتم والے گھر اتنا سارا زیور پہن کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اتفاق سے یہ وہ زیورات تھے جو اسے سسرال نے دیئے تھے۔ وہ سسرال گئی تو ساس نے زیورات کے متعلق پوچھا تو لڑکی نے بتایا کہ میکے رہ گئے ہیں اگلی بار لیتی آؤں گی۔ ساس نے اس شک کا اظہار کر دیا کہ لڑکی دانستہ سسرال کے زیورات اپنے ماں باپ کے گھر چھوڑ آئی ہے۔ لڑکی کے جسم میں جوانی کا خون تھا۔ وہ ایسا الزام برداشت نہ کر سکی۔ اس نے باتوں باتوں میں کہہ دیا ــــ "میرے ماں باپ تمہارے زیور کے بھوکے نہیں ہیں۔ انہوں نے مجھے تم سے زیادہ سونا دیا ہے۔"

ساس بہو میں تُو تُو میں میں شروع ہو گئی۔ لڑکی کے خاوند نے اپنی دلہن کی طرفداری کی تو اس کی ماں اس پر برس پڑی اور بات بڑھ گئی۔ لڑکی نے بہت کوشش کی کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے مگر ساس کے دل میں جو پرانی خلش تھی اسے مٹانے کے لیے اسے ایک بہانہ مل گیا تھا۔ وہ بہو کو بخشنے پر آمادہ نہ ہوئی۔

تھوڑے دنوں بعد لڑکی میکے آئی تو اس نے ساری بات ماں کو کہہ سنائی۔ باپ نے وہ زیورات اٹھائے جو لڑکی کو سسرال سے ملے تھے اور بیٹی کے سسرال چلا گیا۔ اس نے زیورات لڑکی کے سسر کے آگے پھینک کر کہا کہ میں اپنی بیٹی کو اتنا ہی زیور اور دے سکتا ہوں۔ تم نے یہ کہہ کر کہ میری بیٹی تمہارا دیا ہوا زیور جان بوجھ کر چھوڑ آئی ہے، مجھے، میری بیوی اور میری بیٹی کو چور کہا ہے۔ اب یہ بات سارے گاؤں میں پھیلے گی اور میری بے عزتی ہو گی۔ میں اپنی بیٹی کو صرف اس صورت میں اس گھر بھیجوں گا کہ ساری برادری کے سامنے کہو کہ میری بیٹی زیور گھر بھول آئی تھی۔

سسرال والے بھی آخر راجپوت تھے۔ وہ مقابلے میں ڈٹ گئے اور

برادری کے سامنے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے جواب میں لڑکی کے باپ نے لڑکی کو سسرال بھیجنے سے انکار کر دیا ـــ اور دو باپوں کی ہٹ دھرمی نے ایک نوجوان لڑکی اور ایک نوجوان لڑکے کی خوشیوں پر مہر ثبت کر دی۔ لڑکی کو نہ کوئی سسرال سے لینے کے لیے آیا نہ میکے والوں نے اسے سسرال جانے دیا۔

نانی نے مجھے سنایا کہ ایک دفعہ لڑکی نے ماں سے کہا کہ ضروری تو نہیں کہ کوئی مجھے لینے آئے تو ہی میں جا سکوں گی۔ میں اکیلی چلی جاؤں تو کیا ہو جائے گا؟ اب تو میرا وہی گھر ہے نا ـــ ماں کے سینے میں بھی عورت کا دل تھا۔ اس نے اپنے خاوند سے بات کی تو خاوند نے اپنی بیوی اور بیٹی کو قتل تو نہیں کیا، قتل کی دھمکی ضرور دی اور کئی دن بیوی اور بیٹی سے بات تک نہیں کی۔ وہ بار بار کہتا تھا ـــ "میرا خون اتنا بے غیرت نہیں تھا کہ میری بیٹی اپنے آپ سسرال چل پڑے۔"

لڑکی نے پہلے بچے کو جنم دیا۔ لڑکا پیدا ہوا۔ اس روز لڑکی اتنی روئی جیسے اس کا اکلوتا بچہ مر گیا ہو۔ وہ اس خوشی میں اس مرد کو بھی شریک کرنا چاہتی تھی جو اس بچے کا باپ تھا۔ وہ صرف ایک میل دور تھا مگر دونوں کے درمیان ایک صدی کی کدورتیں اور دو باپوں کی ناکیں حائل ہو گئی تھیں اور خاوند کا گھر کالے کوسوں دور ہو گیا تھا۔

بچہ تین چار مہینے کا تھا جب لڑکی اسے گودی لے کر باہر نکلنے لگی۔ وہ کبھی کبھی کھیتوں کی طرف نکل جاتی تھی۔ اسے ماں باپ نے کبھی نہیں روکا تھا لیکن گاؤں میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ پھر باتیں لڑکی کے کانوں تک پہنچیں۔ پتہ چلا کہ لڑکی بچے کو اٹھا کر جب کھیتوں میں جاتی ہے تو نظر بچا کر ان کھڈ نالوں کی طرف نکل جاتی ہے جو درختوں کے جھنڈ کے ساتھ ہیں۔ وہ بڑی اچھی اوٹ تھی۔ دو بار کسانوں نے دیکھا کہ لڑکی اس قدرتی اوٹ سے نکل کر آ رہی تھی اور دور ایک آدمی اسی اوٹ سے نکل کر جا رہا تھا۔ اس آدمی کو کوئی نہ پہچان سکا کیونکہ کھڈ نالے اور درختوں کے جھنڈ اتنے وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے تھے کہ آدمی دور نکل جائے تو نظر آتا مگر اتنی دور سے پہچانا نہیں جاتا تھا۔

نوجوان لڑکیوں کو شادی کے بعد گھر بٹھا لینے کے نتیجے پہلے بھی کئی بار ظاہر ہو چکے تھے۔ اب وہی ڈرامہ پھر کھیلا جا رہا تھا۔ لڑکی جوان تھی اور ایک سال سے گھر بیٹھی ہوئی تھی۔ باتیں کرنے والے جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔

باتیں لڑکی کے چچا اور تائے تک پہنچیں۔ انہوں نے لڑکی کے باپ کی غیرت کو للکارا۔ باپ نے لڑکی سے باز پرس کی تو اس نے جواب دیا ـــ "میں وہاں کبھی کبھی دل بہلانے جاتی ہوں۔ گھر میں دل گھبراتا ہے" ـــ باپ نے اسے قتل کی دھمکی دے کر خبردار کر دیا۔ چچے اور تائے نے اسے ٹانگیں توڑ دینے کی دھمکی دی اور اس طرح اپنے بزرگ جن سے وہ شفقت کی متمنی تھی، اس کے دشمن ہو گئے۔ صرف ماں تھی جو بیٹی کے غم کو سمجھتی تھی۔ اس نے بیٹی کو کوئی دھمکی نہ دی بلکہ الگ بیٹھ کر روتی رہی۔

گاؤں میں ایک اور ذات کے گھرانے میں شادی کی محفل جمی ہوئی تھی۔ نٹ اور ڈوم گاؤں کے درمیان میں سارے گاؤں کو ہنسا ہنسا کر پاگل بنا رہے تھے۔ گاؤں کا بچہ بچہ وہاں موجود تھا۔ قہقہوں کی اس محفل میں صرف ایک انسان نہیں تھا اور وہ یہ لڑکی تھی۔ اس کے بچے کی عمر چھ مہینے ہو گئی تھی۔

کسی نے لڑکی کے باپ کے کان میں کچھ کہا تو وہ تیزی سے اٹھا اور محفل سے نکل گیا۔ اس کے پیچھے اس کا بھائی یعنی لڑکی کا چچا بھی اٹھا اور چلا گیا۔ لڑکی کی ماں قریب ایک مکان کی منڈیر پر عورتوں میں بیٹھی نٹوں اور ڈوموں کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے خاوند اور خاوند کے بھائی کو جاتے نہ دیکھا۔ کسی عورت نے اسے بتایا کہ تمہارا گھر والا فلاں آدمی کے بلانے پر چلا گیا ہے۔ لڑکی کی ماں گھبرا کر اٹھی جیسے وہ کسی خطرے سے خبردار ہو گئی ہو۔ وہ عورتوں کے ہجوم سے تو یہ کہہ کر آرام سے نکلی کہ گھر جا رہی ہوں لیکن محفل کی نظروں سے اوجھل ہو کر گھر کی طرف دوڑ پڑی۔ اسے معلوم تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

گھر میں داخل ہوئی تو ڈیوڑھی کے باہر وہ مزارعہ کھڑا تھا جسے وہ گھر کی رکھوالی کے

لیے چھوڑ گئے تھے کیونکہ لڑکی سر درد کا بہانہ کرکے گھر رہ گئی تھی۔ ماں نے مزارعہ سے پوچھا کہ دونوں چوہدری گھر آئے تھے؟ کہاں گئے ہیں؟ مزارعہ اس سے زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے بتایا:

"چوہدری جی بڑے غصے میں آئے تھے۔ چھوٹی بی بی بچے کو اٹھا کر بہت دیر پہلے چلی گئی تھی۔ مجھے کہہ گئی تھی کہ نٹوں کا تماشا دیکھنے جا رہی ہوں۔ چوہدری جی اور چھوٹے چوہدری ابھی ابھی آئے تو مجھ سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے بتایا کہ بہت دیر ہوئی تماشا دیکھنے چلی گئی ہے۔ چوہدری جی دوڑتے اندر گئے۔ میں صحن میں کھڑا رہا۔ وہ اندر سے نکلے تو ان کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ انہوں نے مجھے گالیاں دیں۔ چھوٹے چوہدری جی نے میرے منہ پر تین چار تھپڑ مارے اور دونوں دوڑتے ہوئے باہر نکل گئے۔"

ماں کو معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں۔ وہ دوڑتی ہوئی گھر سے نکلی اور گاؤں کی اندھیری گلیوں میں دوڑتی ہوئی گاؤں سے نکل گئی۔ اسے کسی نے بھی نہ دیکھا۔ کیونکہ گاؤں ڈوموں کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ کھیتوں کی طرف دوڑتی گئی۔ اس کا رخ درختوں کے اُس گھنے جھنڈ کی طرف تھا جن کے سائے میں کھڈ نالے تھے۔ اندھیرے میں اسے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دوڑتی چلی گئی۔

جب اندھیرے میں جھنڈ سیاہ پہاڑ کی طرح نظر آنے لگا تو وہ چلا چلا کر کہنے لگی:

"ٹھہر جانا چوہدری۔ اللہ کے واسطے ٹھہر جانا چوہدری۔ میری بات سن لینا۔ اپنی بیٹی پر ظلم نہ کرنا۔"

دونوں چوہدری غصے سے اندھے اور بہرے ہو چکے تھے۔ ان تک شاید اس پاگل عورت کی آوازیں نہیں پہنچی تھیں۔ وہ ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں سے انہیں ایک مرد اور ایک عورت اس طرح بیٹھے سائے کی طرح نظر آ رہے تھے جیسے دو انسان ایک سایہ بن گئے ہوں۔ چچا نے بعد میں بیان دیا کہ انہوں نے اپنی لڑکی کی ہنسی کی آواز پہچان لی تھی۔ لڑکی کے باپ نے دونالی بندوق سیدھی کی اور گولی چلا[illegible]

بہت کم تھا جہاں سے چھرے ضائع نہیں ہو سکتے تھے۔ لڑکی اٹھی اور اٹھتے ہی گر پڑی۔

وہ جس مرد کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، وہ اٹھا اور اس نے بڑی ہی گرجدار آواز میں للکارا ——"مرد بندوقوں سے نہیں لڑا کرتے۔ بزدلو سامنے ....."۔ اس کی للکار پوری نہ ہو سکی اور دوسرے کارتوس کے چھرے اس کے جسم سے پار ہو گئے۔ چھ ماہ کے بچے کے رونے کی آواز آئی۔

اور عین اُس وقت لڑکی کی ماں کی چیخ اور پکار قریب آ گئی۔ وہ چلاتی چلی آ رہی تھی ——"تیرا کچھ نہ رہے چوہدری۔ اللہ تیرا بیڑہ غرق کرے۔ تُو نے اپنی بیٹی اور اپنے داماد کو مار دیا ہے۔"

دونوں چوہدری لاشوں سے ذرا دُور فاتحانہ طریقے سے کھڑے تھے۔ لڑکی کی ماں پاگلوں کی طرح دوڑتی لاشوں پر جا گری۔ بچہ الگ پڑا رو رہا تھا۔ لڑکی اور آدمی مر چکے تھے۔ بچہ بالکل محفوظ تھا۔ نانی نے اسے سینے سے لگا لیا اور اس کی چیخیں اور فریادیں رات کے خاموش اندھیرے کا جگر پھاڑنے لگیں۔ چوہدریوں کے سامنے ان کی اپنی بیٹی کی لاش کے ساتھ ان کے اپنے داماد کی لاش پڑی تھی۔ بچہ محفوظ تھا۔

دو گولیاں چلنے سے دونوں گاؤں کے لوگ دوڑتے آئے۔ ان کے پاس لاٹھیاں کلہاڑیاں اور برچھیاں تھیں۔ دو چار لالٹینیں بھی آ گئی تھیں۔ لاشیں اٹھانے لگے تو دوسرے گاؤں والوں نے اپنے لڑکے کی لاش پہچان لی۔ انہوں نے دونوں لاشوں کے گرد گھیرا ڈال کر اعلان کر دیا کہ لاشیں پولیس اٹھائے گی۔ تم میں ہمت ہے تو آگے آ کر اپنی بیٹی کی لاش اٹھا لو۔ جن کا جوان بیٹا مارا گیا تھا وہ مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ کوئی بھی آگے نہ ہوا۔

رات ہی کو انہوں نے چار میل دور تھانے میں جا کر رپورٹ درج کرا دی اور صبح پولیس آ گئی۔ اس وقت تک لڑکی کا باپ پاگل ہو چکا تھا۔ رات جب وہ اپنی بیٹی اور داماد کو قتل کرکے گھر آیا تو ہذیان بکنے لگا۔ پھر اٹھ کر اس نے بیٹی کا ٹرنک کھولا اور اس کے کپڑے پھاڑنے لگا۔ جب اسے پکڑا گیا تو اس نے اپنے ایک بھائی کے بازو کو

کو کاٹ کھایا۔ پھر اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ صبح پولیس اسے گرفتار کرنے آئی تو وہ خطرناک حد تک پاگل ہو چکا تھا۔ کسی کو بھی خیال نہ آیا کہ بندوق اپنے قبضے میں کر لیتے یا بندوق سرے سے غائب کر دیتے۔ قتل کا کوئی موقع کا گواہ تو تھا نہیں مگر بندوق اندر پڑی رہی۔

جب تھانیدار اور دو سپاہی اس کے گھر میں داخل ہوئے تو وہ کچھ سکون میں تھا۔ تھانیدار نے آتے ہی کہا — ”چوہدری جی! وہ بندوق ہمیں دے دو“ — چوہدری اطمینان سے اٹھا اور اندر چلا گیا۔ کوئی بھی اس کے ساتھ اندر نہ گیا۔ وہ کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی۔ وہ دہلیز پر رکا اور کچھ کہے بغیر اس نے نالیاں اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھیں۔ تھانیدار سمجھ گیا۔ وہ یہ کہہ کر اٹھا ”چوہدری ہوش کر“ — مگر چوہدری نے ہاتھ نیچے کر کے ٹریگر دبا دیا۔ گولی گرج کر نکلی اور چھرّوں نے نیچے سے داخل ہو کر اوپر سے نکلتے ہوئے مغز اور کھوپڑی کے پرخچے اڑا دیئے — قاتل نے اپنے آپ کو سزائے موت دے دی تھی۔

میری عمر اُس وقت دس گیارہ سال تھی جب میری نانی مجھے یہ کہانی سنا رہی تھی۔ میں خود بچہ تھا اس لئے مجھے اُس ”بچے“ کا خیال آ رہا تھا جس کے ماں باپ اکٹھے مارے گئے تھے۔ میں نانی سے پوچھنے لگا تھا کہ وہ بچہ اب کہاں ہے۔ لیکن میں پوچھ نہ سکا کیونکہ نانی اتنی زیادہ رونے لگی تھی کہ بات بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے مجھے سینے سے لگا لیا اور میرا سر چومنے لگی۔ میں نے سوچا کہ اب نانی سے پوچھ لوں کہ وہ بچہ کہاں ہے۔ نانی نے مجھے پوچھنے کی مہلت نہ دی۔ میرے گالوں کو ہاتھوں میں تھام کر اس نے ایک ایسی بات کہی جس نے مجھے سُن کر دیا۔ اس نے کہا — ”میرے چاند! تیری ماں اور تیرا باپ اس طرح مارے گئے اور تجھے یتیم کرنے والا تیرا نانا تھا۔ خدا نے تجھے نانا کی گولی سے بچا لیا تھا۔ ہم سب تجھے یہ تو بتاتے رہے ہیں کہ تیرے ماں باپ اُس وقت مر گئے تھے جب تو چھ مہینے کا تھا لیکن تجھے یہ کسی نے نہ بتایا کہ وہ کس طرح مرے تھے۔“

میں نے نانی کے چہرے پر نظریں گاڑ دی تھیں اور وہ کہہ رہی تھی — ”میری

بچی اور میرے جوائی نے دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو کر گھنے پیڑوں کے سائے تلے اپنی دنیا بسائی ہوئی تھی۔ مجھے معلوم تھا۔ میں بھی چوہدری کی ان ملاقاتوں میں شریک تھی۔ میرا جوائی اپنے بچے کو دیکھنے آیا کرتا تھا اور میری بچی ”بچے“ کو وہاں لے جایا کرتی تھی جہاں وہ اپنے باپ کی گولی سے ماری گئی۔ اپنے گاؤں کی ایک میراثن پیغام لے جایا کرتی تھی۔ مجھے امید تھی کہ راضی نامہ ہو جائے گا تو میری بچی اپنے گھر آباد ہو جائے گی لیکن ایک سال گزر گیا تو .... “

نانی بہت روئی اور اس کے ساتھ میں بھی رونے لگا۔ نانی نے مجھے یہ کہانی اپنے گاؤں یا اپنے گھر میں بیٹھ کر نہیں بلکہ والٹن (لاہور) کے پناہ گزین کیمپ میں بیٹھ کر سنائی تھی۔ وہ شاید کبھی بھی یہ راز فاش نہ کرتی لیکن مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام، گھر لُٹ جانے اور پناہ گزین کیمپ میں بے بسی کے اثر سے نانی کے سینے میں سرحد پار کے گاؤں کی یادیں ابھر آئی تھیں۔ وہ ایسے لہجے میں باتیں کر رہی تھی جیسے سرحد پار کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ایک بار پھر جینے کی کوشش کر رہی ہو اور اُس طرح اس نے یہ زہریلی یاد بھی میرے سامنے اگل دی۔

وقت گزرا اور ساری برادری جس میں دونوں گاؤں کے گھرانے شامل ہیں، پاکستان کے ایک چک میں آباد ہو گئی۔ سب زمیندار اور کسان تھے۔ زمین اچھی اور کافی مل گئی اور ہماری زندگی ایک بار پھر رواں دواں ہو گئی۔ ہماری برادری سرحد پار سے خالی ہاتھ آئی تھی۔ پیسہ پیسہ اور زیور کی آخری رتی بھی لٹ گئی تھی۔ ہم لوگ کچھ بھی ساتھ نہیں لا سکے تھے۔ مگر اپنی کدورتیں اور پرانی روایات ساتھ ہی لے آئے۔ یہ ایسی چیزیں تھیں جنہیں سکھ بھی نہ لوٹ سکے۔

میری سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ پاکستان میں آ کر دس سال کی عمر میں سکول داخل ہو گیا تھا۔ اگر ان پڑھ رہتا تو شاید اچھا رہتا۔ میری عمر چونتیس سال ہو گئی ہے۔ دو بچے ہیں۔ میری شادی اسی خاندان میں ہوئی ہے جس خاندان کا میرا باپ تھا۔ تھوڑے دن گزرے میری بیوی میکے چلی گئی۔ کہہ گئی تھی کہ آٹھویں روز آ جاؤں گی۔ بارھویں دن بھی نہ آئی تو میں سسرال کے گھر کی طرف چل پڑا۔ ان کا گھر کھیتوں کے دوسری طرف

تین چار فرلانگ دور ہے۔ راستے میں اپنے ایک بزرگ مل گئے اور پوچھنے لگے کہ کہاں جا رہے ہو؟ میں نے بتایا کہ بیوی کہہ گئی تھی کہ آٹھویں روز آجاؤں گی آج بارھواں روز ہے، ذرا دیکھنے جا رہا ہوں کہ بیوی بچّے خیریت سے تو ہیں؟

بزرگ نے فرمایا — "دو اکھر پڑھ کر ہو گئے نا بے غیرت؛ تیرے نانا نے ناک کی خاطر اپنی بیٹی کو گھر بٹھا کر گولی ماردی تھی اور تم اس کا نام ڈبونے جا رہے ہو۔ سنو مرد بیویاں کے پیچھے نہیں بھاگا کرتے۔ بیویاں خود آیا کرتی ہیں" — میں گھر واپس آگیا۔ نانی ضعیف ہو چکی ہے۔ اب تو چارپائی سے کم ہی اٹھتی ہے۔ میں نے اسے بتایا تو اس نے ضعیفی اور غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "ابھی جاؤ اور اپنے بچّوں کو دیکھ آؤ۔ لوگوں کی باتیں مت سنو۔ چن جی! انہی مردودوں کی باتوں نے میرا گھر اجاڑا تھا" — میں بیوی بچّوں کو گھر لے آیا ہوں اور بزرگ مجھے گھور رہے ہیں جیسے کسی عورت کو اغوا کر لایا ہوں۔

تیسرے بچّے کا باپ

احمد بخش گوجر

ہمارے گاؤں کو آپ بڑا گاؤں یا چھوٹا قصبہ کہہ سکتے ہیں جہاں ایک تھانہ ایک چھوٹی سی کچہری اور لڑکیوں کا مڈل سکول بھی ہے۔ ایسے بڑے گاؤں یا چھوٹے قصبے میں کوئی واردات یا لڑائی جھگڑا ہو جائے تو پولیس مقدمہ درج رجسٹر کرنے سے پہلے گاؤں کے بڑوں سے بات کر لیتی ہے تاکہ راضی نامے کی صورت نکل آئے اور معاملہ کچہری تک نہ پہنچے۔ یہ طریقہ بعض حالات میں تو اچھا ثابت ہوتا ہے۔ لوگ مقدمہ بازی سے بچ جاتے ہیں لیکن بعض کیسوں میں بے انصافی بھی ہو جاتی ہے کیونکہ گاؤں کے بڑے کسی پرانی عداوت کی بنا پر کسی ایک پارٹی کے خلاف ہو کر بے انصافی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے گھروں کے جھگڑے بھی ان لوگوں کے سامنے جا رکھتے ہیں اور فیصلے کراتے ہیں۔

گاؤں کے یہ بڑے جنہیں رؤسا یا شرفا کہا جاتا ہے، رئیس تو ہو سکتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ شریف بھی ہوں۔ ان میں سے کوئی تو آڑھتی یا ایسا ہی کاروباری آدمی ہوتا ہے یعنی وہ روپے پیسے والا ہوتا ہے اور کوئی کسی سرکاری محکمے کا ریٹائرڈ افسر یا فوج کا ریٹائرڈ صوبیدار وغیرہ ہوتا ہے اور کوئی سینکڑوں ایکڑ زمین کا مالک زمیندار یا جاگیردار ہوتا ہے اور ان میں دو ایک ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی بظاہر کوئی معاشرتی یا معاشی حیثیت نہیں ہوتی لیکن وہ مخبری اور چرب زبانی کے فن کے ایسے ماہر ہوتے ہیں جس کی بدولت تھانے میں انہیں عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان میں ایک

آدھ عالم فاضل یا پیر و مرشد بھی ہوتا ہے۔ ان رؤسا اور شرفا کا کوئی تعلیمی معیار نہیں ہوتا۔ ان کے معیار کی پیمائش ان کے مکانوں کی بلندی سے کی جاتی ہے جن کی پیشانیوں پر ہٰذا من فضلِ ربی کی سلیٹیں نصب ہوتی ہیں۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ رب کا فضل سمگلنگ سے ہوا ہے یا ذخیرہ اندوزی سے یا مزارعوں کو بھوکا رکھ کر۔ بہرحال یہ لوگ پنچ کہلاتے ہیں جنہیں بعض لوگ کھڑپنچ بھی کہتے ہیں۔

عید میلاد النبی کا جلسہ ہو یا کوئی اور تقریب، یہ لوگ مہتمم اور منتظم بن جاتے ہیں۔ قصبے میں ڈپٹی کمشنر یا اس سے بھی کوئی چھوٹا افسر دورے پر آجائے تو یہ رؤسا اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتے اور فرشی سلام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی چغلی کھانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ الیکشن کے زمانے میں ان لوگوں کی سرگرمیاں زیادہ دلچسپ اور ان کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ وہ سرکار کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ غم بھی اندر ہی اندر کھانے لگتا ہے کہ مخالف پارٹی برسرِ اقتدار آگئی تو ان کا کیا بنے گا، لہٰذا وہ ایک ٹانگ ایک کشتی میں اور دوسری دوسری کشتی میں رکھتے ہیں۔ ہر امیدوار سے جھوٹ بولتے ہیں۔ اور در پردہ پارٹیاں بدلتے رہتے ہیں۔ بعض دیہات میں تو یہ لوگ باقاعدہ حکمرانی کرتے ہیں۔ مقدمے سنتے اور فیصلے صادر کرتے ہیں۔ اگر کوئی پارٹی ان کے فیصلے کو تسلیم نہ کرتے ہوئے عدالت میں چلی جائے تو اس کے کیس کو کمزور کرنے کے لیے یہ لوگ جھوٹی گواہی بھی دے آتے ہیں۔ پاکستان کو تباہی کے غاروں میں پہنچانے والے سابق صدر ایوب خان نے ان لوگوں پر بنیادی جمہوریت کا لیبل لگا کر انہیں سرکاری حیثیت دے دی تھی۔

اس کے باوجود انہیں شرفا بھی کہا جاتا ہے۔ قصبے یا گاؤں کے کسی بھی باشندے کے چال چلن کو اس وقت تک بے داغ نہیں سمجھا جاتا جب تک ان "شرفا" میں سے کوئی ایک تصدیق کا انگوٹھا نہ لگا دے۔

ہمارے قصبے میں ایک جوان سال عورت کا خاوند مر گیا۔ اس کا باپ پہلے ہی مر چکا تھا اور اس کی ماں اندھی ہو گئی تھی۔ دو بچے بھی تھے۔ عورت کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ

جوان اور خوبصورت تھی اور خاوند کی بے وقت موت نے اسے اپنے دو بچوں اور اندھی ماں کے لیے اپنے ہاتھ سے کمانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے قصبے میں لڑکیوں کے مڈل سکول میں آٹھ جماعتیں پاس کی تھیں۔ وہ ماں باپ کی واحد اولاد تھی۔ والدین فارغ البال تھے جو لڑکی کا شوق پورا کرنے کے لیے اسے آگے پڑھانا چاہتے تھے مگر ہائی سکول قصبے سے دور تھا جہاں تک آنے جانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔

لڑکی کی شادی ہمارے قصبے میں ہوئی تھی۔ ہم لوگ اتنے امیر کبیر نہیں ہوتے کہ جس بیٹے کی شادی کر دیں اسے الگ مکان دے دیں تاکہ میاں بیوی آزادی سے اپنی زندگی بسر کریں۔ چھوٹے چھوٹے مکانوں میں تین تین چار چار شادی شدہ بھائی اس حالت میں رہتے ہیں کہ کسی بھی جوڑے کو الگ کمرہ نہیں ملتا۔ بھائیوں کی بیویاں ایک دوسری کو گھور گھور کر دیکھتی ہیں۔ گھر کی صفائی اور جھاڑ پونچھ پر ایک دوسری سے لڑتی جھگڑتی اور ایک دوسری کے خلاف بہتان طرازی کرتی ہیں۔ پھر اپنے خاوندوں کے کان بھرتی اور بھائیوں کو بھی ٹکرا دیتی ہیں۔ چار دیواری کی اس گھٹی گھٹی دنیا میں جو فتنے بپا ہوتے ہیں وہ ملک کی سیاست سے زیادہ دلچسپ اور افسوسناک ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایسے ہی بھائیوں کے جھگڑے قصبے کے پنچوں کے پاس جاتے ہیں اور چار دیواری کی دنیا کی ایسی ایسی کہانیاں سامنے آتی ہیں جو الف لیلیٰ کی داستانوں سے کم دلچسپ نہیں ہوتیں۔

یہ لڑکی جس کی میں کہانی سنانے لگا ہوں، ایسی ہی ایک حویلی میں جا آباد ہوئی تھی جہاں اس کے خاوند کا ایک بڑا بھائی بیوی بچوں کے ساتھ آباد تھا۔ شادی ہوئے ابھی چھ مہینے نہیں گزرے تھے کہ قصبے میں مشہور ہو گیا کہ بھائیوں میں تُو تُو مَیں مَیں شروع ہو چکی ہے۔ بڑے بھائی کی بیوی تجربہ کار اور پختہ عمر کی تھی۔ اس نے بات کے بتنگڑ بنانے جو شروع کیے تو چھوٹے بھائی کی بیوی اس الزام سے بدنام ہو گئی کہ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی فتنہ کھڑا کر دیا ہے۔ بڑے بھائی کی بیوی نے اپنی ساس پہ چرب زبانی کا جادو چلا رکھا تھا۔ اس نے ساس کو بھی چھوٹی بہو کے خلاف کر دیا۔ پھر ان دونوں عورتوں نے مل کر لڑکی کے خاوند کے کان بھر بھر کر اس کے دل میں بھی اپنی بیوی کے خلاف شکوک پیدا کر دیے۔ اگر آپ پوچھیں کہ اس لڑکی سے ان لوگوں کی کیا دشمنی

تھی؛ تو آپ کو کوئی معقول جواب نہیں ملے گا، سوائے اس کے کہ بڑے بھائی کی بیوی کو یہ گوارا نہ تھا کہ حویلی کا کوئی اور حصّہ دار بنے۔

لڑکی جب بھی میکے آتی، آنسو اور آہیں لے کے آتی۔ وہ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی جس کے ساتھ انہیں بہت پیار تھا۔ اسی پیار کی خاطر انہوں نے لڑکی کو دل کھول کر جہیز دیا تھا جس سے وہ مقروض بھی ہو گئے تھے۔ سارا جہیز جہنم میں جلنے لگا اور باپ کی کمر دوہری ہونے لگی۔ کوئی ایک سال بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ لڑکی کو خاوند نے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کے خلاف ساس اور بڑے بھائی کی بیوی نے یہ الزام عائد کر رکھا تھا کہ وہ جب میکے جاتی ہے تو گھر سے پیسے لے جا کر ماں باپ کو دیتی ہے۔ پیسوں کے علاوہ وہ چینی اور گھی بھی اٹھا لے جاتی ہے۔ اس کے خاوند نے بھی سچ مان لیا اور اپنی ماں کی ہدایت کے مطابق اس کے سارے زیور کو جن میں لڑکی کے ماں باپ کا زیور بھی شامل تھا، اپنے قبضے میں رکھ لیا۔

باپ نے بیٹی کا غم اپنے دل میں بٹھا لیا۔ ہمارے ہاں ماں باپ مرتے دم تک بیٹی کے دکھ درد سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ اپنی کمر توڑ کر جہیز دیتے ہیں جو دراصل سسرال والوں کو اس بات کی قیمت دی جاتی ہے کہ ان کی بیٹی کو سکھی رکھا جائے۔ بیٹیوں کو پھر بھی سکھی نہیں رکھا جاتا۔ یہی حال اس لڑکی کے ماں باپ کا ہوا۔ شادی کیے ایک سال گزر چکا تھا۔ لڑکی تین چار بار گھر آ بیٹھی تھی لیکن پنچوں نے اسے پھر واپس سسرال بھجوا دیا تھا۔

ایک روز لڑکی کے باپ کو بخار محسوس ہوا جو ٹائیفائڈ بن گیا۔ اس کے جسم میں قوت تو رہی نہیں تھی جو بیماری کا مقابلہ کرتی۔ تھوڑے دنوں بعد ایک رات اس کی حالت بگڑ گئی۔ قصبے میں دو ڈاکٹر اور چار حکیم تھے۔ لڑکی دونوں ڈاکٹروں کے پاس گئی۔ وقت آدھی رات کا تھا۔ دونوں ڈاکٹروں نے آنے سے انکار کر دیا۔ ایک حکیم آ گیا جس نے مریض کو نہ معلوم کیا دے دیا کہ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور حکیم کے جانے کے دو گھنٹے بعد وہ مر گیا اور اس کے مرنے کے تین گھنٹے بعد بیٹی نے پہلے بچے کو جنم دیا۔ باپ کی میّت

صحن میں پڑی تھی اور کمرے میں بیٹی بچّہ جن رہی تھی۔ زندگی اور موت کا کرشمہ ظہور پذیر ہو رہا تھا۔

سسرال والوں نے اس پر بھی ناک بھوں چڑھائی کہ ہمیں پہلے بچے کی خوشیاں منانی تھیں ـــــ "اس کے باپ کو آج ہی مرنا تھا۔ دو روز بعد مر جاتا تو ہم خوشی تو منا لیتے" ـــــ لڑکی کو ہر لحاظ سے منحوس قرار دے دیا گیا۔

لڑکی اس جہنم میں دوسرے بچے کی پیدائش تک پڑی تڑپتی رہی۔ دوسرا بچّہ دو سال بعد پیدا ہوا تھا۔ اس بچے کی عمر دو سال ہوئی تو لڑکی کی ماں ایک روز آخری سیڑھی سے پھسلی اور لڑھکتی ہوئی نیچے آ رہی۔ اس کے جسم پر کوئی زخم نہ تھا۔ سر میں ایسی چوٹ لگی جس سے آنکھیں بند ہو گئیں۔ قصبے کے ڈاکٹر نے علاج کیا مگر آنکھوں کے پیچھے کھوپڑی میں درد کی ٹیسیں نہ تھم سکیں۔ تین مہینوں بعد درد ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی آنکھیں بھی ختم ہو گئیں۔ اس کے پاس اب کچھ نہ تھا جس سے وہ کسی بڑے شہر میں جا کر آنکھوں کا اپریشن کرا سکتی۔ وہ عمر بھر کے لیے معذور ہو کر بیٹھ گئی۔

اب ضرورت یہ تھی کہ بیٹی اور داماد اس کے پاس رہیں اور اس کا ہاتھ بٹائیں لیکن سسرال والوں نے یہ صورت پیش کی کہ وہ ان کے گھر آ جائے۔ یہ صورت ماں کو منظور نہیں تھی۔ اس نے اپنے گھر میں خود داری اور آزادی سے عمر گزاری تھی، وہ پرائے گھر میں کیسے جا بیٹھتی؛ اس نے آخر یہ پیش کش کی کہ وہ مکان اس شرط پر اپنی بیٹی کے نام منتقل کر دے گی کہ داماد اور بیٹی اس کے پاس رہیں۔ سسرال والوں نے ایک بھی دن ضائع کیے بغیر اپنے بیٹے اور بہو کو بھیج دیا مگر زیور اپنے قبضے میں رکھا۔ داماد نے پہلا کام یہ کیا کہ مکان کے کاغذات پر قبضہ کیا اور اپنی بیوی کو ساتھ لے جا کر مکان اس کے نام منتقل کرا دیا۔

کہتے ہیں کہ خدا اعمالِ بد کی سزا دیتا ہے لیکن ایسے انسان بھی دیکھے گئے ہیں جو نیکی کے سوا کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتے مگر مسلسل مصائب سے کچلے جاتے ہیں۔ ایسے انسانوں کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ یہ لڑکی بھی ایسے ہی انسانوں میں سے تھی جس نے زندگی کی خوشیاں دیکھیں تو صرف اپنے ماں باپ کے

گھر۔ اب وہ پھر خاوند اور بچوں سمیت اپنے ماں باپ کے گھر آ گئی۔ وہاں پہنچتے ہی خاوند کا رویہ بدل گیا۔ اس کے دماغ سے اپنے گھر کے ماحول کے بد اثرات دھل گئے۔ اپنی بیوی کے گھر میں اسے اپنی بیوی کے خلاف بھڑکانے اور اکسانے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے چند دنوں میں ہی اپنی آزاد نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھا تو پہلی بار معلوم ہوا کہ یہ تو بڑی اچھی عورت ہے۔

اس لڑکی کے خاوند کو کھانسی آنے لگی اور شام کے وقت وہ ہلکی ہلکی حرارت محسوس کرنے لگا۔ وہ جوان آدمی تھا، اسے تھکان سمجھتا رہا۔ کوئی ایک مہینہ بعد اسے بیوی نے بتایا کہ اس کا چہرہ نمایاں طور پر پیلا پڑ گیا ہے۔ وہ خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ کوئی چیز اسے اندر ہی اندر کھا رہی ہے۔ جب ڈاکٹر سے معائنہ کرایا تو اس نے سینے کے ایکسرے کے لیے کہا۔ وہ اسی دن لاہور گیا اور ایکسرے کرایا۔ اس سیاہ کالی فلم نے اس کی زندگی پر سیاہ کالی سیاہی پھیر دی ـــــ دق کے جراثیم دونوں پھیپھڑوں میں پھیل چکے تھے اور مرض کو اس سٹیج تک لے گئے تھے جہاں سے کم ہی مریض واپس آیا کرتے ہیں۔

دق اب لاعلاج مرض نہیں رہا لیکن ایسے مریضوں کے لیے یہ مرض اب بھی لاعلاج ہے جن کے پاس پیسہ نہیں یا ان کے لیئے جن کے پاس پیسہ ہے لیکن وہ مریض کا علاج گھر میں ہی اناڑی ڈاکٹروں سے کرانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہی کچھ یہاں بھی ہوا۔ مریض کو ماں باپ اپنے گھر لے جانے لگے تو اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس کی بیوی نے ایک ڈاکٹر کا علاج شروع کرا دیا۔ اس کے ساتھ ہی مریض کے ماں باپ اپنا حکیم لے آئے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ انہوں نے اپنے بیٹے کا علاج نہیں کرایا۔ قریب ایک پیر کا مزار ہے۔ مریض کی ماں مزار پر جاروبی اور مزار کے گدی نشین نے اسے تعویذ لکھ دیے اور یہ بھی کہا کہ مریض کو مزار کی قبر کی مٹی کی ایک چٹکی روزانہ کھلائی جائے۔

صورت یہ ہو گئی کہ ڈاکٹر اپنا علاج کر رہا تھا۔ حکیم اپنی جڑی بوٹیاں رگڑ رگڑ کر دینے لگا اور ماں ہر روز چٹکی بھر مٹی بیٹے کے منہ میں ڈال جاتی۔ دوائیوں نے اپنا کام کیا یا نہیں؟ یہ تو کسی کو بھی علم نہیں، البتہ مزار کی مٹی کام کر گئی اور مریض جلدی ہی لاش بن گیا۔ اس کے حوصلوں کو پست کرنے کے لیے دق کی صرف دہشت

ہی کافی تھی، غلط علاج نے اسے وقت سے پہلے قبر تک پہنچا دیا۔ ایک روز قصبے کے رؤسا اور شرفا کا ایک وفد مریض کے باپ کی درخواست پر لڑکی کے گھر آ گیا۔ انہوں نے مریض سے کہا کہ انہیں اس کا باپ اس لیئے لایا ہے کہ تم اپنے گھر چلے چلو۔ تم بتاؤ کہ تم اپنے گھر کیوں نہیں جاتے اور سسرال میں رہنا کیوں پسند کرتے ہو؟

مریض نے صاف جواب دے دیا اور کہا کہ میں اسی گھر میں مرنا چاہتا ہوں۔ ایک پنچ بولا ـــ "مرد اپنے ماں باپ کے گھر مرا کرتے ہیں۔ گھر جوائی بن کر سسرال کے گھر مرنے والے کو لوگ بے غیرت کہا کرتے ہیں۔ تم ایک عزّت دار باپ کے بیٹے ہو اس لیے ہم تمہاری چارپائی اٹھوا لے چلتے ہیں" ـــ مریض نے پھر بھی انکار کیا تو پنچ ناراض ہو گئے۔ ایک نے کہا ـــ "آخری وقت گاؤں کے بڑوں کو ناراض نہ کرو"

جب اس کی بیوی کے کانوں میں "آخری وقت" کی آواز پڑی تو وہ پردے سے نکل کر سب کے سامنے آ گئی۔ جس ماں کے بچّوں کے باپ کا آخری وقت آ جائے وہ موت کا منہ نوچنے سے بھی نہیں گھبراتی۔ یہ تو انسان تھے۔ لڑکی ان پر برس پڑی۔ اس نے کہا ـــ "تم لوگ میرے خاوند پر گدھوں کی طرح آن بیٹھے ہو اور کس دلیری سے کہ رہے ہو کہ ماں باپ کے گھر جا کر مرو اور تمہارا آخری وقت آ گیا ہے۔ تم اس کے ماں باپ کو یہ ہدایت کیوں نہیں دیتے کہ اسے بڑے ہسپتال میں داخل کرا کر صحیح علاج کراؤ۔ تم انہیں یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں ڈاکٹر کا علاج کرا رہی ہوں اس پر تم حکیم کی دوائی نہ دو۔ تم اس کی ماں کو کیوں نہیں روکتے کہ اپنے بیٹے کا پیٹ مٹی سے نہ بھرتی جائے۔ تم اس پیر کو کیوں نہیں جا کر کہتے کہ مزار کی مٹی پیٹ میں جا کر گاؤں کی گلیوں کی مٹی جتنا نقصان کرتی ہے"

اچانک پنچوں نے بیک زبان لاحول پڑھی اور ہاتھ کانوں پر دھر لیے۔ ایک بزرگ نے کہا ـــ "لڑکیوں کو انگریزی پڑھانے کا یہ اثر ہے کہ مزار کی خاک کو گلیوں کی مٹی کہہ رہی ہے... اٹھو بھائیو! جس نے مزار کی بے ادبی کر دی ہے، وہ ابھی ہماری داڑھیاں نوچ لے گی" ـــ اور پنچ ناراض ہو کر چلے گئے۔

اسی رات مریض نے بیوی کو اپنے پاس بلایا اور اس کا ہاتھ تھام کر بہت رویا۔ اس نے اعتراف کیا کہ اسے ماں اور بھابی بھڑکاتی رہی ہیں اور وہ اس پر ظلم و تشدد کرتا رہا ہے۔ اس نے ساری بدسلوکی کی معافی مانگی اور کہا کہ اپنے بچوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ بچے سوئے ہوئے تھے۔ ماں سوئے ہوئے بچوں کو باری باری اٹھا لائی۔ باپ نے دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ جب ماں دوسرے بچے کو چارپائی پر لٹا کر خاوند کے پاس آئی تو خاوند نے آخری بار بیوی کا ہاتھ پکڑا اور اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ بیوی نے اسے جھنجھوڑا، نام لے لے کر پکارا، آخر اس کی آہیں اور فریادیں ایک ایسی چیخ بن گئیں جس نے رات کی خاموش تاریکی کو ہلا کے رکھ دیا۔ صبح کے وقت جب بچے جاگے تو ان کا باپ ہمیشہ کے لیے سو چکا تھا۔

سر سے خاوند کا سایہ اٹھ گیا۔ ماں اندھی، بچے چھوٹے چھوٹے اور بچوں کی ماں جوان، خوبصورت اور خالی ہاتھ۔ میت کو ماں باپ اٹھا لے گئے تھے۔ انہوں نے آخری رسوم ادا کیں۔ اگر بیوہ کے پاس زیور ہوتا تو اسے بیچ کر کچھ عرصہ ماں اور بچوں کا پیٹ بھر سکتی تھی۔ زیور سسرال کے قبضے میں تھا۔ سوائے مکان کے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ ڈیڑھ دو مہینے تو روکھی سوکھی کھاتے گزر گئے۔ جب نوبت فاقوں تک پہنچی تو بیوہ کے لیے ضروری ہو گیا کہ کمانے کا کوئی ذریعہ ڈھونڈے۔ اس نے قصبے کے مڈل سکول میں ملازمت کی درخواست دی جو منظور ہو گئی۔ وہ چونکہ صرف آٹھ جماعتیں پاس تھی اس لیے اسے دوسری جماعت دی گئی اور تنخواہ صرف پچپن روپے۔ اس نے سکول جانا شروع کر دیا مگر گھر سے دن بھر کی غیر حاضری اندھی ماں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے لیے بہت ہی تکلیف دہ تھی۔ اندھی ماں بچوں کو سنبھال نہیں سکتی تھی۔ لہٰذا ضرورت یہ تھی کہ اسے کوئی ایسا کام ملے جس سے وہ فرصت نکال کر ماں اور بچوں کو دیکھ لیا کرے۔

وہ سکول جاتی رہی اور پوری کوشش کی کہ ماں اور بچے اس کی غیر حاضری میں اپنے آپ کو سنبھالنے لگیں مگر چھوٹا بچہ بہت پریشان کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بچوں کی ماں یہ بھی سوچتی تھی کہ پچپن روپے ماہوار تو ایک ہفتے کے لیے بھی کافی نہیں ہوتے۔

چنانچہ وہ کوئی اور کام تلاش کرنے لگی۔ وہ گھروں کے برتن تو نہیں مانجھ سکتی تھی۔ پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ بچوں کو پڑھا سکتی تھی یا سلائی کر سکتی تھی لیکن اسے سلائی کی جو مشین جہیز میں ملی تھی، وہ سسرال کے قبضے میں تھی۔ ایک روز وہ دل پر پتھر رکھ کر سسرال چلی گئی اور ساس سے مشین مانگی۔ ساس نے جواب دیا کہ مشین تو بیٹے کے علاج کے لیے بیچ ڈالی تھی۔ یہ سفید جھوٹ تھا۔ اس نے اپنے ماں باپ کا دیا ہوا زیور مانگا اور یہ بھی کہا کہ تمہارے بیٹے کے بچوں کو پالنے کے لیے زیور کی ضرورت ہے تو ساس نے جواب دیا کہ بچوں کو ہمارے گھر بھیج دو۔ لڑکی نے انکار کر دیا اور وہاں سے آ گئی۔

اب میں کہانی کو ایک سال آگے لے جاتا ہوں اور وہاں سے پیچھے آ کر باقی کہانی لڑکی کی زبانی سناؤں گا ___ میں قصبے سے تھوڑی دور شہر میں ملازم تھا (جس کی میں نشاندہی نہیں کرنا چاہتا) ہفتے کی شام کو گھر آیا کرتا تھا اور اتوار کو واپسی ہوتی تھی۔ جب بسیں زیادہ چلنے لگیں تو میں ہر روز گھر آنے لگا۔ دفتر سے چھٹی ہوتے ہی بس میں بیٹھے آدھے پونے گھنٹے میں گھر پہنچے، رات گھر گزاری اور دوسری صبح بہت سویرے بس میں بیٹھ کر دفتر پہنچ گئے۔ دنیا میں صرف ماں ہی ماں تھی، جو فالج کی مریض تھی۔ حملہ تو شدید ہوا تھا لیکن بروقت علاج کرانے سے وہ اٹھ کر تھوڑا سا چلنے اور ہانڈی روٹی کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ اس کی بائیں ٹانگ اور بایاں بازو ابھی کمزور تھے۔ کھل کر نہیں چل سکتی تھی۔ ڈاکٹر نے احتیاط کی تاکید کر رکھی تھی۔ قصبے میں اپنا مکان تھا۔ شہر میں مکانوں کے کرائے زیادہ تھے۔ اس لیے ہم دونوں نے پیسے بچانے کا یہی طریقہ سوچا تھا کہ شام کو آ جایا کروں اور علی الصبح چلا جایا کروں۔ مجھے تکلیف تو بہت ہوتی تھی لیکن ماں نے جس طرح مجھے بیوگی میں پالا تھا، میں اس سے بڑھ کر اس کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔

اس لڑکی کے متعلق مجھے ساری باتیں اپنی ماں سے اور اپنے دوستوں سے معلوم ہوتی رہتی تھیں۔

چھ سات مہینے بعد میرے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ وہ لڑکی خراب ہو گئی ہے اور اب ناجائز طریقے سے پیسے کما لیتی ہے۔ یہ خبر ہم سب کے لیے افسوسناک اور شرمناک

تھی۔ وہ دراصل جوان اور خوبصورت تھی۔ ہم جان گئے کہ روپے پیسے والوں نے اسے عیاشی کا ذریعہ بنا لیا ہوگا۔ خوبصورت نہ ہوتی تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجبور عورت کسی مرد کے آگے جا کر ہاتھ پھیلائے تو وہ اسے بہت ہی خوبصورت نظر آنے لگتی ہے۔

تین چار مہینے بعد ہر کسی کی زبان پر اس عورت کی بدکاری کی کہانیاں تھیں۔ میں قصبے کے رؤسا اور شرفاء میں سے ایک سے ملا اور اس کے متعلق بات کی تو اس نے نہایت افسوس سے کہا ـــــ "وہ تو پیشہ کرنے والی طوائف بن گئی ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ اسے پنچایت کے سامنے بلا کر روکیں۔ اگر وہ نہ رکے تو پولیس میں رپورٹ دیں"ـــــ میں نے اس کے ساتھ کھل کھیلنے والے مردوں کا نام پوچھا تو وہ بات گول کر گیا۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ آخر گاؤں کی بہو بیٹی ہے، اسے کیوں نہ ہم اپنی بہو بیٹی سمجھ کر اس کی مدد کریں۔ وہ جو کچھ کر رہی ہے، اندھی ماں اور معصوم بچوں کے لیے کر رہی ہے مگر قصبے کے اس ادھیڑ عمر بزرگ نے کہا ـــــ "نہ بھائی نہ، ہم تو ایسی بیسوا کے سائے سے بھی ڈرتے ہیں۔ طوائفیں کسی کی بہو بیٹیاں نہیں ہوا کرتیں۔"

پھر میں قصبے کے ایسے ہی ایک اور بزرگ سے ملا۔ وہ بھی سرکاری حیثیت والے رؤسا اور شرفاء میں سے ہیں۔ انہوں نے بالکل وہی باتیں کیں جو میں ایک بزرگ سے سن آیا تھا۔ الفاظ میں ذرا سا فرق ضرور تھا۔

تھوڑے دنوں بعد معلوم ہوا کہ اسے سکول سے نکال دیا گیا ہے۔

مجھے اس عورت کے ساتھ زیادہ ہمدردی اس وجہ سے تھی کہ وہ اپنی ماں کے لیے اپنی عزت قربان کر رہی تھی اور میں بھی اپنی ماں کی خدمت میں مگن تھا۔ میری ماں میری ساری تنخواہ پر قبضہ کر لیتی تھی جس سے مجھے خوشی ہوتی تھی۔ وہ میری شادی کے لیے پیسے الگ رکھتی رہتی تھی۔ ابھی اس نے میرے رشتے کی کہیں بات نہیں کی تھی۔

ایک شام میں گھر آیا تو تھوڑی دیر بعد یہ عورت میری ماں کے پاس آئی۔ وہ پہلے کی طرح خوبصورت تھی لیکن رنگ اڑا ہوا اور بہت پریشان نظر آتی تھی۔ میں دوسرے

کمرے میں چلا گیا۔ میری ماں کو بھی پتہ چل چکا تھا کہ یہ عورت بہت بدنام ہے۔ میری ماں فالج جیسی بیماری کی وجہ سے نماز روزے کی پابند ہو گئی اور دوسری عورتوں کی طرح کسی کے خلاف منہ سے بُری بات نہیں نکالتی تھی۔ محلے کی عورتیں اس کے پاس آ کر دوسروں کے قصے سنا جاتی تھیں لیکن اس نے کبھی ہاں میں ہاں نہیں ملائی تھی۔

جب یہ عورت اس کے پاس آئی تو اس نے اسے پیار سے اپنے پاس بٹھایا اور کہا ـــــ "میں تمہاری ماں سے بہت ہی شرمسار ہوں۔ اُدھر اس کی آنکھیں ضائع ہوئیں، اِدھر مجھ پر فالج گرا۔ ایک بار بھی اسے دیکھنے نہ جا سکی۔۔۔ تم کہو، کیسے گزر رہی ہے؟"

اس نے کہا ـــــ "خالہ جی، اندھی ماں نے مجھے بھی اندھا کر دیا ہے۔ جس ذلت میں خدا اور اس کے بندوں نے مجھے ڈالا ہے، اس سے خدا میرے دشمنوں کو بھی بچائے۔ در در ذلیل ہو رہی ہوں۔ اللہ کسی کے سر کے سائیں کو موت نہ دے۔۔۔ آج ہر طرف سے مایوس ہو کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ پانچ روپوں کی ضرورت ہے۔ بڑے بچے کو بخار ہو گیا ہے۔"

میں دوسرے کمرے میں بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بڑی دلیری سے اور جھینپ یا جھجک کے بغیر باتیں کر رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے وہ رو پڑی اور میں کتنی دیر اس کی ہچکیاں سنتا رہا۔ اچانک میں نے اپنے آپ میں زلزلے کا جھٹکا محسوس کیا جسے میں فی الواقع زلزلہ سمجھ بیٹھا۔ شاید اس عورت کی باتیں میرے دماغ میں جمع ہوتے ہوتے بارود کی طرح پھٹ گئی تھیں۔ مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ میں ماں کے کمرے میں گیا اور ماں سے اجازت لے کر اس عورت کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ میں پھر ماں کے پاس گیا اور کہا ـــــ "امّی، بُرا نہ منانا۔ میں اس کی ساری باتیں سننا چاہتا ہوں۔ اگر کچھ ہو سکا تو اس کے لیے کروں گا۔ ہو سکتا ہے خدا اسی کی دعا سے آپ کو تندرست کر دے"ـــــ میری ماں خیرات کی بہت قائل تھی۔ مجھے اس عورت کے پاس بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

میں نے اس کے سامنے بیٹھ کر کہا ـــــ "میں تمہاری مجبوریوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اب تمہارے متعلق بہت بُری باتیں سن رہا ہوں۔ اگر یہ باتیں سچّی ہیں

تو بھی میں تمہیں بے گناہ سمجھتا ہوں۔ مجھے ان مردوں کے نام بتاؤ۔ ہو سکتا ہے میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔"

اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی جس میں ایسا تاثر تھا جیسے وہ مجھ سے نفرت کر رہی ہو۔ اس نے آہستہ سے کہا — "یہ سب فریب کاری ہے۔ مجبور عورت کو ہر مرد یہی کہتا ہے کہ تمہاری مدد کروں گا۔ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ تم بھی مرد ہو۔"

میرا سر جھک گیا۔ مجھے اس سے آگے اور کوئی بات کہنی یا سننی نہیں چاہئے تھی۔ لیکن میں اپنے اندر معلوم نہیں کیا تبدیلی محسوس کر رہا تھا جو مجھے مجبور کر رہی تھی کہ اس عورت کے لیے کچھ کرنا ہے، وہ مجھے ہی کرنا ہے۔ میں نے اسے کہا — "میں مرد ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر اتنا بھروسہ ہے کہ میں دوسرے مردوں سے مختلف ثابت ہوں گا۔ مجھے بتاؤ کہ تم کس طرح جی رہی ہو؟"

اس نے جو جواب دیا وہ اس قدر عریاں ہے جسے میں اس کے الفاظ میں پیش نہیں کر سکتا پھر اس نے کہا — "تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔"

معلوم نہیں وہ کیسا شرارہ تھا جس نے مجھ سے کہلوا لیا — "میں تمہارے ساتھ شادی کر سکتا ہوں۔"

اس نے ہنس کر کہا — "دو آدمی مجھے یہی بات کہہ چکے ہیں اور تھوڑے مہینوں بعد میں ان میں سے ایک کے بچے کی ماں بن جاؤں گی اور یہ کسی کو بھی پتہ نہ چل سکے گا کہ اس بچے کا باپ کون ہے..." وہ سنجیدہ ہو گئی۔ کہنے لگی — "تم ابھی ایسی باتیں نہ سوچو۔ کوئی پاک صاف کنوارا رشتہ تلاش کرو۔ میرے ساتھ تم کیسے شادی کر سکتے ہو؟ وہ لوگ یہیں رہتے ہیں جو تمہیں طعنہ دیا کریں گے کہ تم نے ان کی چچوڑی ہوئی ہڈی منہ میں ڈال لی ہے۔"

"کون ہیں وہ؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بلا جھجک تین آدمیوں کے نام بتا دیے جن میں دو رؤسا اور شرفا میں سے تھے۔ ایک ایسے ہی بزرگ کا بیٹا تھا۔ اس عورت نے گزرے ہوئے ایک سال کی کہانی اس طرح سنائی — (میں متعلقہ افراد کے نام حذف کر رہا ہوں)

"میں سکول میں نوکری ملتے ہی سسرال سے مشین اور اپنا زیور لینے گئی تو ساس نے دونوں چیزیں دینے سے انکار کر دیا۔ میں ان بزرگوں میں سے ایک کے پاس گئی جو میرے خاوند کے آخری وقت اسے منانے آئے تھے کہ وہ اپنے گھر چلا جائے اور میں نے اسے کہا کہ مجھے سسرال سے میرے جہیز کی مشین اور میرے ماں باپ کا دیا ہوا زیور دلا دے تو اس نے ایسا رویہ اختیار کر لیا جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مجھ سے اپنی بے عزتی کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ اس نے انکار نہ کیا اور اگلے روز آنے کے لیے کہا۔ میں اگلے روز اس کی بیٹھک میں گئی۔ وہ اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے پیار سے اپنے پاس بٹھا لیا اور ہمدردی کی باتیں کرنے لگا جن کے اثر سے میرے آنسو نکل آئے۔ وہ مجھے تسلی دلاسا دینے کے لیے میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور میرے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے باپ کا ہاتھ سمجھا...

"اس کا دوسرا ہاتھ میرے گالوں پر پھرنے لگا اور میں نے غم سے نڈھال ہو کر سر اس کے کندھے پر ڈال دیا۔ اس نے اپنا گال میرے سر پہ رکھ دیا اور میرے ہاتھ کو سہلانے لگا اس کی باتوں میں پیار اور ہمدردی تھی۔ مجھے انہی دو چیزوں کی ضرورت تھی۔ اسے تم جانتے ہو، میرے باپ کی عمر کا آدمی ہے۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ابھی کسی اور سے مشین اور زیور کے متعلق بات نہ کروں۔ وہ خود ہی یہ چیزیں واپس دلا دے گا۔ جب میں وہاں سے اٹھی تو اس نے مجھے دس روپے دیے جو میں نے لے لیے۔ ہمدردی اور پیسہ ہی میری دکھتی رگیں تھیں جنہوں نے مجھے ذلیل کیا...

"دو روز بعد میں پھر اس کے پاس گئی۔ وہ گھر میں اکیلا تھا۔ اس کے بیوی بچے کہیں شادی پر گئے ہوئے تھے۔ اس نے دیکھتے ہی لپک کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا پھر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس کی باتوں میں ہمدردی اور پیار تو ضرور تھا لیکن رنگ بدلا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میرے جسم پر رینگنے لگے اور میں سمجھ گئی کہ ہم باپ بیٹی نہیں بلکہ مرد اور عورت ہیں۔ میں نے اس سے ذرا دور ہٹنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے بازو کے گھیرے سے نکلنے نہ دیا۔ وہ ہنس پڑا اور بولا کہ تم تو ڈر گئی ہو۔ میں واقعی ڈر گئی تھی۔ اس نے ایسے الفاظ میں میرا ڈر دور کر دیا کہ میں شرمسار بھی ہوئی کہ ایک

بزرگ پر کیسا گھٹیا شک کر بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے مشین اور زیور دلانے کا وعدہ کیا اور دس روپے دے کر کہا کہ پیسوں کے لیے پریشان نہ ہوا کرو۔ اللہ نے بہت دے رکھا ہے...

"اسے واقعی اللہ نے بہت پیسہ دیا ہے۔ آڑھتی ہے۔ میں اس کے پاس چار پانچ دفعہ گئی۔ ان ملاقاتوں میں وہ میرے ساتھ پوری طرح بے تکلف ہو گیا۔ ایک روز اس نے صاف الفاظ میں اپنا مطلب بیان کر دیا اور کہا کہ ہر بار پچاس روپے دیا کروں گا۔ میری جو حالت ہوئی وہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ ایسا چکر آیا کہ پسینہ پھوٹ پڑا۔ میں وہاں سے بھاگ کر نکل آئی...

"دوسرے دن ہی سکول سے فارغ ہو کر گھر آئی۔ ماں اور بچوں کو روٹی دی اور ایسے ہی ایک اور بزرگ کے پاس چلی گئی جو لوگوں کے گھروں کے جھگڑے اور تنازعے طے کیا کرتے ہیں۔ اسے بھی یہی کہا کہ مجھے سسرال سے مشین اور زیور دلا دے۔ اس نے بھی وعدہ کیا کہ وہ پوری کوشش کرے گا۔ دو روز بعد وہ خود ہمارے گھر آ گیا اور ہمدردی کی باتیں کر کے میرے بچوں کو پانچ پانچ روپے دیے اور چلا گیا۔ تین چار روز بعد وہ پھر ہمارے گھر آیا اور بتایا کہ وہ میرے سسر سے ملا تھا اور سسر نے اسے وہی جواب دیا ہے جو ساس نے مجھے دیا تھا۔ جب وہ جانے لگا تو میں اس کے ساتھ ڈیوڑھی تک چلی گئی۔ اس نے جیب سے بیس روپے نکالے اور میرے ہاتھ میں دے کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگا کہ تمہارے ساتھ ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا بات کرے گا۔ لیکن وہ دونوں نوٹ ڈیوڑھی میں پھینک کر چلا گیا...

"میرے دل میں آئی کہ اس سے پوچھ ہی لوں کہ وہ کیا بات کرنا چاہتا ہے۔ میں اس کے گھر جانے سے ڈرتی تھی لیکن اس نے میری مشکل آسان کر دی۔ دوسرے دن وہ خود ہی آ گیا۔ میں اسے دوسرے کمرے میں لے گئی اور پوچھا کہ وہ کیا بات تھی۔ بات بس اتنی سی تھی کہ وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا حالانکہ اس

کی بیوی زندہ تھی اور اس کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ سب سے بڑا لڑکا میرا ہم عمر تھا۔ اس آدمی نے پہلے تو اپنی بیوی کے خلاف ایک لمبی کہانی سنائی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی بیوی نری گائے ہے۔ اس کے جذبات کو نہیں سمجھتی وغیرہ۔ پھر اس نے بیوی کی ایسی بھیانک تصویر پیش کی کہ میں خوفزدہ ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے میری جوانی اور خوبصورتی کو بیان کیا اور آخر میں کہا کہ میں اس کے ساتھ شادی کر لوں...

"میں صاف انکار کر دینا چاہتی تھی لیکن اس آدمی سے کام نکلوانا تھا۔ اس لیے اسے یہ جواب دیا کہ میں اپنی اندھی ماں اور بچوں کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ شادی کے متعلق بھی سوچوں گی۔ میرے اس جواب نے اسے بہت حوصلہ دیا۔ میں اس سے پہلے ایسے ہی ایک آدمی سے مل چکی تھی۔ جس نے مجھے بتا دیا تھا کہ مرد عورت سے کیا چاہتا ہے۔ اب میں نے ایسے مردوں کو انگلیوں پر نچانے کا فیصلہ کر لیا مگر میں نے یہ نہ سوچا کہ یہ مرد گھاگ ہیں اور میں ناتجربہ کار۔ وہ دوسری تیسری شام ہمارے گھر آ جاتا۔ میری ماں کے پاس بیٹھ کر اس کی دلجوئی کرتا، میرے بچوں کے ساتھ کھیلتا۔ پھر میرے ساتھ الگ کمرے میں بیٹھ جاتا۔ یہ بات تو وہ کئی بار کہہ چکا تھا کہ اس گھر میں آ کر مجھے سکون نصیب ہوتا ہے۔ ماں باپ نے سترہ سال کی عمر میں اس اجڈ بیوی کے حوالے کر دیا تھا۔ چھبیس سال گزر گئے ہیں۔ وہ ارمان دل ہی میں مر گئے ہیں جو جوانی میں رنگ دکھایا کرتے ہیں۔ مجھے خدا نے چھپر پھاڑ کر دولت دی ہے لیکن میری زندگی کو مسرتوں سے محروم کر رکھا ہے...

"اس کی باتوں میں رومان اور آہیں زیادہ ہوتی تھیں۔ جب ہماری بے تکلفی بڑھی تو میں اس کے ساتھ اپنے خاوند کی باتیں کرنے لگی اور اسے بتایا کہ میرے ارمانوں کو اس کی بڑی بھابھی اور ساس نے کچل دیا تھا۔ خاوند میرے پاس اس وقت آیا جب دق کے جراثیم اس کی جوانی کو کھا چکے تھے...

"ہم دونوں ایسی باتیں کہتے سنتے رہتے تھے۔ اس کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ تھی [illegible] عمر چھبیس سال لیکن وہ باتیں ایسی کرتا تھا کہ وہ مجھ سے چھوٹا نظر

آنے لگتا تھا۔ شادی کی توقع سے وہ مجھے پیسے بھی دیتا تھا اور ایک رات وہ
بہت دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا۔ میری ماں اور بچے سو گئے تھے۔ کچھ نیند کا خمار
تھا اور کچھ اس کی باتوں کا اثر کہ میں اپنا آپ اس کے حوالے کر بیٹھی۔ وہ تو چلا گیا
مگر میں رات بھر سو نہ سکی۔ صبح ہوئی تو مجھے اس طرح ڈر آنے لگا جیسے ساری دنیا
کو میرے گناہ کا علم ہو گیا ہو۔ میرا سر جھک گیا۔ نظریں جھک گئیں اور میں محلے کے ہر
انسان سے ڈرنے لگی . . .

" وہ دوسری رات بھی آیا۔ میں نے اس سے دور رہنے کی کوشش کی مگر وہ
ایک جادو کی طرح مجھ پر غالب آچکا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ گناہ مجھے کس طرح بندے
بندے سے ڈرا رہا ہے۔ یہ سن کر اس نے ایسی باتیں شروع کر دیں کہ میرا ڈر دور
ہو گیا۔ میں دراصل ایسی ہی باتیں سننا چاہتی تھی جو میرے ضمیر سے گناہ کا بوجھ آتار
دیں۔ وہ ایسی باتیں نہایت خوبی سے کر سکتا تھا۔ اس نے باتوں کے جادو سے مجھے
گناہ کے بوجھ سے آزاد کر دیا ——— اور اس طرح میں ایسے جال میں پھنس گئی جس
سے نکلنا بہت مشکل ہو گیا . . .

" ہزار باتیں بناؤ، گناہ اپنے آپ کو چھپا نہیں سکتا۔ اس کا ہر رات میرے پاس
آنا چھپ نہ سکا۔ ایک روز وہ بزرگ ملا جس کے پاس میں سب سے پہلے گئی تھی اور
اسے دھتکار آئی تھی۔ اس نے مجھے راستے میں روک کر کہا کہ پرسوں میری بیٹھک میں
آنا، بہت ضروری بات ہے . . . میں اس کی بیٹھک میں گئی تو اس نے مجھ سے یہ
پوچھے بغیر کہ اس آدمی کے ساتھ میرے تعلقات کیسے ہیں، مجھے کہا کہ تم نے مجھے ٹھکرا
دیا تھا اور ایک بدکار آدمی کے ہاتھ جا لگی۔ کیا میں اتنا ہی بُرا تھا؟ اس نے جیب
سے دس دس کے تھوڑے سے نوٹ نکالے اور میرے ہاتھ میں دے کر کہا ''جاؤ
بس یہی بات کہنی تھی۔ آئندہ جتنے پیسوں کی ضرورت ہو مجھ سے لے جایا کرنا۔ میں
ایسا کمینہ آدمی نہیں ہوں۔ اس سے بچو، جو ہو گیا سو گیا۔''

" میں نے گھر آکر دیکھا کہ دس دس کے چھ نوٹ تھے . . .

" مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ میں کس ذلیل جال میں الجھتی چلی جا رہی ہوں۔ اس
ت میرا دوسرا امیدوار میرے گھر آیا تو میں نے بڑی دلیری سے کہہ دیا کہ وہ آئندہ
ے گھر نہ آیا کرے۔ اس نے مجھے ہنسی مذاق سے، لالچ سے اور پھر دھمکیوں سے
ی بات پر لانے کی کوشش کی لیکن مجھے ایک اور آدمی کا سہارا مل گیا تھا جس
نے میرے جسم کو ہاتھ لگائے بغیر مجھے پیسے دے دیے تھے۔ وہ واقعی فرشتہ تھا۔ پہلے
یں اسے غلط سمجھی تھی . . .

" یہ آدمی چلا تو گیا لیکن نہایت غلیظ دھمکی دے کر۔ میں دوسرے دن سکول گئی۔
ابھی ایک ہی گھنٹہ پڑھایا تھا کہ ہیڈ مسٹرس نے مجھے دفتر میں بلا کر کہا کہ تمہارے لیے اب
کوئی جگہ نہیں رہی۔ ہمیں ایس وی پاس استانی مل گئی ہے۔ میں سمجھ گئی کہ یہ کس کی
کارستانی ہے۔ اس روز کے بعد مجھے عورتوں کی زبانی پتہ چلنے لگا کہ مجھے بدنام کرنے کی
ایک مہم شروع کر دی گئی ہے۔ ہر روز ایک عورت آجاتی اور میرے کان میں کچھ نہ کچھ
کہہ جاتی۔ مجھے قصبوں کے بدمعاشوں کے ساتھ منسوب کیا جا رہا تھا۔ میں گلی میں سے
گزرتی تو لڑکے میرے قریب سے گزرتے نہایت فحش باتیں کہہ جاتے۔ سب کو معلوم تھا کہ
یہ بے بس عورت ہے، کچھ نہیں کر سکتی . . .

" میں دوسرے بزرگ کے پاس جا کر روئی تو اس نے مجھے سینے سے لگا لیا اور کہا فکر نہ
کرو، میں بندوبست کر لوں گا۔ اس نے واقعی بندوبست کرنے کی کوشش کی جس کے
نتیجے میں یہ دونوں آدمی آپس میں کہیں جھگڑے بھی تھے۔ میں جسے مخلص اور اپنا محافظ
سمجھتی تھی میرے گھر آنے لگا۔ باہر میرے خلاف طوفان اٹھا ہوا تھا۔ مجھے اب اس آدمی
کا سہارا تھا۔ پچپن روپے تنخواہ بند ہو چکی تھی۔ میں نے اس آدمی سے پیسے نہ مانگے
ایک ایسا دن آیا کہ گھر میں آٹا بھی نہیں تھا۔ پیسہ ایک نہ تھا۔ میں ایک گھر سے آٹا ادھار
مانگ لائی اور ماں اور بچوں کو روٹی کھلائی . . .

" اسی شام یہ آدمی میرے گھر آگیا۔ میں نے اسے بتایا کہ گھر میں کچھ نہیں رہا۔ اس
نے شیروانی کی جیب سے ایک سو کا نوٹ نکال کر مجھے دے دیا اور ساتھ ہی ڈانٹ بھی

دیا کہ میں نے اسے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ میں ناتجربہ کار
اور مجبور تھی۔ اس بزرگ کی شفقت کا رنگ بدلنے لگا اور بات وہیں پہ جا پہنچی مگر
میں نے ضمیر پر کوئی زیادہ بوجھ محسوس نہ کیا۔ میں نے سوچا کہ یہ میرا محسن ہے، میرے پاس
اپنے جسم کے سوا اور ہے ہی کیا جس سے اس کی نیکیوں کا صلہ دوں ـــ اس رات
کے بعد وہ تیسری چوتھی رات میرے پاس آنے لگا۔۔۔

"ایک روز گرمیوں کی دوپہر تھی۔ لوگ گھروں میں بند تھے۔ میں گاؤں کے
دوسرے بزرگ کے گھر کے سامنے سے گزری تو اس کا بڑا بیٹا دروازے سے نکل رہا
تھا۔ تم اسے جانتے ہو کتنا جوان اور خوبصورت ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر میرا بازو پکڑ لیا
اور مجھے اندر لے گیا۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ گھر والے شاید کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔
وہ مجھے کمرے میں لے گیا اور اپنے باپ کو گالیاں دینے لگا۔ کہنے لگا کہ ہے تو میرا باپ
لیکن پکا بدقماش اور بدکار آدمی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس نے تمہیں بہت خراب کیا
ہے۔ اگر تم اسی طرح اکیلی پھرتی رہی تو لوگ تمہاری بوٹیاں بھی نوچ لیں گے۔ اگر تمہارا
دل مانے تو میں تمہارے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔۔۔

"مجھے آگ لگ گئی۔ میں نے جل کر کہا ـــ 'جیسا باپ ویسا بیٹا'، میں تم دونوں کے
منہ پر تھوکتی ہوں'ـــ اس نے منہ آگے کر کے بڑی لجاجت سے کہا ـــ 'لو تھوک لو۔
اگر تمہارا غصہ تھوکنے سے ٹھنڈا ہو سکتا ہے تو میرا منہ حاضر ہے۔ میں اپنے باپ کے
گناہ کی سزا بھگت لیتا ہوں'ـــ میں اسی بات سے موم ہو گئی اور رونے لگی۔ اس
نے بڑے پیار سے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا اور ہمدردی کی باتیں شروع کر دیں۔ زیادہ
لمبی چوڑی باتیں کیا سناؤں۔ میں گناہگار تو ہو ہی چکی تھی۔ اس کی باتوں میں
آ گئی۔ اس نے شادی کا پکا وعدہ کیا اور مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے، میری ماں اور بچوں
کو کہیں اور لے جائے گا۔ اس وعدے نے مجھے اس کی بے نکاحی بیوی بنا دیا۔۔۔

"تم نے سنا ہو گا کہ یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے سے ہاتھا پائی تک بھی آ گئے
تھے اور خون خرابا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ ظاہری طور پر وہ لڑے کسی اور بات پر
تھے لیکن لڑائی کی اصل وجہ میرا وجود تھا۔ اس کے بعد تینوں مجھ سے کنارہ کش ہو گئے۔

انہیں بدنامی کا ڈر تھا مگر وہ بدنام ہو کر بھی نیک نام ہیں۔ وہ اب بھی پنچ ہیں اور لوگوں
کے گھریلو جھگڑوں کے فیصلے کرتے ہیں۔ میں ان کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ میں
مجبور اور بے بس ہوں۔ کل سے پھر وہ وقت آ گیا ہے کہ گھر میں کھانے کے لیے کچھ
نہیں لیکن جو غم مجھے کھا رہا ہے وہ بھوک کا نہیں، وہ یہ ہے کہ میں ان تینوں کے
فریب کا بوجھ اپنے جسم میں اٹھائے پھرتی ہوں۔ اگر ماں اور یہ دو بچے نہ ہوتے تو
میں اپنے آپ کو ختم کر دیتی۔ مجھے معلوم نہیں میرے تیسرے بچے کا باپ کون ہے۔
معلوم ہو بھی جائے تو وہ مان تھوڑے ہی جائے گا۔"

میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا اور خون کھول
رہا تھا۔ میں نے بے اختیار کہا ـــ "تمہارے تیسرے بچے کا باپ میں ہوں گا۔
میں تمہارے ساتھ شادی کروں گا۔"

اس نے شاید جان لیا تھا کہ میں اسے فریب نہیں دے رہا۔ وہ مجھے اس
ارادے سے باز رہنے کے لیے کہنے لگی کہ میں بدکار اور ناپاک عورت ہوں۔ تم بھی
گاؤں میں بدنام ہو جاؤ گے لیکن مجھے کسی کا ڈر نہیں تھا کیونکہ میں ایسے محکمے میں ملازم
ہوں جس کے چپڑاسی کو بھی قصبوں اور گاؤں کے پنچ جھک کر سلام کرتے ہیں۔ میں
نے اس مظلوم عورت کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ میں کیا کروں گا اور اسے کیا کرنا ہے۔ میں
نے اسے پانچ روپے دے دیے جو وہ مانگنے آئی تھی۔ میں کوئی دولت مند تو
نہیں تھا کہ اسے گنے بغیر دس دس کے سات آٹھ نوٹ دے دیتا۔

میں نے ماں سے کہا کہ میں اس عورت کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں تو وہ
حیرانی سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ میں نے اسے ساری بات سنا کر کہا کہ امی، خدا اسی
نیکی کے بدلے آپ کو تندرست کر دے گا۔ ماں مان تو گئی مگر بڑی مشکل سے۔

میں دوسری صبح دفتر گیا اور تین روز کی چھٹی لے لی۔ طے کیے ہوئے پروگرام
کے مطابق میں قصبے کے سارے بڑوں سے ملا جن کی تعداد چھ تھی اور انہیں کہا
کہ ایک ایسا مسئلہ درپیش ہے جو صرف آپ لوگ حل کر سکتے ہیں۔ پانچ اور معززین

کو بھی بلا لیا اور مسجد کے خطیب کو بھی مع رجسٹر نکاح بلا لیا۔ میں نے اسے بالکل نہ بتایا
کہ کس کا نکاح پڑھنا ہے۔ جب سارے افراد میرے گھر آ گئے تو میں نے کہا کہ میں نے
آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ میں فلاں مرحوم کی بیٹی اور فلاں مرحوم کی بیوہ کے
ساتھ نکاح پڑھوانا چاہتا ہوں۔ وہ چونکہ بیوہ ہے اور غریب بھی ہے اس لیے میں
صرف آپ صاحبان کی موجودگی میں نہایت سادگی سے یہ رسم پوری کرنا چاہتا ہوں۔
ایک صاحب نے کہا — "بیٹا، تم نوکری کی خاطر باہر رہتے ہو۔ اس لیے تمہیں
معلوم نہیں کہ یہ عورت داغدار ہے۔ اس کا چال چلن بہت خراب ہے" — یہ صاحب
وہی تھے جنہوں نے اس عورت کو گناہ کے راستے پر ڈالا تھا۔ اس کی تائید میں دو تین
اور آدمی بول پڑے اور جو صحیح معنوں میں معززین تھے، ان میں سے دو نے مجھے پورے
خلوص سے کہا کہ تمہارے لیے اچھے رشتوں کی کوئی کمی نہیں، ایسا مشکوک رشتہ نہ کرو۔
تم عزت دار خاندان کے نوجوان ہو۔ یہ عورت تمہیں دھوکا دے گی۔

میں ایسی ہی باتوں کا منتظر تھا۔ میں نے پردے اٹھانے شروع کر دیے اور کہا۔
"میں کسی کا نام لیے بغیر کہتا ہوں کہ اس عورت کو گاؤں کے بزرگوں نے بدکار بنایا ہے۔
وہ بزرگ اس مجلس میں موجود ہیں۔ ان کا فرض یہ تھا کہ وہ عورت کے سر پر ہاتھ رکھتے۔
وہ سب کی بیٹی تھی مگر وہ اپنے باپوں کے پاس گئی تو ان سے عزت لٹا کر آ گئی۔ آپ
میں سے کوئی صاحب یہ ثابت کر دیں کہ اس عورت نے کسی کے پاس جا کر یہ کہا ہو کہ
مجھے اتنے پیسے دے کر میرے جسم سے کھیل لو۔ مگر میں آپ سب کو خبردار کرتا ہوں کہ اگر
آپ میں سے کسی نے بھی ایسا ثبوت پیش کرنے کی کوشش کی تو میں اسے قصبے کے
چوک میں کھڑے ہو کر ننگا کر دوں گا" — میں اٹھا اور الماری میں سے قرآن کریم نکال
کر گاؤں کے اس پنچ کے آگے کر دیا جس نے سب سے پہلے لڑکی کی عزت ناپاک
کی تھی اور مجلس میں سب سے پہلے کہا تھا کہ یہ عورت داغدار ہے۔ میں نے قرآن اس
کے آگے کر کے کہا — "چچا جان! اس پاک کلام پر ہاتھ رکھ کر ایک بار پھر کہیں کہ یہ
عورت داغدار ہے اور یہ بھی بتائیں کہ اسے مجبوری کی حالت میں کس نے داغدار کیا؟"

مجلس پر سناٹا طاری ہو گیا۔ میں نے قرآن گود میں رکھ لیا اور کہا — "اس محلے
پر خدا کی لعنت برسے گی جہاں کے بزرگوں نے اپنی بیٹی کے ساتھ منہ کالا کیا۔ آج اس عورت
کے جسم میں اپنے باپوں کا گناہ پرورش پا رہا ہے۔ گناہ کس نے کیا اور سزا کسے ملی۔
وہ تمہارے پاس اس لیے گئی تھی کہ اسے سسرال سے سلائی کی مشین اور زیور
واپس دلا دو جس سے وہ اپنی اندھی ماں اور دو بچوں کو روٹی کھلا سکے۔ تم نے
اسے پیسے دیے اس کی عزت سے کھیلے . . . لاؤ مولوی صاحب نکاح کا رجسٹر کھولو۔
عورت میرے گھر میں موجود ہے۔ اس سے پوچھ لو کہ میں نے اسے لالچ یا دھمکی سے
شادی کے لیے تو راضی نہیں کیا؟ . . . . اور میں قرآن پاک کو سامنے رکھ کر کہہ رہا ہوں
کہ اس عورت کے تیسرے "بچے" کا باپ اس دنیا سے سکھی نہیں جائے گا۔"

مجلس کا سناٹا اور گہرا ہو گیا۔ مولوی صاحب نے مجھ سے کلمے پڑھوائے اور نکاح
کے رجسٹر پر دستخط کرائے۔ پھر دو آدمی میری راہنمائی میں اندر گئے جہاں مظلوم بیوہ بیٹھی
ہوئی تھی۔ اس سے ایجاب و قبول کرا یا اور رجسٹر پر دستخط کروا لیے۔ حاضرین کو صرف
چائے پلائی اور میں نے انہیں آخری بات یہ کہی کہ اب یہ بیوہ میری بیوی ہے۔ اگر
اب گاؤں میں اس کے خلاف کسی نے بات کی تو میں اصل مجرموں کو سب کے سامنے
لے آؤں گا اور ثبوت پیش کروں گا۔

میرا ایک ایک لفظ اصل مجرموں کے دلوں سے تیر کی طرح پار ہوتا جا رہا تھا۔
اچانک کسی نے بلند آواز سے کہا — "شاباش کہو گاؤں کے اس بیٹے کو . . . بیٹا
ہم تمہارے ساتھ ہیں" — اس آواز سے مجلس میں جان پڑ گئی اور مجھے ہر طرف سے
شاباش ملنے لگی۔

مجلس برخاست ہوئی۔ میں نے اپنی بیوی کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی ماں
کے پاس رہے یا اسے اور اپنے بچوں کو میرے گھر میں لے آئے لیکن اس کا گھر زیادہ
کھلا تھا۔ اس لیے میں اپنی ماں کو اس کے گھر لے گیا اور ہم ہنسی خوشی رہنے لگے۔ میں
نے بیوی سے کہا کہ گردن اونچی کر کے گاؤں میں گھومو پھرو۔ کہیں سے کوئی ایسی ویسی
بات سنو تو مجھے بتاؤ لیکن اس کے خلاف جو طوفان اٹھا تھا وہ بالکل ختم ہو گیا کیونکہ

طوفان اٹھانے والے خود مجرم تھے۔

میں نے آپ کو یہ کہانی اس لیے نہیں سنائی کہ آپ بھی مجھے شاباش کہیں۔
میں جو اصل بات سب کو سنانا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ ایک سال کے اندر اندر بغیر کسی علاج کے میری ماں کی بائیں ٹانگ اور بازو جو فالج سے نیم جان ہو گئے تھے، بالکل ٹھیک ہو گئے اور خون سارے جسم میں نہایت اچھی طرح دورہ کرنے لگا۔
دوسرا معجزہ یہ ہوا کہ اسی ایک سال کے اندر اندر میری یہ بات پوری ہو گئی جو میں نے نکاح کی مجلس میں کہی تھی —— "میں قرآنِ پاک سامنے رکھ کر کہ رہا ہوں کہ اس عورت کے تیسرے بچے کا باپ اس دنیا سے سکھی نہیں جائے گا" —— یہ وہ بزرگ تھا جس نے میری بیوی کے ساتھ پہلی بار گناہ کر کے باتوں کے جادو سے اس کے ضمیر سے گناہ کا بوجھ اتارا اور اسے گناہ کا نشانہ بنائے رکھا تھا۔
اسے جوڑوں کا درد شروع ہوا۔ اس نے قصبے کے ڈاکٹروں اور حکیموں سے علاج کرایا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اس کے پاس دولت تھی جو اس نے پانی کی طرح بہا دی۔ لاہور کے بڑے بڑے ڈاکٹر آزما دیکھے۔ آخر وہ اس حالت میں ہمیشہ کے لیے چارپائی پر گر پڑا کہ اس کی مٹھیاں بالکل بند ہو گئیں۔ انگلیاں اکڑ گئیں، گھٹنے ایک ہی زاویے پر دوہرے ہو گئے اور وہ بالکل اپاہج ہو گیا۔
ایک رات اس نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ میں گیا تو وہ بہت ہی رویا۔ روتے روتے اس نے کہا —— "میں تمہاری بیوی کی جوتیوں کی مٹی کھانا چاہتا ہوں۔ شاید اس سے مجھے افاقہ ہو جائے۔ مجھے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے، اس کے "تیسرے بچے" کا باپ میں ہی ہوں" —— اس نے ذرا سی کروٹ بدل کر کہا۔ "سرہانے کے نیچے ہاتھ ڈالو اور یہ نوٹ نکال لو"۔ میں نے سرہانے کے نیچے ہاتھ کیا تو میرے ہاتھ میں نوٹوں کا بنڈل آیا جو میں نے نکال لیا۔ اس نے کہا —— "یہ سات ہزار روپیہ ہے، تم لے جاؤ اور خدا کے لیے اپنی بیوی سے کہنا کہ مجھ گناہگار کو بخش دے"۔ —— میں نے یہ رقم لینے سے انکار کر دیا۔ وہ بہت رویا اور ضد کرنے لگا کہ میں

یہ رقم قبول کر کے اس کے ضمیر سے گناہ کا بوجھ اتار دوں۔ میں نے اسے کہا کہ یہ رقم غریبوں میں تقسیم کر کے اللہ سے گناہوں کی معافی مانگو۔
"تم نے سچ کہا تھا"۔ اس نے کہا "کہ اس عورت کے تیسرے بچے کا باپ دنیا سے سکھی نہیں جائے گا۔ میری اب یہ حالت ہے کہ میری اولاد بھی میرے قریب نہیں آتی۔ نوکر بستر اور کپڑے بدلواتا ہے ورنہ میں اپنی غلاظت میں پڑا رہتا ہوں"۔
دوسری شام وہ مر گیا۔
خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے میری نیکی قبول کر لی ہے۔ شادی کیے چار سال گزر گئے ہیں، بہت اچھے گزرے ہیں اور آئندہ بھی اچھے گزریں گے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میں سکھی مروں گا۔

خُدا کے لیے مجھے قبُول کرلو

امجد حسین لودھی

میں بہت ہی بدصورت آدمی ہوں اور میری بیوی خوبصورت ہے ۔ وہ گورے رنگ کی لڑکی ہے اور میرا چہرہ سیاہ کالا ہے ۔ ہماری مثال ایسی ہی ہے جیسے چاند گھٹا میں چھپا ہوا ہو۔ یہ انسانی زندگی کا ایسا ڈرامہ ہے جو میرے لیے تو بہت حسین ثابت ہوا مگر اس کے پسِ منظر میں فریب کاری اور عیّاری کار فرما ہے۔

جب پاکستان بنا، میری عمر بارہ سال تھی۔ میں ترن تارن (ضلع امرتسر) سے تھوڑی دور چھوٹے سے ایک گاؤں سے ہجرت کر کے پاکستان میں آیا تھا ۔ یہ تو مجھے یاد نہیں کہ مہینہ کونسا تھا۔ ذہن میں اُس وقت کی جو یادیں رہ گئی ہیں وہ خون میں ڈوبی ہوئی ہیں ۔ رات کا وقت تھا۔ میں بارہ سال کا بچّہ تھا اور بارہ سال کے بچوں کی طرح بے فکری کی نیند سویا ہوا تھا۔ یہ تو ہم ہر روز سنتے تھے کہ ہندو اور سکھ مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں لیکن یہ کبھی یقین نہیں کیا تھا کہ میرے ماں باپ اور بھائیوں اور بہنوں کو بھی کوئی قتل کر سکتا ہے اور یہ تو میں بھی ماننے کو تیار نہیں ہوا تھا کہ لچھمن سنگھ جسے میں چاچا لچھو کہا کرتا تھا اور فوجا سنگھ جسے میں اپنے سگوں کی طرح فوجو ماماں کہا کرتا تھا اور شمشیر سنگھ جو میرے باپ کا گہرا دوست تھا اور جو میرے ساتھ بہت ہی پیار کیا کرتا تھا اور ایسے وہ سارے ہی سکھ جو میرے چچے، تائے اور ماموں تھے، اپنے ہاتھوں میرے گھر کو آگ لگا کر میری ماں، میرے باپ، میرے دونوں بڑے بھائیوں اور دو بہنوں کو زندہ جلا ڈالیں گے ۔

میں جس رات کی بات کر رہا ہوں، میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ چیخوں اور تڑاخ

تڑاخ سے میری آنکھ کھل گئی۔ گرمیوں کا موسم تھا اور ہم سب صحن میں سوئے ہوئے تھے۔ آنکھ کھل گئی تو میں سمجھا کہ بہت ہی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ ہمارا مکان جل رہا تھا۔ "تڑاخ تڑاخ" چھت کی لکڑیوں اور دروازوں کے جلتے کواڑوں کی تھی۔ میں سخت خوفزدہ ہو کر چارپائی سے اٹھا اور بڑے ہی زور سے ماں کو پکارا لیکن صحن کی ساری چارپائیاں خالی تھیں۔ گھر کا کوئی فرد نظر نہیں آ رہا تھا۔ شعلوں نے دن کا منظر بنا رکھا تھا۔ مجھے بہت سارے سکھ کھلے صحن میں بھاگتے دوڑتے نظر آئے ۔

میں جن چیخوں سے جاگا تھا، وہ اب خاموش تھیں۔ اب یاد آتا ہے کہ وہ میری ماں، میرے باپ، بھائیوں اور بہنوں کی اُس وقت کی چیخیں تھیں جب سکھوں نے انہیں اٹھا اٹھا کر جلتی آگ میں زندہ پھینکا تھا۔ میں فوراً چارپائی کے نیچے چھپ گیا۔ نیچے سے شعلوں کی روشنی میں میں نے گاؤں کے چچوں، تاؤں اور ماموؤں کو دیکھا مگر اب وہ ہمارے کچھ نہیں لگتے تھے ۔ وہ سب سکھ تھے ۔ جو مسلمانوں کو پاکستان بنانے کی سزا دے رہے تھے۔ میں محض چھوٹا بچّہ تھا جسے ہر خطرے اور خوف سے محفوظ رکھنے والوں کو زندہ جلا دیا گیا تھا۔ میں زور زور سے چیخیں مارنا چاہتا تھا مگر میں نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ شعلے اتنے اونچے اور میرے اس قدر قریب تھے کہ مجھے جھلسانے لگے ۔

سکھ ہمارے مویشیوں کو کھول کر لے جا رہے تھے۔ دو سکھ خالی چارپائیاں اور بستر اٹھا اٹھا کر شعلوں میں پھینکنے لگے۔ جب انہوں نے میرے اوپر سے چارپائی اٹھائی تو میرے منہ سے بہت ہی زور سے چیخ نکلی۔ ایک نے بلند آواز سے ہنس کر کہا ـــ "اوئے اک ہور وی جے "ـــ (ایک اور بھی ہے) ـــ اس نے میرے ایک بازو کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اٹھایا اور اس طرح جلتے مکان میں پھینک دیا جیسے دور سے آگ میں لکڑی پھینکی جاتی ہے۔

یہ میری خوش نصیبی تھی بلکہ بہت بڑی بدنصیبی کہ ایک چارپائی نے مجھے جل مرنے سے بچا لیا۔ یہ معجزہ اس طرح رونما ہوا کہ مجھے آگ میں پھینکنے سے پہلے دوسرے سکھ نے چارپائی پھینکی۔ میں چارپائی کے ساتھ جا لگا ورنہ میں سیدھا شعلوں کے اندر جاتا ۔ میں

چارپائی سے لگ کر گرا تو چارپائی نے آگ پکڑ لی جس سے میرے چہرے کا دایاں حصّہ جل
گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میری چیخ نکلی تھی یا نہیں، بس یہ ضرور یاد ہے کہ میں صحن کی طرف
بھاگا۔ ڈیوڑھی کے ایک دروازے سے داخل ہوا اور دوسرے دروازے باہر نکل گیا۔
اور میں اندھا دھند بھاگتا ہی چلا گیا۔ دائیں طرف سے چہرہ اس قدر درد کر رہا تھا جیسے
ابھی تک جل رہا ہو۔

سارا گاؤں جل رہا تھا اور میں بارہ سال کی عمر کا بچہ، دوڑتا ہی چلا جا رہا تھا۔
مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ کس طرف جا رہا ہوں اور کب تک دوڑتا چلا جاؤں گا۔ میں
نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ شاید میں پانی کے کھیتوں میں کئی بار گرا تھا، مگر گرتے ہی اٹھا اور
پھر دوڑنے لگا۔ میں اُس وقت کے خوف اور دل کی حالت کو بیان نہیں کر سکتا۔ دوڑتے
دوڑتے مجھے معلوم ہوا کہ ٹانگوں اور جسم کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ اس سے آگے میں
نہیں بتا سکتا کہ میں کہیں گر پڑا تھا اور سو گیا تھا یا بے ہوش ہو گیا تھا یا سوتے سوتے
دوڑتا رہا تھا۔

جب آنکھ کھلی تو میری چیخ نکل گئی اور میں دوڑنے کے لیے اٹھنے لگا لیکن
کسی نے مجھے وہیں دبوچ لیا۔ وہ کوئی سکھ ہی ہو سکتا تھا۔ میں اس سے آزاد ہونے
کے لیے تڑپنے لگا تو مجھے آواز سنائی دی ——— "ڈر نہ پُتر۔ ہن توں ساڈے کول ایں
اسے تے پاکستان اے" ——— (ڈرو مت بیٹا۔ اب تم ہمارے پاس ہو۔ یہ تو پاکستان ہے)
میں نے منہ اور سر پہ ہاتھ پھیرا تو چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ جلن محسوس نہیں ہو رہی تھی
پاؤں بھی پٹیوں میں لپٹے ہوئے تھے جو کھیتوں میں بھاگتے وقت کانٹوں اور پتھروں
سے زخمی ہو کر سوج گئے تھے۔

یہ لاہور کا کوئی ہسپتال تھا۔ میں آج بھی نہیں بتا سکتا کہ مجھے پاکستان کے
اس ہسپتال تک کس نے پہنچایا تھا۔ شاید مہاجروں کے کسی قافلے نے راستے میں
مجھے اٹھا لیا ہو گا۔ میں کہیں راستے میں ہی بے ہوش پڑا ہوا ہوں گا۔ بیس پچیس
دنوں میں میرے چہرے اور پاؤں کے زخم ٹھیک ہو گئے اور ایک روز مجھے بہت
سے دوسرے زخمی مہاجرین کے ساتھ ایک ایمبولینس میں بٹھا کر [illegible] کیمپ

میں بھیج دیا گیا۔ وہاں مجھ جیسے بچوں اور بڑوں کا ایک ہجوم تھا اور میں اس ہجوم
میں اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کو ڈھونڈنے لگا۔ میں روتا تھا اور ریفیوجی کیمپ
کے کونے کونے میں دوڑ دوڑ کر انہیں تلاش کرتا تھا۔ بعض اوقات تو میں ایک جگہ
کھڑا ہو کر اتنے زور زور سے رونے لگتا تھا کہ دو چار آدمی مجھے بہلا کر اپنے ساتھ لے
جاتے تھے۔ روٹی کھلاتے اور پوچھتے تھے کہ میں کس کا بیٹا اور کہاں کا رہنے والا ہوں۔
پھر میں پاگل سا ہو گیا۔ جو کوئی سامنے آتا، اسے روک کر میں کہتا ——— "میں فلاں کا
بیٹا، فلاں گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ آپ نے میرے ماں باپ کو کہیں دیکھا ہے؟"
بعض آدمی تو میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر پیار سے جواب دیتے ——— "نہ بیٹا، میں تو
انہیں نہیں جانتا" ——— کچھ ایسے بھی تھے جو غصّے سے مجھے ٹال دیتے اور چند
ایک ایسے بھی دیکھے جو میری بات سنتے ہی زار و قطار رونے لگتے۔ آخر ایک روز
مجھے اپنی ماں کا ایک چچا زاد بھائی مل گیا۔ میرے ماں باپ تو گاؤں میں کھیتی باڑی
کیا کرتے تھے اور ہمارا یہ ماموں ترن تارن میں کپڑا بیچا کرتا تھا۔ اس کی اپنی دکان
تھی۔ میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ سکول ترن تارن میں تھا جہاں میں پیدل آیا
جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں اس ماموں کے پاس چلا جایا کرتا تھا۔

میں نے اسے ریفیوجی کیمپ میں پہچان لیا لیکن وہ نہ پہچان سکا کیونکہ میرا
آدھا چہرہ جلا ہوا تھا۔ میں نے ابھی اپنا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس کا کنبہ ترن تارن
میں تھا جہاں سے وہ سبھی خیریت سے لاہور پہنچ گئے تھے۔ اسے دیکھ کر میں بہت
ہی رویا۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور مجھے سینے سے لگا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔
پھر میں اس کے کنبے کے ساتھ ریفیوجی کیمپ کی ایک بارک میں رہنے لگا۔

تین مہینے بعد اس نے بھاگ دوڑ کر کے راولپنڈی میں مکان اور دکان کا
بندوبست کر لیا۔ ہم سب راولپنڈی چلے گئے۔ اسے کسی ہندو یا سکھ کی چھوڑی
ہوئی کپڑوں کی دکان مل گئی تھی اور بہت اچھا مکان بھی مل گیا۔ وہ مجھے دکان پر اپنے
ساتھ بٹھانا چاہتا تھا لیکن میں نے ضد کی کہ سکول میں داخل ہوں گا۔ اس نے مجھے

چھٹی جماعت میں داخل تو کرا دیا لیکن وہ خوش نہیں تھا۔ اس کے اپنے دو بچے تھے۔
انہیں وہ سکول داخل کرا چکا تھا۔ ایک پانچویں میں پڑھتا تھا اور دوسرا آٹھویں میں۔
شروع شروع میں تو ماموں اور اس کی بیوی نے مجھے اپنے بچوں کی طرح
رکھا۔ مجھے یتیم اور بے سہارا بچہ سمجھ کر مجھ سے دونوں بہت پیار کرتے تھے۔ لیکن
وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات سرد پڑتے گئے۔ جب دکان خوب چل
نکلی تو اسے یاد ہی نہ رہا کہ میرے ماں باپ اور سارے ہی بھائی اور بہنیں ہندوستان
میں قتل ہو گئی تھیں۔ میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ ماموں نے مجھے حکم دیا کہ میں
سکول کے بعد دکان پر چلا جایا کروں۔ کیونکہ گاہک زیادہ ہوتے ہیں جنہیں وہ اکیلے
نہیں بھگتا سکتا۔

میں سکول سے چھٹی کے بعد دکان پر جانے لگا۔ ماموں ایک جگہ بیٹھا رہتا اور میں
تھان اٹھا اٹھا کر گاہکوں کے آگے پھیلاتا رہتا۔ میں ساتویں جماعت کا بچہ تھا اور تھان
میرے لیے بہت وزنی تھے۔ میں تھک جایا کرتا تھا۔ دکان بند کرنے سے پہلے مجھے
سارے تھان لپیٹ کر واپس رکھنے پڑتے تھے۔ رات کے نو دس بجے مجھے روٹی
ملتی تھی۔ تھکن سے میرا جسم دکھنے لگتا تھا۔ نیند بے حال کر دیتی تھی لیکن مجھے
سکول کا کام بھی کرنا ہوتا تھا جو میں اُس وقت کرتا جب سارا گھرانا گہری نیند سویا ہوتا
تھا۔ دکان جمعہ کے روز بند ہوتی تھی اور سکول اتوار کے روز بند ہوتا تھا لہذا مجھے
اتوار سارا دن دکان پر رہنا پڑتا تھا۔ میرے لیے کوئی چھٹی نہیں تھی نہ آرام کے
لیے کوئی وقت تھا۔

ہوتے ہوتے گھر میں میری حیثیت ایک نوکر کی رہ گئی۔ ماموں کے بیٹے مجھ پر
حکم چلانے لگے۔ کبھی کبھی صبح سکول جانے سے پہلے مجھے ان کے بوٹ پالش کرنے
پڑتے تھے۔ صرف ایک عید پر مجھے نئے کپڑے دیئے گئے تھے۔ اس کے بعد مجھے
دھلے ہوئے کپڑے دیئے جانے لگے۔ عید کے روز ماموں کے بچے نئے کپڑے پہن
کر خوشیاں مناتے اور باہر جا کر خوب پیسے خرچ کرتے مگر میں گھر میں رہتا اور مہمانوں
کے آگے چائے وغیرہ رکھتا، برتن اٹھاتا اور برتن دھوتا تھا۔

میں اکیلے بیٹھ کر بہت رویا کرتا تھا۔ مجھے نئے کپڑے پہنانے والے اور مجھے گھر
میں شہزادہ بنانے والے ہندوستان میں زندہ جل گئے تھے۔ وہ یاد آتے تھے تو دنیا
کا ہر انسان مجھے دشمن معلوم ہوتا تھا۔ مجھے ہر کسی سے ڈر آتا تھا۔ مجھے اب کوئی پیار سے
اپنے پاس نہیں بٹھاتا تھا بلکہ گھر میں مجھ سے نفرت کی جاتی تھی۔ ان لوگوں کی نظروں
میں میں اب انسان کا بچہ نہیں رہا تھا۔ میرا اب کوئی نام بھی نہیں رہا تھا کیونکہ وہ
مجھے "اوئے"، "سن" یا "اوئے، ادھر آ" کہہ کر بلاتے تھے۔

میں جب آئینے میں اپنا منہ دیکھتا تھا تو آدھا جلا ہوا چہرہ اور چہرے کے
کالے رنگ کو دیکھ کر مجھے بھی اپنے آپ سے نفرت ہو جاتی تھی۔ میری شکل وصورت پہلے
بھی کوئی ایسی اچھی نہیں تھی۔ آگ نے چہرے کو ایسی بُری طرح جلایا تھا کہ کان سے لے کر
آنکھ تک اور نیچے جبڑے تک کھال کھینچی گئی تھی۔ آنکھ کے نیچے کی کھال کچھ اس طرح
جلی تھی کہ آنکھ ڈراؤنے سے طریقے سے کھلی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے علاوہ مسلسل غموں،
جسمانی محنت، آرام اور خوراک کی کمی سے چہرے پر ذرہ بھر رونق نہیں رہی تھی۔
دل پر دکھوں کا بوجھ پڑا رہتا تھا۔ میری صورت رونی رونی لگتی تھی۔ میں صرف اس
امید پر زندہ تھا کہ میٹرک پاس کر کے کہیں نوکری مل جائے گی تو اس گھر سے بھاگ کر آزاد
زندگی بسر کروں گا اور انسانوں سے دور ہی دور رہوں گا۔ مگر یہ اُمید پوری ہوتی نظر
نہ آتی تھی۔ مجھے یہ یقین تو ضرور تھا کہ میں میٹرک پاس کر لوں گا اور نوکری بھی مل جائے
گی لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ مجھے کوئی ایسا گوشہ مل جائے گا جہاں مجھ سے کوئی نفرت کرنے
والا موجود نہ ہو گا۔ سکول میں لڑکے مجھے مذاق کا نشانہ بنائے رکھتے تھے۔ ہر روز نیا نام
دھرتے تھے۔ میں ماسٹروں سے شکایت کرتا تھا تو وہ بھی مجھے دھتکار دیتے تھے اور میں
سوائے رونے کے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

خدا نے مجھے وہ دن دکھایا کہ میں نے ۵۹۷ نمبروں سے میٹرک پاس کر لیا۔ میٹرک کا
امتحان ختم ہوتے ہی میں ماموں کے حکم سے صبح سے رات تک دکان میں کام کرنے
لگا تھا۔ جب نتیجہ نکلا تو میں گھر سے بھاگنے کا پروگرام بنانے لگا۔

کراچی کے متعلق میں اکثر سنا کرتا تھا کہ وہاں کوئی بھوکا نہیں رہتا۔ کہیں نہ کہیں نوکری مل جاتی ہے لیکن میرے پاس کراچی تک کے لیے کرایہ نہیں تھا نہ امید تھی کہ کبھی کرایہ مل جائے گا۔ میرے ہاتھ میں ایک آنے سے زیادہ کبھی پیسے نہیں آئے تھے مجھے صرف یہ سہولت حاصل تھی کہ میں ہر قسم کی سختی اور تکلیف برداشت کر سکتا تھا۔ مجھے یہ ڈر نہیں تھا کہ مجھ سے پیار، آرام اور سکون چھن جائے گا۔ میرے لئے یہ تینوں نعمتیں ہندوستان میں ماں باپ کے ساتھ جل کر بھسم ہو گئی تھیں۔ اب میرے لیے نفرت، حقارت، محنت اور مشقت رہ گئی تھی جس کا میں عادی ہو چکا تھا۔

ایک روز میں نے پہلا اور آخری جرم کیا۔ میں نے ماموں کی دکان سے ساٹھ روپے چوری کیے۔ وہاں سینکڑوں روپے پڑے تھے لیکن میں نے ضرورت کے مطابق پیسے اٹھائے اور ریلوے سٹیشن پہنچا۔

گاڑی نے مجھے کراچی پہنچا دیا۔ اگر میں آپ کو تفصیل سے سنانا شروع کر دوں کہ کراچی میں مجھ پر کیا گزری اور وہاں ایک ایک دن اور ایک ایک رات کیسے گذری تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ میں دراصل آپ کو جو بات سنانا چاہتا ہوں وہ سرحد پار مسلمانوں کے قتل عام اور کراچی میں گزارے ہوئے بارہ برسوں کی کہانی سے بہت مختلف اور الگ تھلگ کہانی ہے۔ سرحد پار مجھ پر جو گذری، وہ کوئی عجیب وغریب واردات نہیں۔ یہ تو سرحد پار سے پاکستان آنے والے ہزاروں بچوں کی کہانی ہے۔ ماموں کے گھر میں میرے ساتھ جو سلوک ہوا، وہ بھی کوئی دلچسپ کہانی نہیں۔ پاکستان میں ہزاروں بلکہ لاکھوں بچوں کے ساتھ ماموؤں، چچوں اور سوتیلی ماؤں کے گھر یہی سلوک ہو رہا ہے۔ میں آپ کو وہ کہانی سنانا چاہتا ہوں جو آپ نے شاید پہلے نہیں سنی ہوگی۔

کراچی میں جا کے دیکھا کہ مجھ جیسے کئی بچے پیار اور شفقت کی تلاش میں گھروں سے بھاگ کے [illegible] کراچی کی تنگ وتاریک گلیوں میں اور کشادہ سڑکوں پر بھٹک رہے تھے۔ بعض بھیک [illegible] رہے تھے، کچھ ہوٹلوں میں برتن مانجھ رہے تھے۔ بعض چرس کا ناجائز کاروبار کرنے والوں کے آلہ کار بنے ہوئے تھے، کئی ایک لوگوں کے گھروں میں نوکری کر رہے تھے۔ مجھے جو [illegible] ملا، اس کی عمر چودہ سال تھی۔ کرا[illegible]

بھی اسی پیشے کو اپنانے کے لیے اکسانے لگا۔ مجھ میں جیب کترا بننے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں۔ ہتھکڑیاں اور جیل خانہ میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا کیونکہ میں اس سے زیادہ شدید اور سنگین سزا بھگت چکا تھا۔ فرق یہ تھا کہ میں نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ پھر بھی چوری چکاری پر طبیعت آمادہ نہ ہو سکی۔ ماموں کے ساٹھ روپے بھی ضمیر پر بوجھ بنے ہوئے تھے۔ میں نے قسم کھا رکھی تھی کہ کوئی ذریعہ معاش ملتے ہی سب سے پہلے ماموں کو ساٹھ روپے بھیج دوں گا۔ میں نے تین سال بعد یہ قسم پوری کی، اور ضمیر سے بوجھ اتارا۔

کراچی میں آٹھ سال تک میں نے مختلف جگہوں پر نوکری کی۔ میرا کوئی گھر نہیں تھا، کوئی اپنا نہیں تھا، دن بھر کام کرتا تھا اور رات کام کی جگہ ہی سو جاتا تھا۔ کاروں کی پرائیویٹ ورکشاپ میں بھی نوکری کی۔ دو ہوٹلوں اور دو گھروں میں بھی اور دو ایسے اندھیرے گوشوں سے بھی روٹی کمائی جن کا ذکر کرتے شرم محسوس ہوتی ہے۔

نویں برس، ایک روز اخبار میں ایک غیر ملکی پرائیویٹ کمپنی کا اشتہار پڑھا۔ انہیں کلرکوں اور چپڑاسیوں کی ضرورت تھی۔ ایسے اشتہار تو میں آٹھ سالوں سے پڑھ رہا تھا اور درخواستیں دے رہا تھا۔ بعض جگہوں پر مجھے انٹرویو کے لیے بھی بلایا گیا تھا۔ لیکن میری شکل دیکھتے ہی مجھے جواب دے دیا جاتا تھا۔ اگر میں صرف بدصورت اور سیاہ فام ہوتا تو شاید مجھے برداشت کر لیا جاتا، میرے جلے ہوئے چہرے کو دیکھ کر انٹرویو لینے والے کراہت محسوس کرتے تھے۔ میرا آخری انٹرویو کسی سوال اور جواب کے بغیر ہی ختم ہو گیا تھا۔

امیدواروں کی قطار میں جب میری باری آئی تو چپڑاسی نے مجھے اندر بلایا۔ میں جونہی صاحب کے سامنے جا کھڑا ہوا تو اس نے دو چار سیکنڈ کے لیے میرے چہرے اور ہوٹل کے غلیظ کپڑوں کو دیکھا تو کہا ــــ "تم جاؤ بھئی، تم چلے جاؤ" ــــ میں کچھ کہنے لگا تھا تو اس نے کہا ــــ "چلو چلو۔ باہر چلے جاؤ" ــــ اور اس نے چپڑاسی کو بلانے والی گھنٹی بجا دی۔ چپڑاسی داخل ہو رہا تھا اور میں باہر نکل رہا تھا۔

اس سے ایک سال بعد مجھے ایک بار پھر درخواست دینے کی سوجھی۔ میرے پیٹ

"اب نفرت اور دھتکار کے سوا کچھ نہیں رہا تھا پھر بھی میرے دل میں یہ خواہش مر نہ سکی کہ میں باعزت زندگی بسر کروں۔ مجھے انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ میرے پاس پیسے تھے۔ میں نے اچھے کپڑے سلوائے اور انٹرویو کے لیے گیا۔ میں مایوس لوٹ آنے کے لیے تیار ہو کر گیا تھا لیکن ایک عجیب بات ہوئی جو معجزے سے کم نہ تھی۔ مجھے جب دفتر میں بلایا گیا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انٹرویو لینے والے نے مجھے بٹھا لیا اور رونے کی وجہ پوچھی۔ میں نے اسے اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر اکتوبر ۱۹۶۲ء تک کی آپ بیتی سنا دی۔ وہ ایک بے حد نیک انسان ہے۔ جسے میں فرشتہ کہا کرتا ہوں۔ اس نے پوری ہمدردی اور دلچسپی سے میری بپتا سنی اور کہا:

"نوکری صرف تمہارا حق ہے جو میں تمہیں دیتا ہوں۔ محنت سے کام کرنا اور مجھے شرمندہ نہ کرنا۔"

مجھے ایک سو پچہتر روپے ماہوار پر کلرکی کی جگہ مل گئی۔ رہنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ ایک چپڑاسی سے بات کی تو اس نے مجھے جیکب لائنز میں اپنے بنائے ہوئے کوارٹر میں ایک کمرہ دے دیا۔ کھانا بھی اسی کے گھر سے کھاتا تھا اور وہ مجھ سے ساٹھ روپے ماہوار لیا کرتا تھا۔ چھ سات ماہ بعد مجھے دو کمروں کا ایک جھگی نما کوارٹر پچیس روپے ماہوار کرائے پر مل گیا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے دو کمرے تھے۔ میرے پاس بہت پیسے تھے جو میں نے پہلی نوکریوں کی تنخواہوں سے بچائے تھے اور ڈاکخانے میں جمع کرا رکھے تھے۔ میں صرف روٹی اور کپڑے کے لیے پیسے خرچ کیا کرتا تھا۔ سینما، سیر اور سگریٹ نوشی وغیرہ میرے لیے ناجائز عیاشیاں تھیں۔ میری زندگی تفریح اور مسرت سے محروم تھی اور حقیقت یہ ہے کہ محرومیوں کو ہی میں زندگی سمجھنے لگا تھا۔

میں نے ضروری برتن خرید لیے اور اپنے لیے ہانڈی روٹی خود ہی کرنے لگا۔ یہ کوارٹر اور تنہائی میرے لیے گوشۂ عافیت تھی۔ چھبیس ستائیس سال کی عمر میں مجھے پناہ ملی اور میں اسے جنت سمجھنے لگا۔ میرا کوئی دوست نہیں تھا، نہ میں نے کبھی کسی سے دوستی کی توقع رکھی تھی۔ میرے ساتھی دفتر میں ہنستے کھیلتے تھے اور میں دنیا

سے روٹھا ہوا، منہ بسورے کام میں جتا رہتا تھا۔ دو تین مہینوں تک تو میں اپنے ساتھیوں سے لاتعلق رہا۔ اس کے بعد انہوں نے میرے ساتھ تعلق پیدا کر لیا۔ یہ تعلق مذاق تک محدود تھا۔ جس طرح میں سکول میں بچوں کے مذاق کا نشانہ بنا رہتا تھا، اسی طرح ان لوگوں نے مجھے اپنی تفریح اور قہقہوں کا ذریعہ بنا لیا۔ میں خاموش طبع انسان تھا۔ ہنسی مذاق کا سلیقہ ہی نہیں آتا تھا۔ اس لیے میں بدھو بنا رہتا۔ بعض اوقات چپڑاسی کہیں گیا ہوا ہوتا تھا تو میرے ساتھی جن کی حیثیت مجھ سے زیادہ نہیں تھی، مجھے چائے لانے کے لیے کہتے تھے اور میں چپڑاسی کی طرح ان کا حکم مانتا تھا۔ میں کبھی کسی سے لڑا نہیں تھا۔ غصہ آتا تھا تو اندر ہی اندر اپنا خون پی لیا کرتا تھا۔

ڈیڑھ سال بعد میرے دفتر کے تین کلرکوں نے یکایک رویّہ بدل لیا اور میرے ساتھ ہمدردی اور خلوص کی باتیں کرنے لگے۔ بعض اوقات ان کے لہجے میں خوشامد کا رنگ بھی ہوتا۔ انہوں نے مجھے اہمیت دینی شروع کر دی۔ پاکستان میں آنے کے بعد یہ پہلے انسان تھے جن سے مجھے محبت اور اہمیت ملی اور میں اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھنے لگا۔ تھوڑے دنوں بعد وہ مجھے ہوٹل میں چائے پلانے کے لیے لے گئے اور ایک روز انہوں نے مجھے فلم دکھائی۔ ایک روز انہوں نے مجھ سے میرے خاندان کے متعلق پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ دنیا میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ سارا خاندان ہندوستان میں زندہ جل گیا تھا۔ میری آپ بیتی سن کر وہ اور زیادہ مونس اور غمخوار بن گئے۔ پھر میں کبھی کبھی ان تینوں کو اپنے کوارٹر میں لے جانے لگا اور اس طرح ہماری دوستی پکی ہو گئی۔ میری محرومیاں ایسی تھیں جو میری دکھتی رگیں بن چکی تھیں۔ ان تینوں نے ان دکھتی رگوں کو سہلا کر مجھے اپنا غلام اور مرید بنا لیا۔

ایک روز ان تینوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں شادی کرنا چاہوں تو وہ بندوبست کر سکتے ہیں۔ میں نے جواب دیا "میری صورت دیکھ کر بات کرو۔ میں ایسا بدشکل انسان ہوں کہ کوئی بدصورت لڑکی بھی مجھے قبول نہیں کرے گی۔" انہوں نے کہا کہ میں اپنے آپ کو کچھ بھی کیوں نہ سمجھوں، یہ ان کا فرض ہے کہ وہ میری دکھیاری اور تنہا زندگی میں مجھے ایک ساتھی مہیا کریں۔ ایک نے کہا —— "جب ہم تمہارا مذاق

اڑایا کرتے تھے اس وقت ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تم کتنے دکھی انسان ہو۔ جونہی پتہ چلا، ہم نے تمہیں اپنا بھائی بنا لیا۔ ہم تمہیں ایسی لڑکی دیں گے جو تمہارے سارے دکھ دھو ڈالے گی" ــــ میں مان گیا۔

مجھے اتنا ہی بتایا گیا کہ وہ ایک بیوہ کی لڑکی ہے۔ مجھے نہ تو اس بیوہ سے متعارف کرایا گیا نہ مجھے اس کا گھر دکھایا گیا۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ رشتہ طے ہو گیا ہے اور یہ بھی کہ شادی نہایت سادگی سے کی جائے گی۔ مجھے کوئی کپڑا یا زیور وغیرہ نہیں بنانا ہو گا۔ بس یہ تین دوست باراتی ہوں گے۔ خاموشی سے نکاح پڑھایا جائے گا اور لڑکی میرے ساتھ آجائے گی۔

بالکل اسی طرح ہوا جس طرح مجھے بتایا گیا تھا۔ میں ان تین دوستوں کے ساتھ پیرالٰہی بخش کالونی میں ایسے ہی ایک کوارٹر میں گیا جیسے کوارٹر میں مَیں رہتا تھا۔ اسے آپ پختہ جھگی کہہ سکتے ہیں۔ ایک مولوی کو بلایا گیا جس نے نکاح پڑھا۔ رجسٹر پر دستخط ہوئے۔ رجسٹر اندر گیا تو اس پر انگوٹھا لگا ہوا واپس آیا۔ کھانے کے بعد میرا ایک دوست ٹیکسی لے آیا۔ لڑکی کو میرے ساتھ بٹھا کر رخصت کر دیا گیا۔ اس نے بادامی رنگ کا برقعہ اوڑھ رکھا تھا۔ وہ ساتھ بیٹھی ہوئی تھی لیکن مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک وزنی پتھر بن کر میرے ضمیر اور میری روح پر رکھ دی گئی ہو۔ میں بالکل نہیں سوچ رہا تھا کہ اس کی شکل و صورت کیسی ہو گی، مجھے صرف یہ حقیقت پریشان کر رہی تھی کہ جونہی اس نے میری صورت دیکھی وہ بدک جائے گی۔ ابھی تو حجاب سے اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔

ہم ٹیکسی سے اتر کر کوارٹر میں داخل ہونے لگے تو وہ رک گئی۔ میں جان گیا کہ یہ دبلی پتلی لڑکی شرم کے مارے چلنے سے گھبرا رہی ہے۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اور اندر لے جا کر چارپائی پر بٹھا دیا۔ اس نے برقعہ نہ اتارا۔ میں نے اسے کہا تو اس نے نہایت آہستہ آہستہ برقعہ اتار دیا اور اس کا چہرہ گھونگھٹ میں چھپ گیا جیسے میں نہ دیکھ سکا۔ میں نے صرف ہاتھ دیکھے اور میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ کیونکہ ہاتھ

خوبصورت اور سفید تھے۔ یہ کسی بہت ہی دلکش لڑکی کے ہاتھ تھے۔ مجھے دکھ ہوا۔ میں ان ہاتھوں کے قابل نہیں تھا۔ میں دوسرے کمرے میں چلا گیا اور گہری سوچ میں کھو گیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو باہر میرے تینوں دوست کھڑے تھے۔ وہ جہیز لائے تھے، ایک پلنگ تھا اور دو صندوق۔ انہوں نے خود ہی یہ سامان اندر رکھا۔ پلنگ اس کمرے میں بچھا دیا جس میں لڑکی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے مبارک باد دی اور چلے گئے۔

میں جب دلہن کے کمرے میں گیا تو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی کمرہ ہے جو تھوڑی دیر پہلے تک وحشت کا بسیرا اور اُداسیوں کا مسکن تھا۔ میرے دوست وہاں نیا پلنگ اور اس پر نیا بستر بچھا کر دلہن کو اس پر بٹھا گئے تھے اور پرانی چارپائی باہر رکھ گئے تھے۔ کمرے میں اگر بتیاں جل رہی تھیں۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دلہن کا چہرہ سرخ گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا اور اس کے سپید سپید ہاتھ سرخ ساٹن کی شلوار پر رکھے ہوئے زیادہ ہی سپید اور دلکش دکھائی دے رہے تھے۔ میرے دل سے آہ کی طرح آواز آئی:

"یہ ایک بد نصیب لڑکی ہے جو کسی دھوکے کا شکار ہوئی ہے۔"

میں نے یہ ارادہ بھی کیا کہ لال کپڑوں کی اس گٹھڑی کو اسی طرح اٹھا کر اسی گھر میں رکھ آؤں جہاں سے اٹھا لایا ہوں۔ میں نہ تو اس کا چہرہ دیکھنے کا خواہشمند تھا نہ اسے اپنا چہرہ دکھانے کا حوصلہ تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ بے چاری نہ جانے کیسے کیسے حسین تصوّروں میں کھوئی ہوئی شرما رہی ہے۔ گھونگھٹ اٹھتے ہی اس کے تصوّرات کانچ کی چوڑیوں کی طرح ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ اپنی صورت دکھانے سے پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کر لوں کہ گھونگھٹ اٹھنے کے بعد اسے کیا نظر آئے گا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا پلنگ کے قریب جا کر کھڑا ہوا اور کہا "میں جانتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہی ہو لیکن تم نہیں جانتیں کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ پیشتر اس کے کہ تم میری صورت دیکھو اور منہ پھیر لو، میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں" ــــ میرے لہجے میں

ایسی روانی پیدا ہوگئی کہ دل سے اٹھی ہوئی باتیں اپنے آپ ہی زبان پر آنے لگیں، حالانکہ میں دکھوں کے بوجھ تلے دبا ہوا خاموش طبع انسان تھا جس نے اتنی باتیں کبھی نہیں کی تھیں۔

میں نے کہا ___ "تمہیں میرے متعلق سب کچھ بتا دیا گیا ہوتا یا تم یا تمہاری ماں مجھے کبھی دیکھ لیتیں تو تمہارے لیے بہت بہتر ہوتا۔ ہم خود کتنے ہی بدصورت کیوں نہ ہوں ہم چاہتے ہیں کہ زندگی کا ساتھی جو ملے وہ خوبصورت ہو۔ لیکن میں نے ایسا کبھی نہ سوچا تھا۔ میں نے تو شادی کے متعلق بھی کبھی نہیں سوچا تھا کیونکہ میں نے اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا کہ مجھ جیسے بدتھو اور بدصورت انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ ایک لڑکی کے حسین خوابوں میں بھوت بن کر داخل ہو۔"

اس نے بیٹھے بیٹھے بے چینی سے کروٹ بدلی اور خاموش بیٹھی رہی۔

میں نے کہا ___ "میں نفرت اور طنز کی تصویر ہوں۔ میں اتنا بدصورت ہوں کہ آئینہ دیکھتا ہوں تو مجھے بھی اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ میں پندرہ برسوں سے انس اور محبت سے محروم ہوں۔ کھلے آسمان تلے راتیں گذاری ہیں اور ہر طرف سے دھتکارا ہوا ہوں" ___ میں نے اسے زندگی کی ساری کہانی سنا ڈالی۔ کئی بار میری آواز رندھ گئی۔ آنسو بھی نکلے اور میں پلنگ کے قریب ٹہلتے ٹہلتے بولتا ہی رہا۔

میں نے کہا ___ "ماموں کے گھر میں مجھے بتا دیا گیا تھا کہ تم صرف حقارت کے قابل ہو اور میں نے اپنے آپ کو حقیر جان لیا۔ سکول میں لڑکوں اور ماسٹروں نے بھی مجھے مذاق اور طنز کا نشانہ بنایا اور میرے دل میں یہ یقین پختہ کر دیا کہ تم خارش کے مارے ہوئے کتے ہو اور میں نے اپنے آپ کو کتا بنا لیا۔ میرے دل سے یہ فخر بھی نکل گیا کہ میں نے اپنی ماں، اپنا باپ، دو بھائی، دو بہنیں، اپنا گھر اور بچپن کی خوشیاں پاکستان پر قربان کی ہیں۔ یہ فخر میرے لئے لعنت بن گیا۔ آج تم میری زندگی میں داخل ہوئی ہو۔ تم ہی بتا دو کہ ایسا کیوں ہوا ہے؟ میں اس فریب کو سمجھ نہیں سکا۔ تم سمجھا دو ...."

اس کے ہاتھ گھونگھٹ میں چلے گئے اور مجھے اس کی سسکی سنائی دی۔ اس کا سارا جسم ایک ہی سسکی سے ہل گیا۔ جب اس کے ہاتھ گھونگھٹ سے باہر آئے

تو وہ بھیگے ہوئے تھے۔ وہ رو رہی تھی۔ میں کیسے یقین کر لیتا کہ اتنے خوبصورت ہاتھوں والی لڑکی میری کہانی سن کر رو پڑی ہے؟ میں نے کہا ___ "اپنے تصوروں کی موت پر تم جتنا بھی روؤ کم ہے۔ مجھے دکھ صرف یہ ہے کہ تمہارے ارمانوں کا قاتل مجھے بنایا گیا ہے۔ میں اُس گھڑی کو رو رہا ہوں جس گھڑی میرے "تین دوستوں" نے مجھے شادی کے لیئے کہا تھا تو میں نے ہاں کہہ دی تھی۔ یہ میرا جرم ہے۔"

اچانک مجھ پر جذبات کا غلبہ طاری ہو گیا اور میں نے بھیک مانگنے کے لہجے میں کہا ___ "ایک بات ضرور کہوں گا کہ پندرہ برسوں سے دل پر ایک خوف کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہوں۔ پیار کی ایک نظر اور محبت کے ایک کلمے کے لیے ترس رہا ہوں۔ اگر تم اس ملک کو اپنا پاکستان سمجھتی ہو تو میں نے تمہارے پاکستان کے لیے اپنے وہ سارے عزیز جلا دیئے تھے جو مجھ سے پیار کیا کرتے تھے اور جن کے لیے میں بدصورت نہیں بلکہ شہزادہ تھا۔ اس کے صلے میں مجھے چند لمحوں کا پیار دے دو۔ پھر کہو گی تو تمہیں وہیں چھوڑ آؤں گا جہاں سے تمہیں میرے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ سنو لڑکی! مجھے عمر بھر کا پیار وہی دے سکتا ہے جو اندھا ہو۔"

لڑکی پلنگ پر سرکی اور اس نے پاؤں پلنگ سے لٹکا دیے اور وہ اٹھنے لگی۔ مجھ پر خاموشی طاری ہو چکی تھی کیونکہ میرے منہ سے ایسی بات نکل گئی تھی جو میں نہیں کہنا چاہتا تھا۔ میں پلنگ سے دو تین قدم دور کھڑا تھا۔ وہ پلنگ سے اٹھ کر فرش پر بیٹھ گئی اور فرش پر یوں ہاتھ پھیر پھیر کر میرے پاؤں کی طرف سرکنے لگی جس طرح اندھا زمین پر گری ہوئی لاٹھی ڈھونڈتا ہے۔ وہ اسی طرح فرش پر ہاتھ پھیرتی اور سرکتی ہوئی مجھ تک پہنچی۔ اس کے ہاتھ میرے پاؤں کو چھونے لگے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور سر میرے پاؤں کے درمیان رکھ دیا۔ میں نے تیزی سے جھک کر اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہی ہو؟"

اس نے دونوں ہاتھوں سے گھونگھٹ پیچھے پھینک دیا اور روتی ہوئی آواز

میں بولی —— "میں وہ اندھی ہوں جو آپ کو عمر بھر کا پیار دے گی۔ خدا کے لیے مجھے قبول کرلو۔"

میں نے دیکھا کہ اس لڑکی کے اتنے حسین اور بھولے بھالے چہرے پر جو آنکھیں تھیں وہ سفید تھیں اور دونوں پتلیاں غائب۔ وہ پیدائشی اندھی تھی۔

میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ اس نے اپنے بازو میرے گرد لپیٹ دیئے اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ میرے دل سے مایوسیوں اور حقارت کی تمام سِلیں اٹھ گئیں اور میں ایسی مسرت سے جھومنے لگا جس سے مجھے اگست ۱۹۴۷ء میں ترن تارن کے قریب محروم کر دیا گیا تھا۔ مجھ پر ان تین آدمیوں کی فریب کاری ظاہر ہو گئی اور مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ تینوں کیوں میرے دوست اور ہمدرد بن گئے تھے۔ وہ دراصل اس اندھی لڑکی کو کسی کے پلّے باندھنا چاہتے تھے اس کے باوجود میں انہیں اپنا محسن ہی سمجھتا رہا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مجھے عمر بھر کا پیار وہی لڑکی دے سکتی ہے جو اندھی ہو۔

میں دوسرے دن اسے اس کی ماں کے پاس لے گیا۔ جب اس کی ماں سے سامنا ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا رنگ اور تاثر بدل گیا کیونکہ وہ بھی اس فریب کاری میں شریک تھی۔ لیکن مجھے اور اپنی اندھی بیٹی کو ہنستا کھیلتا دیکھ کر وہ ہمیں حیرت سے دیکھنے لگی۔ وہ اپنی بیٹی کو مجھ سے الگ کر کے کمرے میں لے گئی اور میں دوسرے کمرے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میری ساس میرے پاس آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے مجھے گلے لگا لیا اور وہ رو پڑی۔ کہنے لگی "میں ساری رات سو نہیں سکی۔ تم نے میرا سارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے . . . بیٹا! میں نے ایک گناہ کیا ہے۔ ہم نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ لڑکی اندھی ہے۔ میں ڈر رہی تھی کہ تمہاری طرف سے مجھے اس گناہ کی معلوم نہیں کیسی سزا ملے گی لیکن میں کچھ اور ہی دیکھ رہی ہوں۔ میری اندھی بیٹی کو قبول کرنے والا کون تھا؟"

میرے غیر متوقع رویے نے اس پر ایسا اثر کیا کہ اس نے اقبال جرم کر لیا اور مجھے بتایا کہ یہ اندھی بیٹی اس کے لیے ایسا مسئلہ بنی ہوئی تھی جس کا کوئی حل نہیں تھا۔ ان تین آدمیوں میں سے ایک اس کا قریبی رشتہ دار تھا۔ اس عورت نے اسے کہا تھا کہ وہ کسی

کو شادی کے لیے آمادہ کرے۔ اس نے دو آدمیوں سے بات کی اور انہیں لڑکی بھی دکھائی۔ وہ لڑکی کی خوبصورتی سے بہت متاثر ہوئے لیکن وہ ایک اندھی لڑکی کو بیوی بنانے پر رضامند نہ ہوئے۔ اس آدمی نے دفتر میں اپنے دوستوں سے بات کی اور تینوں ایسے آدمی کو ڈھونڈنے لگے جو کسی نہ کسی وجہ سے شادی کے قابل نہ ہو اور اتنا سیدھا سادا بھی ہو کہ ان کے جال میں پھنس جائے۔ میں ان کے لیے موزوں آدمی تھا۔ انہوں نے مجھے اُلّو بنایا اور اندھی لڑکی کی ماں کا مسئلہ حل کر دیا۔

ماں نے مجھے بتایا کہ تینوں نے اس سے ایک ایک ہزار روپیہ نقد الگ لیا ہے اور ایک سال تک اس سے تھوڑے تھوڑے کر کے بے شمار پیسے لیتے رہے ہیں۔ اس عورت نے کہا "تم نے میری بیٹی کو قبول کر کے مجھے خرید لیا ہے۔ میں تمہارے پاؤں پکڑ کر تم سے اپنا گناہ بخشواؤں گی۔" لیکن میں نے اسے اپنے پاؤں پکڑنے کی اجازت نہ دی، نہ کوئی ایسی ضرورت تھی۔ البتہ اس نے اپنے گناہ کا جس میں تین اور آدمی بھی شامل تھے، کفارہ اس طرح ادا کیا کہ مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس کے ساتھ رہوں۔

آج سات سال گذر گئے ہیں۔ ہمارے دو بچے ہیں۔ مجھے وہ خوشیاں مل گئی ہیں جو سرحد پار جل گئی تھیں۔ میں خاموش طبع اور روٹھا ہوا انسان نہیں رہا۔ میں نے ان تین ساتھیوں سے کوئی گلہ شکوہ نہیں کیا تھا۔ مجھے ہنستا دیکھ کر وہ جھینپ گئے تھے اور میرا سامنا کرنے سے گھبراتے تھے۔ شادی سے ایک سال بعد میں نے اس دفتر سے نوکری چھوڑ دی اور کپڑے کی ایک دکان کھول لی جو خوب چل رہی ہے۔

کرموں جلی —

تیرا سہاگ سمندر میں ڈوب گیا ہے

عائشہ

آپ کبھی کراچی تو آئے ہونگے۔ آئے ہوں تو منوڑہ بھی گئے ہوں گے جہاں ساون کے مہینے میں سمندر کی موجیں قہر و غضب سے آتی ہیں اور ساحل کی چٹانوں سے ٹکرا کر قطرہ قطرہ ہو جاتی ہیں۔ قطرے بکھر کر سمندر میں لوٹ جاتے ہیں اور اکٹھے ہو کر پھر موج بن جاتے ہیں۔ یہ موج ایک بار پھر بھاگتی دوڑتی، بے طرح شور بپا کرتی ساحل کی طرف لوٹ آتی ہے اور چٹان اسے ایک بار پھر قطرہ قطرہ کر کے بکھیر دیتی ہے۔

اگر آپ کراچی آئیں تو یہ منظر ضرور دیکھیں پھر آپ میری کہانی کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ موجوں کا جوش و خروش دیکھنا ہو تو ساون کے مہینے میں آیئے گا۔ میں وہیں ہوں گی۔ ساحل پر لوگوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ اپنے بیوی بچّوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں۔ وہاں میلے کا سماں ہوتا ہے۔ زندگی کے اس میلے سے منہ موڑے ہوئے ہجوم سے الگ تھلگ آپ کو ایک عورت اکیلی ٹہلتی ہوئی یا کسی چٹان پر بیٹھی، سمندر اور ساحل کی کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی ہوئی نظر آئے گی۔ یہ عورت ستاروں کے جھرمٹ سے ٹوٹا ہوا ایک ستارہ ہے جس کی چمک دمک گھپ اندھیری رات میں ریزہ ریزہ ہو کر گم ہو گئی ہے۔

اگر آپ اس عورت کا سینہ کھول کر دیکھیں تو اس میں آپ کو چٹان جیسا ایک دل نظر آئے گا۔ جذبات اور احساسات کی موجیں قہر و غضب سے بھاگتی دوڑتی اس چٹان سے

ٹکراتی نظر آئیں گی —— مگر ایک بات بتا دوں۔ اگر آپ مرد ہیں تو اس عورت کے قریب نہ آنا۔ ساحل پر ٹہلتی یا چٹان پر بیٹھی، اکیلی عورت آپ کو بڑی اچھی لگے گی۔ آپ اس کے سانولے سلونے چہرے کے نقش و نگار اور اس کی آنکھوں کے حسن سے نظریں ہٹا نہیں سکیں گے۔ میں جانتی ہوں کہ ویرانے میں اکیلی عورت ہر مرد کو بہت ہی خوبصورت لگا کرتی ہے۔ کبھی اسے بھی ایسی ہی خوبصورت عورت نہ سمجھ بیٹھنا۔ وہ کوئی چڑیل یا کسی حسین عورت کی بدروح تو نہیں جو آپ کا کلیجہ منہ کے راستے باہر نکال دے گی۔ وہ آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑے گی۔ صرف اتنا کرے گی کہ آپ کو نفرت سے بھری ہوئی نظروں سے دیکھے گی۔ وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکی، اپنا سب کچھ بگاڑ چکی ہے۔

میں ابھی یہ نہیں سمجھ پائی کہ میں چٹان ہوں جس سے سمندر کی طوفانی موجیں سر پھوڑتی رہتی ہیں یا ایک طوفانی موج ہوں جو سر پھوڑنے کے لئے چٹان سے ٹکرانے کے لیئے آتی ہے یا اس موج کا ایک قطرہ ہوں —— دُور افق کے ساتھ ساتھ سرِ شام ماہی گیروں کی چھوٹی سی ایک کشتی، چھوٹا سا بادبان پھیلائے، اکیلی تیرتی، دُور ہی دُور جاتی نظر آتی ہے پھر وہ شام کے دھندلکوں میں بھٹکتی رات کی تیرگی میں گم ہو جاتی ہے —— کبھی جان پڑتا ہے جیسے وہ میرا وجود ہے۔ وہ میری زندگی ہے جو دھندلکوں اور تاریکیوں کے سمندر میں بہتی چلی جا رہی ہے۔

تو یہ ہے ایک معمّہ سا جو آپ کو منوڑہ کے ساحل پر جا کر نظر آئے گا۔

میں کہہ رہی تھی کہ اگر آپ مرد ہیں تو میرے قریب سے گذرتے مجھے دیکھنے کے لیئے رک نہ جانا۔ مجھے آپ سے نفرت ہے۔ مجھے محبت ہے اُن عورتوں سے جو چار دیواری کی دُنیا میں قید رہتی ہیں۔ انہیں قید میں رکھا جاتا ہے تاکہ ان کے خاوند باہر جا کر ان عورتوں کے ساتھ دل بہلاتے رہیں جو چار دیواری کی قید سے آزاد ہوتی ہیں —— میں قید تھی، اب میں آزاد ہوں۔ اس قید سے مجھے پیار تھا مگر ایک مرد نے اس پیار میں زہر بھر دیا ہے۔

میں جانتی ہوں آپ کہہ رہے ہوں گے کہ یہ عورت افسانہ نگار ہے۔ سیدھے لفظوں میں تو کچھ کہتی نہیں۔ اگر آپ جلدی میں ہیں تو کہانی سن لیجئے جو صرف اتنی سی ہے کہ میری شادی ہوئی تو ایک سال بعد میرا خاوند دولت سمیٹنے کے لیئے انگلینڈ چلا گیا جہاں سے اس نے مجھے طلاق بھیج دی۔ بس اتنی سی بات ہے جو آپ نے سو بار سنی ہوگی۔ لیکن میری زندگی کا ڈرامہ وہاں

سے شروع ہوتا ہے جہاں یہ سو بارسنی ہوئی کہانی ختم ہوتی ہے ۔

میں چار دیواری کی دنیا کی لڑکی تھی جسے صرف اس لیے دس جماعتیں تعلیم دی گئی تھی کہ میرے ماں باپ کو کسی نے بتا دیا تھا کہ اَن پڑھ لڑکیوں کو خاوند نہیں ملا کرتے اور مجھے برقعے میں لپیٹ کر گھریلو تربیت اس لیے دی گئی تھی کہ عورت کا اصل مقام گھر ہوتا ہے اور وہ مرد کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہے ۔ مرد باپ بھی ہوتا ہے، بھائی بھی اور خاوند بھی ۔ پھر یہ اس کا بیٹا بھی ہوتا ہے ۔ باپ اور بھائی لڑکی کو اپنے ہاتھوں ڈولی میں ڈال کر پرائے مرد کے حوالے کر دیتے ہیں ۔ یہ اجنبی چاہے اسے سینے سے لگالے، چاہے سپنے دکھاتا رہے ۔ چاہے حسین سپنا بن کر تھوڑے ہی عرصے بعد ڈراؤنا خواب بن جائے اور جب یہ مرد عورت کے وجود سے بیٹا بن کر جنم لیتا ہے تو عورت اسے اپنا خون پلا پلا کر صرف اس لیے جوان کرتی ہے کہ باہر سے ایک لڑکی آکر اسے ماں سے نوچ لے جائے ۔

میں بھی پردے میں بیٹھی، برقعے کے نقاب میں سے اس مرد کی راہ دیکھتی رہی جسے میں نہیں جانتی تھی کہ کون ہوگا، کیسا ہوگا! —— اور جب شادی کی پہلی رات وہ میرے ماں باپ کو بیس ہزار روپوں کی مالیت کے جہیز اور آٹھ ہزار روپے کے اخراجات کے تلے بوجھ تلے دبا کر میری زندگی میں داخل ہوا تو میرے دل نے کہا کہ یہی ہے وہ جس کی تُو راہ دیکھا کرتی تھی ۔ میں نے تو اسے بِن دیکھے قبول کر لیا تھا اور نکاح کے رجسٹر پر کانپتے ہاتھوں سے دستخط کر دیئے تھے ۔ اسے دیکھا تو دل نے بھی اسے قبول کر لیا ۔ مجھے یہی تربیت دی گئی تھی کہ تمہارا ہاتھ جس کے ہاتھ میں دیدیا جائے، اسے قبول کر لینا ۔ ماں باپ کی عزّت اسی سے قائم رہتی ہے ۔ تصوّروں کے شہزادوں کی خاطر اپنی ازدواجی زندگی کو دیمک لگانے والی لڑکیاں کم ہی ہوتی ہیں ۔ میں ان میں سے نہیں تھی ۔ شریف لڑکیاں ازدواجیت کی دہلیز پر قدم رکھنے سے پہلے کنوارپنے کے خواب اور تصوّرات دہلیز سے باہر جھٹک دیا کرتی ہیں ۔

میرا میکہ اور سسرال امیر کبیر نہیں ہیں بلکہ یہ اس درمیانے طبقے کے گھرانے ہیں جو غربت کو سفید پوشی سے چھپائے رکھتے ہیں ۔ ہم بھی ایسے ہی سفید پوش تھے ۔ میرا دولہا جو اب نہ جانے کس کا دولہا ہے، دو سو پچیس روپے تنخواہ لیتا تھا ۔ میرے سسر کی پچاس روپے پنشن تھی ۔ میرے میکے میں بھی ہر ماہ اتنے ہی پیسے آیا کرتے تھے ۔ سنا ہے کہ ایک

ا زمانہ تھا جب لوگوں میں اونچے نیچے کی تمیز شرافت اور ملنساری سے ہوتی تھی ۔ معلوم نہیں کہ وہ کون سا زمانہ تھا ۔ ہم تو اس زمانے میں جوان ہوئے جب اونچ نیچ کا پیمانہ روپیہ پیسہ ہے ۔ آپ دو منزلہ مکان یا کوٹھی میں رہتے ہیں تو آپ شریف ہیں اور سوسائٹی کے معزز فرد اور اگر معمولی سے مکان میں رہتے ہیں یا کسی کے کرایہ دار ہیں تو آپ کچھ بھی نہیں ۔ آپ کی کوئی حیثیت ہی نہیں ۔ ایسے ہی ہماری کوئی حیثیت نہیں تھی ۔ جسے دیکھو وہ کسی نہ کسی طرح دولت کمانے کی فکر میں نظر آتا ہے ۔ یہی فکر میرے دولہا کو لاحق ہو گئی ۔ ایک تو آمدنی تھوڑی تھی ۔ اس کے ساتھ ان لوگوں نے اپنے آپ یہ ظلم کیا کہ مجھے بیاہ لانے کے لیے قرضے کی زنجیروں میں جکڑے گئے ۔ انہوں نے محلّے برادری میں ناک کا بھرم قائم رکھنے کے لیے ہونہار باقیمت ا کر ڈالا تھی ۔ شادی تو خاموشی سے اپنے وسائل کے دائرے میں رہ کر بھی ہو سکتی ہے مگر کسی میں جرأت نہیں ۔ قرض لے کر شادی کا جو ہنگامہ بپا کیا جاتا ہے، وہ تو دو تین دنوں میں ختم ہو جاتا ہے لیکن اس ہنگامے سے جو ہنگامے جنم لیتے ہیں، وہ ساری عمر ختم نہیں ہوتے ۔

میں بھی انہی ہنگاموں کی شکار ہوئی ہوں ۔

شادی کے فوراً بعد مجھے پتہ چلا کہ دولہا میاں پر دولت مند بننے کا جنون سوار ہے ۔ اب یہ جنون ایک شدید ضرورت کی صورت اختیار کر گیا تھا کیونکہ ان کا بال بال قرض میں بندھ گیا تھا جسے وہ مجھ سے چھپائے پھرتے تھے ۔ میں بھانپ گئی اور ایک روز اپنا سارا زیور اُن کے آگے ڈھیر کر کے کہا کہ یہ بیچ آیئے اور قرض ادا کیجیے ۔ اس میں وہ زیور بھی شامل تھا جو میرے ماں باپ نے پیٹ کاٹ کر، پائی پائی جمع کر کے بنایا تھا ۔ میں اسے بھی اپنی زندگی کے ساتھی پر قربان کر دینا چاہتی تھی ۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں میٹرک پاس ہوں کہیں نوکری تلاش کر لیتی ہوں یا سلائی کڑھائی اور اونی کام کر کے گھر بیٹھے کما سکتی ہوں ۔ مگر یہ دونوں صورتیں ان کے لیے قابلِ قبول نہیں تھیں کیونکہ برادری میں ان کی بے عزّتی ہوتی تھی ۔ یہ زیور میرے لیے لعنت تھا جس نے میرے خاوند اور اس کے ماں باپ کو چند دنوں میں دق کا مریض بنا دیا تھا ۔ میری اپنی حالت یہ تھی جیسے میں نئی دلہن نہیں ہوں بلکہ یہ لوگ مجھے کہیں سے اغوا کر کے لائے ہوں ۔

میں چوری چوری ایک ملنے والوں کے گھر سے دو سویٹروں کی اُون اٹھا لائی اور اجرت پر بُننے لگی جنہیں مکمل کیا تو سولہ روپے اجرت مل گئی پھر ایک اور گھر سے کام مل گیا لیکن میرے

خاوند کو علم ہو گیا اور اس نے سختی سے روک دیا۔ میں نے اس سے بحث کی تو انکشاف ہوا کہ وہ صرف قرض چکانے کی فکر میں نہیں بلکہ دولت کے زور پر بڑا آدمی بننے کے خواب بھی دیکھ رہا ہے۔ اس کے دو دوست انگلینڈ گئے ہوئے تھے۔ وہ اسے خط لکھتے رہتے تھے جو میں بھی پڑھا کرتی تھی خطوں سے معلوم ہوتا تھا کہ انگلینڈ میں سونے چاندی کی ندیاں بہتی ہیں۔ میرا خاوند بھی انگلینڈ جانے کے لیے پر تولنے لگا۔ اٹھتے بیٹھتے اس کی زبان پر انگلینڈ کا ورد رہنے لگا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ قرض ادا کرنے کی بجائے انگلینڈ کا کرایہ جمع کر رہا ہے۔

میں جب انگلینڈ کا نام سنتی تھی تو کانپ اٹھتی تھی۔ میں نے دو جوان عورتیں دیکھی تھیں اور کئی ایک کے قصے سنے تھے جن کے خاوندوں نے انگلینڈ جا کر انہیں طلاق نامے بھیج دیے تھے۔ اسی ڈر سے میں اپنے خاوند کے دماغ سے انگلینڈ کا بھوت اتارنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے میری بات ماننے کی بجائے مجھے سبز باغ دکھانے شروع کر دیے۔ کہنے لگا کہ پانچ سال بعد واپس آؤں گا تو کم از کم ایک لاکھ روپے کے علاوہ ایک کار بھی ہو گی۔ اس روپے سے پاکستان میں کاروبار کروں گا تو ہم تم کوٹھی میں رہیں گے۔

میں سبز باغوں کے فریب میں آنے والی نہیں تھی۔ اس کے پیار کے دھوکے میں آ گئی۔ اس نے مجھے ایسے طلسماتی الفاظ میں پیار و محبت اور وفا کا یقین دلایا کہ میں اس کی بات مان گئی۔ عورت کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ اس نے جب بھی شکست کھائی ہے اس مرد سے کھائی ہے جس سے اُسے پیار ہوتا ہے۔ پیار کا دھوکا عورت کو لے ڈوبتا ہے۔ میں نے اپنے خاوند کو ایک بار پھر زیور پیش کیا اور کہا کہ بیچ کر انگلینڈ کا کرایہ اور دیگر اخراجات پورے کر لو۔ اس نے میرا زیور بیچ ڈالا اور انگلینڈ چلا گیا ——— کبھی واپس نہ آنے کے لیے چلا گیا۔ جی میں آتی ہے کہ ازدواجی زندگی کی آخری رات کے ایک ایک لمحے کی تفصیل سناؤں۔ لیکن آپ کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وہ لمحے میری زندگی کے تھے جو ہاتھ سے نکل گئے۔ اب کبھی لوٹ کے نہیں آئیں گے ——— میں نے اُس وقت کی لاش کو ذہن کے قبرستان میں دفن کر دیا ہے اور اس مدفن پر یادیں نوحہ خواں رہتی ہیں اور کبھی کبھی آنکھیں اشکوں کے دیپ جلایا کرتی ہیں۔

چھ سات مہینوں تک اس کے خط آتے رہے جن میں جذبات زیادہ ہوتے تھے۔ اس نے کئی ایک خطوں میں یہ جملہ لکھا تھا ——— "تیرے سانولے سلونے حُسن کی قسم، تجھ جیسی وفادار رفیقہ سے بے وفائی نہیں کروں گا" ——— جدائی کے پہلے سال کے آخری حصے میں اس کے خطوں کی رفتار کم ہونے لگی۔ میں نے اپنے خطوں کی رفتار تیز کر دی۔ دوسرا سال شروع ہوا تو اس کے خط کم آنے لگے اور ان میں میرا سانولا سلونا حسن غائب ہو گیا۔ صرف مصروفیت کا رونا رویا ہوا ہوتا تھا۔ دوسرے سال کے آخر میں مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ میرے سانولے حسن پر کسی فرنگن کا دودھیا حسن غالب آ گیا ہے۔

پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ تیسرے سال کے دوسرے مہینے میں سات سمندر پار کی جنت سے ایک خط آیا جس نے سمندروں کے اِس طرف کے ساحل پر میری مجبور زندگی کو جہنم بنا دیا۔ میرے پاس زیور نہیں رہا تھا۔ ہوتا تو بیچ کر انگلینڈ چلی جاتی اور اس مرد کے پاؤں میں سر رکھ کر اس سے اس پیار کی بھیک مانگتی جس کی اس نے قسم کھائی تھی۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ زیور اسی کی نذر کر چکی تھی۔ میرے پاس آہیں اور خاموش فریادیں تھیں جو کسی نے نہ سنیں۔ میں راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر خدا کے حضور سجدہ ریز ہوئی، پھوٹ پھوٹ کر روئی، مگر خدا نے بھی نہ سنی۔ میں سیدھی سادی لڑکی تھی۔ شاید ڈھنگ سے رونا بھی نہ آتا تھا ورنہ خدا تو ضرور سن لیتا۔

میرے باپ نے مجھے گلے لگا لیا۔ چھوٹے بھائی نے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ مگر میں تو اس مرد کے گلے لگنا چاہتی تھی اور اس مرد کا ہاتھ اپنے سر پر رکھنا چاہتی تھی جو میرا باپ اور بھائی تھا۔ میری زندگی کی امنگ اور میری نسائیت کا غرور تھا۔ امنگ لہولہان ہو گئی اور غرور چار دیواری کے اُسی قید خانے میں مر گیا جہاں سے میری ڈولی اٹھی تھی۔

میرا اب سسرال میں کیا کام تھا؟ وہاں میرا کوئی غمخوار نہیں تھا۔ کبھی تو ساس مجھ سے ہمدردی جتاتی تھی اور ایک بار اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا "کلموئی ڈائن نے میرے بچے کو گھر سے بھگا دیا ہے" ——— میں بھی اس گھر سے بھاگ کر اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئی اور ان عورتوں میں شامل ہو گئی جنہیں انگریز کی دولت نے اندھیرے غاروں میں پھینک دیا ہے۔ میں نے ابھی تک کسی وکیل سے نہیں پوچھا کہ آیا ہمارا قانون ان مجرموں کے سامنے بے

بس ہے جو اپنی بیویوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کرکے انگلینڈ کے بے حیا اور ننگے معاشرے میں عیش کر رہے ہیں یا شاید ہم اتنے غریب ہیں کہ قانون کے دروازے پر دستک کی تاب نہیں رکھتے؟ —— کوئی اتنا ہی بتا دے کہ ہمیں جو سزا مل رہی ہے، وہ کس خطا کی ہے؟

پیاسا صحرا نورد سراب کے دھوکے میں چلتا ہی جاتا ہے۔ ہر قدم پر اسے دس بیس قدم دور پانی کی چمک دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس چمک کے تعاقب میں تھکتا نہیں اور پانی اور اس کے درمیان فاصلہ بھی کم نہیں ہوتا۔ اگر اسے صرف دو گھونٹ پانی پلا کر اس کے ہونٹوں سے مشکیزہ کھینچ لیا جائے تو وہ دو قدم بھی نہ چل سکے۔ یہ دو گھونٹ اس کی پیاس کو اور زیادہ بھڑکا دیں، جیسے اس نے دو انگارے نگل لئے ہوں۔

میں وہ صحرا نورد ہوں جس کے منہ سے پانی لگا کر مشکیزہ ریت پر انڈیل دیا گیا۔ میں قدم قدم پر گری، گر گر کر اٹھی اور ڈگمگانے لگی۔ بہت کوشش کی کہ پیاسی ہی ڈگمگاتی چلی جاؤں اور ریت کے سمندر میں چلتے چلتے ریت کی دیوار بن جاؤں مگر چل بھی نہ سکی، دیوار بھی نہ بن سکی۔ میرے سامنے سراب ہوتا۔ پانی کی چمک کا دھوکا ہوتا یا دور افق پر کوئی حسین واہمہ کھڑا نظر آتا تو میں کبھی نہ تھکتی، چلتی چلی جاتی۔

اس حقیقت کو صرف عورت جانتی ہے کہ عورت ساری عمر کنواری رہ سکتی ہے مگر بیوگی کی ایک رات اس کی ساری عمر جتنی لمبی ہوتی ہے۔ کسی پل چین نہیں آتا، تاریکیاں چھٹتی ہی نہیں، سحر ہوتی ہی نہیں۔ بیوہ اپنے آپ کو سو سو بار یقین دلاتی ہے کہ کرموں جلی، تیرا سہاگ منوں مٹی تلے دب گیا ہے۔ اب تیرے سہاگ کی قبر پر ہری ہری گھاس اُگا کرے گی۔ تیرا سہاگ کبھی سہرا نہ ہوگا —— مگر بیوہ کا دل نہیں مانتا۔ اس کی تاریک اور تنہا راتوں میں غم ہنستے اور خوشیاں روتی ہیں۔ اس کے دل کے دریچے سے کوئی جھانکتا ہی رہتا ہے مگر سامنے نہیں آتا۔

اور اس بیوہ کے دل کا روگ وہی عورت جان سکتی ہے جس کا سہاگ کسی دوسری عورت نے چھین لیا ہو۔ ہر آہٹ اسے اسی مرد کی آہٹ معلوم ہوتی ہے جس نے اس کے مہندی بھرے ہاتھوں کو ہاتھوں میں تھام کر اس کے دل کے دریچے وا کیے تھے —— میں وہ عورت ہوں جو ایسے فریب کا شکار ہوئی جس نے ان گنت، نو، فریبوں کو جنم دیا۔

شاید اس نے مذاق کیا ہوگا..... وہ بہت سیدھے ہیں نا! کسی کٹنی فرنگن نے ان پر جادو کر دیا ہے..... جادو اُتر جائے گا..... وہ مجھے نہیں چھوڑ سکتے..... وہ ایسے تو نہیں....."

میں نے اپنے آپ کو بڑے بڑے حسین فریب دیے، اپنے آپ کو بڑے ہی دلنشیں تصوّر دیے۔ یادوں کی شفاف جھیل میں غوطہ زن ہوئی۔ مگر ایک تلخ حقیقت نے جھپٹا مار کر مجھے فریبوں اور تصوروں کے حسن سے اٹھا کر اس قبرستان میں جا پٹخا جہاں مجھ جیسی ہزار دل عورتوں کے سہاگ دفن تھے —— ان عورتوں کے سہاگ جن کے خاوندوں نے انگلینڈ سے طلاق نامے بھیج دیے تھے۔

اگر خاوند مر جاتا تو دل کو اطمینان تو ہوتا کہ موت کے سامنے کسی کا بس نہیں چلتا، صبر کرو، اللہ صبر میں راضی ہے۔ مگر وہ زندہ تھا۔ اس کی قسمیں اور وعدے زندہ تھے۔ میں کیونکر صبر کر لیتی؟ میری عمر بھی کوئی ایسی پختہ نہیں تھی کہ اتنی شدید چوٹ کو سہہ لیتی۔ میں صبح و شام اس بچے کی طرح بلک بلک کر روتی رہی جس کا خوبصورت کھلونا ہاتھ میں آتے ہی ٹوٹ گیا ہو۔ میں بچی ہی تو تھی۔ میرا ایک کھلونا نہیں، سارے خواب ہی چکنا چور ہو گئے تھے۔ ماں میرا دل بہلانے کی بہت کوشش کرتی تھی مگر میرے آنسو خشک کرنے کی کوشش میں اس کے اپنے آنسو بہنے لگتے تھے۔ ابّا الگ بیٹھے آہیں بھرتے اور خلاؤں میں ٹکٹکی باندھے گم سم بیٹھے رہتے تھے۔ ہنستے مسکراتے گھرانے پر وحشت طاری ہو گئی تھی اور جب میں سوچتی تھی کہ یہ صرف ایک آدمی کے جرم کا نتیجہ ہے تو غصّے سے میرے دانت اس طرح ایک دوسرے کو پیسنے لگتے تھے جیسے یخ ٹھنڈ سے بج رہے ہوں۔ آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا اور انتقام کے جوش میں پاگل ہونے لگتی تھی۔ میں شاید اپنا غم جھیل لیتی، ماں باپ کو غموں کے بوجھ تلے کراہتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میرا تنومند بھائی محض بے بس تھا۔

ایک تو یہ عتاب تھا جو میرے دل سے آگ بگولے کی طرح اٹھتا تھا اور مجھے ہی بھسم کرتا گزر جاتا تھا اور اس کے ساتھ جذبات تھے جو بگولوں میں یادوں کے دیئے جلانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ مجھے پہلی رات اور سہاگ کی ہر رات یاد آتی تھی۔ مجھے اس کی پہلی بات اور ہر ایک بات

یاد آتی تھی۔ وہ راتیں سہانی اور باتیں سحر انگیز تھیں۔ میں اپنے بالوں میں اس کی انگلیوں کا لمس ابھی تک محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے ہواؤں میں بھی اسی کے سانسوں کی بو باس آتی ہے اور میں تڑپ تڑپ اٹھتی تھی اس کا جسم بھی پاگل کیے جا رہا تھا اور اس کی یادیں بھی پاگل کیے جا رہی تھیں۔ ایک طرف نفرت اور انتقام کی آندھیاں تھیں اور دوسری طرف رومان بھری یادوں کی موجیں تھیں۔ دماغ پھٹنے لگتا تھا۔ روح پیاسی مری جا رہی تھی۔ دل انتقام کے لیے اچھل رہا تھا اور آنکھیں خون رو رہی تھیں۔

ذہن کی اس حالت کا یہ اثر ہوا کہ مجھے بات بات پر غصہ آنے لگا۔ میرے ہاتھ سے برتن ٹوٹنے لگے۔ ایک بار امی کو جھڑک دیا۔ چھوٹے بھائی کے لیے میں آفت بن گئی۔ گھر والے میری حالت کو سمجھتے تھے اس لیئے میری ہر طرح کی بکواس اور پھٹکار برداشت کر لیتے تھے۔ پھر بھی چین نہ آتا تھا۔ سب پر غصہ جھاڑ کر جب مجھے خیال آتا کہ ماں باپ پہلے ہی دکھی ہیں اور میں نے انہیں اور دکھی کر دیا ہے تو مجھے اپنے آپ پر غصہ آ جاتا۔ جی میں آتی کہ اپنا منہ نوچ لوں جو مجھ سے نوچا نہ جا سکا۔ میں رات رات بھر روتی رہتی۔

ایک روز چھوٹے بھائی نے کہا —— "آپا، آؤ پکچر دیکھنے چلیں" —— یہ پہلا موقع تھا کہ بھائی نے مجھے پکچر پہ چلنے کو کہا تھا۔ ہمارے گھر میں ایسا رواج نہیں تھا۔ ہم پکچر پہ گئے تو بھائی نے بتایا کہ ابا جان نے کہا تھا کہ بہن کو سیر و تفریح کے لیے باہر لے جایا کرو۔ پکچر شروع ہو گئی۔ ایک رومانی منظر شروع ہوا تو میں نے اپنے سینے میں ہلچل محسوس کی۔ انگلینڈ جا کر بھول جانے والا بھی ایسے ہی مکالمے بولا کرتا تھا۔ میں نے بے خیالی میں اپنے بھائی کے ہاتھ کو پکڑ لیا اور مجھے اس وقت محسوس ہوا کہ میں نے اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا ہے جب اس نے ہنس کر میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ میں بھی ہنس پڑی مگر ندامت سے میرا پسینہ پھوٹ پڑا۔

اس کے بعد بھائی مجھے کبھی کلفٹن لے جاتا، کبھی منوڑہ اور کبھی ہم کسی سینما ہال میں جا بیٹھتے۔ گھر سے باہر جا کر گھٹن کا احساس کم ہو جاتا تھا۔ گھر آتے ہی میری حالت مرغی کے اس بچے کی سی ہو جاتی جسے چیل مرغی کے پروں تلے سے بے رحم پنجوں میں اٹھا کر اپنے گھونسلے میں جا رکھتی ہے۔

پھر مجھے برقعے سے بھی گھٹن محسوس ہونے لگی لیکن برقع اتار پھینکنے کے خیال سے میں

یوں سکڑ جاتی جیسے بھرے بازار میں ننگی ہو گئی ہوں۔ ایک روز میں کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ امی کو شاید معلوم نہیں تھا۔ محلے کی ایک بزرگ سی عورت آئی۔ وہ اور میری امی ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ اس عورت نے سب سے پہلی بات یہ کہی —— "تمہاری بیٹی کے بھاگ کھوٹے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں کنوارا رشتہ چاہیے۔ چھوڑی ہوئی کو گھر لا کر ہم کیوں ناک کٹوائیں؟"

میں نے بعد میں امی سے پوچھا تو اس نے صاف بتا دیا کہ اس نے اس عورت کو فلاں گھر میرے رشتے کے لیئے بھیجا تھا اور انہوں نے یہ جواب دیا ہے۔ "کنوارا رشتہ" اور "چھوڑی ہوئی" ایک شور بن گیا جیسے لوگوں کا ایک ہجوم میرے گرد گھیرا ڈالے شور بپا کیئے ہوئے ہو، جیسے سنگسار کرنے کے لیے مجھ پر پتھر برسائے جا رہے ہوں۔ میں تو اپنے آپ کو بے گناہ اور معصوم ہی سمجھتی تھی مگر لوگ مجھے "چھوڑی ہوئی" کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ میں معصوم نہیں، گناہگار تھی۔ اب میں کسی شریف گھرانے کی بہو بننے کے قابل نہیں رہی تھی۔ میں چچوڑی ہوئی ہڈی تھی جسے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا تھا۔

آہ، میرے نصیب۔ میں کیسے سمجھاتی کہ میں چھوڑی ہوئی بیوی نہیں، چھوڑی ہوئی منزل ہوں جس کے کواڑ اب بھی اس اجنبی کے لیے کھلے ہیں جو دم بھر کو آیا، سستایا اور کواڑ کھلے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ راتوں کو چلنے والے اندھیری راہوں پر بھٹک جاتے ہیں اور منزل سے کہیں دور تھک کر سو جاتے ہیں —— میں وہ منزل ہوں جو اپنے راہ رو کی تلاش میں بھٹک گئی ہے۔

"چھوڑی ہوئی" ایک تیر بن کر میرے شرم و حجاب میں اتر گیا۔ اگر میں گناہگار تھی تو میرے گرد لپٹا ہوا یہ سیاہ پردہ کیسا؟ غم اور غصے نے مجھے بے حجاب کر دیا اور ایک روز میں اپنے بھائی کے ساتھ برقعے کے بغیر باہر نکل گئی۔ واپس آ کر میں نے امی سے پوچھا کہ ابا جان نے برا تو نہیں منایا تھا؟ امی نے جواب دیا کہ نہیں، وہ کہتے تھے کہ گھومنے دو، گھر میں تو گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔

پھر ایک اور گھر سے امی کو اپنے پیغام کا یہی جواب ملا —— "لڑکی چھوڑی ہوئی نہ ہوتی تو ہم دل و جان سے قبول کر لیتے۔"

اس جواب نے میرے نصیب کے تابوت کو سر بمہر کر دیا۔

۔ میری جذباتی حالت اور حالات نے مجبور کر دیا کہ قید و بند سے آزاد ہو جاؤں۔ اس کے ساتھ ہی میں گھر کے حالات سے بھی بے خبر نہیں تھی۔ چھوٹے بھائی کی تنخواہ بہت تھوڑی تھی جو ابّا جان کی تنخواہ کے ساتھ مل کر بمشکل ان کی سفید پوشی کو قائم رکھتی تھی — مہنگائی ایسی تیزی سے بڑھ رہی تھی کہ سفید پوشی داغدار ہونے لگی تھی۔ میں نے سوچا کہ کہیں ملازمت مل جائے تو دماغ مصروف رہے گا۔ کڑھنے اور غصّے سے جلتے رہنے سے بچ جاؤں گی اور اسی بہانے گھر میں چند روپے آ جایا کریں گے۔ بوڑھا باپ میرے غم میں نڈھال ہوا جا رہا تھا۔ میں نے انہیں تھوڑی سی قیمت ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابّا جان سے اجازت مانگی تو انہوں نے یہ کہہ کر اجازت دے دی کہ میں بیٹی کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی تو کھا سکتا ہوں، اس کے ہاتھ کی کمائی ہوئی روٹی نہ کھا سکوں گا۔ صرف اس خیال سے اجازت دے رہا ہوں کہ تمہارا دماغ فارغ نہ رہے، کسی طرف بٹ جائے تو اچھا ہے۔

کچھ بھائی نے مدد کی، کچھ خود بھاگ دوڑ کی اور ایک پرائیویٹ کمپنی میں دو سو روپے ماہوار کی نوکری مل گئی۔ یہ ایک غیر ملکی فرم کی برانچ تھی جس کا منیجر ایک جواں سال پاکستانی تھا۔ اسی نے میرا انٹرویو لیا تھا۔ اس نے مجھ سے یہی ایک سوال پوچھا — "آپ نے ملازمت کو کیوں پسند کیا ہے؟" — میں نے اس سوال کا جواب دیا تو نصف گھنٹہ گزر چکا تھا اور میرے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اسے شادی سے لے کر اس کے دفتر میں داخل ہونے تک کی روئیداد بالکل ان الفاظ میں سنا دی جن الفاظ میں آپ کو سنا رہی ہوں۔ میرا آخری جملہ یہ تھا — "میں کسی مصروفیت میں ڈوب کر اپنے آپ کو بھول جانا چاہتی ہوں۔"

اس نے صرف اتنا اور پوچھا — "تعلیم؟" — میں نے جواب دیا — "میٹرک۔ تجربہ کوئی نہیں، رو سکتی ہوں۔ آہیں بھر سکتی ہوں۔ کوئی خوش ہو تو اسے ایک منٹ میں اداس کر سکتی ہوں۔" — اس نے قہقہہ لگایا۔ میرے دونو ہاتھ میز پر تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ اپنی مٹھی میں لے کر کہا — "اگر آپ مجھے اداس کر دیں تو میں آپ کی تنخواہ پانچ سو روپے ماہوار کر دوں گا۔ فی الحال آپ میرے ساتھ دو سو روپے ماہوار پر کام کریں گی اور کل سے آپ نہ خود اداس ہوں گی نہ کسی اور کو اداس کر سکیں گی —" وہ سنجیدہ ہو گیا اور میرے ہاتھ کو دبا کر بولا — "محترمہ! پتھروں کے دیس میں پتھر بن کر رہیے۔ جس کی خاطر آپ رو رہی ہیں، وہ کسی کی خاطر ہنس

رہا ہے۔ کیا آپ کے آنسوؤں نے اس کے ہونٹوں سے ہنسی نوچ لی ہے؟ کیا آپ کی فریادیں اسے مجبور کر رہی ہیں کہ وہ لوٹ آئے؟ وہ پنجرہ توڑ کر اڑ گیا ہے۔ آپ پنجرے میں کیوں قید ہو گئی ہیں؟ اگر مرد کو حق ہے کہ عورت کو الفاظ کا دھوکہ دے کر اسے بھٹکتا چھوڑ جائے تو عورت سے یہ حق کون چھین سکتا ہے کہ وہ بھی آزاد ہو جائے اور اس آدمی پر لعنت بھیجے؟"

وہ ایک خوبرو آدمی تھا۔ اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ، اس کی باتوں میں متانت اور لہجے میں اُنسیت تھی۔ اس نے دردآمیز لہجے میں کہا — "آپ کو ایک مرد نے فریب دیا ہے اور مجھے ایک عورت نے فریب دیا ہے۔ میں بھی رویا تھا۔ آپ کی طرح آہیں بھی بھری تھیں۔ لیکن ایک روز میں نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو اپنے آپ سے کہا — "تم بزدل قیدی ہو۔ ایک عورت کی یادوں کی زنجیروں میں بندھے ہوئے غلام ہو" — میں نے ایک ہی جھٹکے میں زنجیریں توڑ ڈالیں اور آزاد ہو گیا۔ اب آزاد ہوں۔ آپ کی جذباتی حالت کو میرے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے اپنا ہمراز سمجھیے۔ مجھے اس دفتر میں آپ کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن آپ کمرے میں داخل ہوئیں تو میں نے آپ کے چہرے سے بھانپ لیا تھا کہ یادوں کا ایک اور قیدی چلا آ رہا ہے۔ آپ کو ان زنجیروں سے آزاد کرنے کے لیے آپ کو اپنے دفتر میں جگہ دی ہے۔ آپ سے صرف اتنی سی درخواست کروں گا کہ مجھے غلط نہ سمجھئے گا۔ آج میں نے آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں آپ نے کیا محسوس کیا ہے۔ یہ میری بے ساختگی اور وارفتگی کا مظاہرہ ہے۔ شاید آپ نے بُرا منایا ہوگا!"

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا — "بُرا مناتی تو ہاتھ کھینچ نہ لیتی!" — یہ اس کی باتوں کا اثر تھا جس نے میرے زخم خوردہ دل کو سہلا لیا تھا۔ میں نے ذرّہ بھر جھجک محسوس نہ کی۔ آپ مجھے بے حیا کہہ سکتے ہیں لیکن آپ میری ذہنی حالت کو نہیں سمجھ سکتے۔ میں اندر ہی اندر جل بھُن رہی تھی۔ اس مسکراتے ہوئے آدمی نے میری جلن کو ٹھنڈا کر دیا۔ میں ڈوب رہی تھی۔ اس نے مجھے بچا لیا۔

میں اس کے دفتر میں کام کرنے لگی۔ میرا کام پرائیویٹ سیکرٹری کا تھا۔ وہ مجھے زیادہ دیر اپنے کمرے میں بٹھائے رکھتا تھا — میں ٹیلی فون سنتی تھی اور اس کے ملنے والوں کو اس سے پوچھ کر وقت دیتی تھی۔ پہلے روز میں دوپہر کا کھانا گھر سے لے گئی۔ اس نے ڈبّہ دیکھ لیا

اور کہنے لگا ـــــ " اپنی توہین نہ کرو۔ تم میری ذاتی سیکرٹری ہو۔ کھانا میرے ساتھ کھایا کرو گی۔"
میں اسے بہت بڑا آدمی سمجھتی تھی لیکن اس نے مجھے ایسی اہمیت دے دی کہ میرے دل سے
کمتری کا احساس نکل گیا۔ اس نے کہا ـــ " ہمارے ہاں عورت کو گھر میں زرخرید لونڈی بنا کر رکھا
جاتا ہے۔ اس کی شخصیت کو کچل دیا جاتا ہے تاکہ مرد من مانی کر سکے اور عورت آہ بھی نہ بھر سکے۔ میں
چاہتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو کچلی ہوئی لڑکی نہ سمجھو۔ تم جتنی حسین ہو اتنی ہی ذہین ہو" ـــ اور وہ جو
کل مجھے آپ کہہ رہا تھا، مجھے بڑی ہی بے تکلفی سے تم کہنے لگا۔ یہ بے تکلفی مجھے بہت اچھی لگی۔
وہ باتیں بہت کرتا تھا لیکن بور نہیں کرتا تھا۔ اس کی ہر بات دلچسپ اور انداز شگفتہ ہوتا تھا۔
مجھے اس کی باتیں اچھی لگنے لگیں۔ جی میں آتی کہ وہ بولتا رہے اور میں سنتی رہوں۔ مجھے اس پنجرے
سے رہائی مل جاتی ... جس میں میں نے اپنے آپ کو قید کر لیا تھا بلکہ جس میں مجھے میرا خاوند قید کر
گیا تھا۔ نوکری سے پہلے تو میں گھر بیٹھی کڑھتی رہتی تھی۔ یہ ایسی روحانی اذیت تھی جس نے مجھے
پاگل کر دیا تھا۔ میں کسی کو پاس بٹھا کر دل کی ہر ایک بات سنانا چاہتی تھی، مگر ایسا کوئی نہ ملا۔ گھر میں
صرف ماں تھی۔ میں ہر ایک بات اپنی ماں کو نہیں سنا سکتی تھی۔ بعض باتیں کسی ہمجولی سے ہی کی
جا سکتی ہیں۔ اس آدمی نے چند دنوں میں مجھے اپنے ساتھ اتنا زیادہ بے تکلف کر لیا کہ میں
نے اس کے ساتھ ہر طرح کی باتیں شروع کر دیں جن میں خاوند کے ساتھ تنہائی کے تعلقات
کی باتیں بھی شامل تھیں۔ اتنی ساری باتیں کر کے مجھے سکون محسوس ہوتا تھا جیسے میں نے زہر اگل دیا
ہو۔ دوسروں کو اتنا ہی معلوم تھا کہ میرا خاوند انگلینڈ چلا گیا ہے جہاں سے اس نے طلاق
بھیج دی ہے لیکن یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ میرے دل و دماغ کی حالت کیا تھی۔ صرف
یہ ایک انسان ملا جس نے میرے روگ کو سمجھ لیا اور میرا ہمجولی بن کر بڑے پیار سے میری
باتیں سننے لگا۔

تھوڑے دنوں بعد مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میں دق کی مریضہ ہوں اور وہ
مسیحا ہے اور اس نے مجھے موت کے منہ سے نکال لیا ہے۔ ایک روز، مجھے یاد آیا کہ پہلے روز
انٹرویو میں اس نے مجھے کہا تھا ـــ " آپ کو ایک مرد نے فریب دیا ہے اور مجھے ایک عورت
نے فریب دیا ہے" ـــ میں نے اس سے پوچھا یہ کیا قصہ تھا تو اس نے بتایا کہ اس نے ایک لڑکی
کے ساتھ شادی کی تھی جو بے وفا اور فریب کار نکلی۔ وہ اس کی محبت کے ساتھ شرمناک

کھیل کھیلتی رہی اور ایک روز اس کا بہت سارا روپیہ اور زیورات لے کر بھاگ گئی۔
اس نے یہ بات ایسے دردناک طریقے سے سنائی کہ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے
لگی۔ اس نے مجھے سکون دیا تھا۔ اب میں اسے سکون دینا چاہتی تھی۔ اس نے جب لڑکی کے
بھاگ جانے کے بعد ذہنی حالت سنائی تو یہ میرے لیے نئی نہیں تھی۔ وہ بھی میری طرح جل
بھن کر پاگل ہوا تھا۔ رات کو اٹھ کر باہر نکل جاتا تھا اور دیوانوں کی طرح کھلے آسمان تلے
گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ اس نے کہا ـــ "زخمی دل کو زخمی دل ہی پہچان سکتا ہے۔ تم میرے
دل کے زخم کو اچھی طرح جان سکتی ہو۔ اب میں لوگوں کے سامنے ہنستا ہوں اور تنہائی میں
اپنے آپ سے باتیں کر کے دل بہلا لیتا ہوں۔ لوگ مجھے خوش باش انسان سمجھتے ہیں مگر کسی
کو علم نہیں کہ میں نے ہنسی میں کیسے کیسے دکھ چھپا رکھے ہیں۔ جس طرح تمہیں کوئی بہلا
نہیں سکتا۔ اسی طرح مجھے کوئی نہیں بہلا سکتا"

"میں بھی آپ کو نہیں بہلا سکوں گی؟" میں نے پوچھا۔

"تم؟" وہ سوچ میں کھو گیا۔ پھر کہنے لگا "نہیں۔ میں تم سے ایسی توقع نہیں رکھوں
گا۔ تم خود دکھی ہو۔ یہ میرا فرض ہے کہ تمہیں اداس نہ ہونے دوں اور تمہارے ہونٹوں پر
ہلکی سی مسکراہٹ پیدا کرنے کے لیے اپنے دکھ بھول کر اپنے قہقہے قربان کر دوں"

ہم بہت دیر ایک دوسرے کے دکھ درد میں ڈوبے رہے اور ہم ایک دوسرے
کے بہت قریب ہو گئے۔ تھوڑے سے دن اور گذرے تو ہماری بے تکلفی یہاں تک بڑھ گئی کہ
اس نے میری خوبصورتی کی تعریفیں شروع کر دیں۔ میری حالت یہ ہو چکی تھی کہ اس کے بغیر
دل اداس ہو جاتا تھا۔ میں دفتر میں وقت سے پہلے چلی جاتی اور ہم دونوں شام تک دفتر میں
بیٹھے ایک دوسرے کی باتوں میں محو رہتے۔

ایک روز مجھ پر حجاب سا طاری ہو گیا۔ میں نے اسے کہا ـــ "میں تو پردہ نشین لڑکی
تھی۔ جو باتیں آپ کے ساتھ کرتی ہوں کبھی تصور میں بھی کسی غیر مرد سے نہیں کی تھیں۔ کبھی
ایسے لگتا ہے جیسے میں گناہ کر رہی ہوں"

"یہی عورت کی بے بسی ہے جس سے مرد فائدہ اٹھاتا ہے۔ عورت تصور میں بھی غیر مرد
کے ساتھ بات کرتے شرماتی ہے، مگر مرد گھر میں بیوی ہونے کے باوجود غیر عورتوں کے

ساتھ عیش کرتا پھرتا ہے۔ تمہارے خاوند کو کس نے حق دیا ہے کہ وہ انگلینڈ جا کر دوسری عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں منائے؛ اور تم سے یہ حق کون چھین سکتا ہے کہ تم ایک غیر مرد کے ساتھ دل کی بات کر گزرو؛ کب تک کڑھتی رہوگی؟ کون ہے جو تمہارے دکھوں کو جانتا ہے؟ سب یہی جانتے ہیں ناکہ تم چھوڑی ہوئی بیوی ہو جو اب کسی کی بیوی نہیں بن سکتی؛ تمہارے لیے ہر گھر کے دروازے بند ہو گئے ہیں اور تم نے اپنے ساتھ یہ ظلم کیا ہے کہ اپنے ہی دل کے دروازے اپنے لیے بند کر لیے ہیں۔ تم جوان ہو، حسین ہو، پنجرہ توڑو اور اڑتی پھرو۔"

اور اسی شام اس نے میرا پنجرہ توڑ دیا۔ وہ مجھے اپنی کار میں بٹھا کر کلفٹن لے گیا۔ ہم ساحل کے ساتھ ساتھ دور نکل گئے۔ شام کا دھندلکا گہرا ہو گیا۔ ہم تنہا تھے۔ دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ مگر اس نے میرے ہاتھ تک کو نہ چھوا۔ مجھے کہنے لگا کہ سینڈل اتار کر گیلی ریت پر چلو۔ میں جب گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلی تو روح کو بھی ایسی ٹھنڈ پہنچی کہ جی میں آئی کہ رات اسی گیلی ریت پر گذار دوں۔ وہ میرے ساتھ ایسی باتیں کرتا رہا۔ جس طرح باپ ننھی سی بچی کو بہلا رہا ہو۔ بہت دیر بعد وہ مجھے گھر چھوڑ گیا۔

ایک روز وہ مجھے ہاکس بے لے گیا۔ کراچی کے شور و شر اور غل غپاڑے سے دور یہ خطہ جنّت کی طرح اچھا لگا۔ وہ کھانے کے لیے بہت کچھ ساتھ لے آیا تھا۔ ہم نے ایک ہٹ (لکڑی کا کیبن) کرائے پر لے لیا اور سارا دن وہیں گزارا۔ ہم سمندر میں نہاتے رہے اور کھیلتے رہے۔ اس روز بھی اس نے میرے جسم کو ہاتھ تک نہ لگایا، نہ اتنا کہا کہ تم خوبصورت لڑکی ہو۔ اس نے کوئی ایسی بات نہ کی۔ اس کا روّیہ ایسا مخلصانہ تھا کہ میں اسے اپنی سہیلی سمجھنے لگی۔

پھر ہم کئی بار ایسے تنہا گوشوں میں گئے اور پکنک منائی۔ میرے دکھ دور ہو گئے اور میں آزاد ہو گئی۔ اگر وہ میرے قریب آنے کی کوشش کرتا تو مجھے معلوم نہیں کہ میرا ردّعمل کیا ہوتا۔ اس نے کبھی ہلکا سا اشارہ بھی نہ کیا کہ وہ مجھے چاہتا ہے یا اسے میرے ساتھ کوئی اور دلچسپی بھی ہے۔ اس کی یہی خوبی تھی جو مجھے اس کے قریب لے گئی۔ مجھے جو چوٹ پڑی تھی، اس نے میرے کردار کی دو چار کڑیاں کمزور کر دی تھیں اور میرے اندر غم، غصّے اور انتقام کا ایسا زہر بھر گیا تھا جس سے میں بھاگ جانا چاہتی تھی۔ مگر کوئی پناہ نہیں ملتی تھی۔ اسے

پناہ ملی تو میں اسی کی ہو رہی —— اور ایک روز میں بے تاب اور بے قابو ہو کر رو پڑی اور سسک سسک کر اسے کہا —— "تم میرے ساتھ وہ باتیں کیوں نہیں کرتے جو میرا خاوند کیا کرتا تھا۔ تم کیوں نہیں کہتے کہ تمہارے سانولے سلونے حسن کی قسم، تجھے دھوکہ نہیں دوں گا" —— اور میں نے اسے صاف لفظوں میں بتا دیا کہ میں تشنہ ہوں، پیاس سے مری جا رہی ہوں۔ یقین جانیئے میرا مطلب جنسی آسودگی سے نہیں تھا۔ میرے دل میں کوئی غلط خیال نہیں آیا تھا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ منزل یاد آ گئی تھی جو مجھ سے چھین لی گئی تھی۔ وہی خواب یاد آ گئے تھے جو میں نے ازدواجی زندگی کی پہلی رات جاگتے میں دیکھے تھے۔

اس نے مجھے اپنے قریب کر لیا اور اس نے میرے بالوں میں انگلیاں اُلجھا کر وہی باتیں شروع کر دیں جن سے مجھے بے وفا خاوند نے آشنا کیا تھا۔ میری تشنہ حسیّں سکوں پانے لگیں۔ اس روز کے بعد ہم رات کی تاریکیوں میں ساحل کے کنارے جانے لگے۔ پھر ہم ایک جان ہو گئے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ میرے ساتھ شادی کرے گا۔ ہم نے تنہائی میں منگنی کر لی۔ اس نے مجھے نہایت قیمتی کپڑے کے دو جوڑے دیے، ایک انگوٹھی بھی دی۔

ایک روز وہ مجھے کار میں بٹھائے ہوٹل کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں نے کہا کہ کلفٹن چلتے ہیں، وہیں کھائیں گے اور شام بھی وہیں گزاریں گے۔ وہ تیار ہو گیا۔ راستے میں اس نے ایک گھر کے سامنے کار روک لی۔ کہنے لگا کہ ایک دوست کو ضروری پیغام دے آؤں۔ وہ اس گھر کے اندر چلا گیا۔ جب باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ نیم وا کواڑوں میں سے ایک عورت جھانک رہی تھی۔ کار چلی تو بھی وہ عورت جھانکتی رہی۔ مجھے اب کسی بھی جھانکنے والے کا ڈر نہ تھا۔ میں خوش تھی کہ مجھ پر جو ظلم ہوا ہے اس کا انتقام لے رہی ہوں۔ میں خوش تھی کہ جن گھر والوں نے مجھے "چھوڑی ہوئی" کہہ کر دھتکار دیا ہے، میں ان کے منہ پر تھوک رہی ہوں۔ میں خوش تھی کہ مجھے ایک انسان مل گیا ہے جو میرے ہر دکھ کی دوا ہے۔

تھوڑے دنوں بعد امریکہ سے اس کی کمپنی کا ڈائریکٹر آ گیا۔ وہ روز کراچی میں رہ کر اسے اپنے ساتھ راولپنڈی لے گیا۔ اس کی غیر حاضری میں میرے لیے دفتر میں کوئی کام نہیں تھا اور اس کے بغیر جی بھی نہیں لگتا تھا۔ اس کی غیر حاضری کا دوسرا دن تھا کہ

دفتر میں ایک عورت آئی۔ مریض سی لگتی تھی۔ یوں لگا جیسے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ مجھے یاد آگیا کہ یہ وہی ہے جو اس روز دروازے میں سے جھانک رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا ـــــ "آپ شاید ان کے دوست کی بیگم ہیں؟ اُس روز وہ مجھے آپ کے گھر لے گئے تھے۔ کہتے تھے کہ اپنے دوست کو ایک پیغام دینا ہے۔"

اس نے علیل سی مسکراہٹ سے کہا ـــــ "مجھے معلوم ہے کہ صاحب باہر چلے گئے ہیں۔ میں ادھر سے گذری تو آپ کا خیال آیا۔ آپ کو دفتر میں کوئی کام نہ ہو تو آیئے تھوڑی دیر کے لیے میرے گھر چلیئے۔ کھانا میرے ساتھ کھایئے گا۔"

میں بالکل فارغ تھی۔ اس کے ساتھ چلی گئی۔ ٹیکسی اسی دروازے کے سامنے جا رکی جس میں اس عورت نے مجھے جھانکا تھا۔ وہ مجھے اندر لے گئی۔ ڈرائنگ روم میں گئی تو میری نگاہ انگیٹھی پر رکھی ہوئی ایک تصویر پر پڑی ـــــ یہ میرے صاحب اور اس عورت کی تصویر تھی ـــــ "یہ ہماری شادی کے دو روز بعد کی تصویر ہے۔ یہ گھر ان کے دوست کا نہیں، اُن کا اپنا گھر ہے اور میں ان کی بیوی ہوں۔"

"تو کیا وہ شادی شدہ ہیں؟" میں نے حیرت زدہ سرگوشی کی۔ "وہ تو کہتے تھے کہ ...."

"کہ میری بیوی بہت ساری رقم اور زیورات لے کر بھاگ گئی ہے۔" اس نے میرا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا ـــــ "وہ بیوی میں ہوں جس کی دفاؤں کا خون کرکے وہ تم جیسی لڑکیوں کے ساتھ عیش کر رہا ہے۔ یہ اس کا شغل ہے۔ تم سے پہلے ایک اور تھی۔ اس سے پہلے ایک اور تھی اب تمہارے بعد ایک اور ہوگی اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا جسے میری آہیں اور فریادیں نہ روک سکی ہیں نہ روک سکیں گی۔ اُس روز وہ گھر سے پیسے لینے آیا تھا اور تمہیں یہ بتایا تھا کہ یہ میرے دوست کا گھر ہے۔"

میں دھڑام سے صوفے پر بیٹھ گئی اور سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ کہنے لگی ـــــ "میں تم سے یہ تقاضا نہیں کروں گی کہ تم نے میرے خاوند کو اپنی محبت میں گرفتار کر لیا ہے اور مجھے میرا خاوند واپس کر دو۔ میں جانتی ہوں اسے کسی سے محبت نہیں۔ اس کے پاس مسکراہٹوں اور دلفریب باتوں کا جادو ہے جس سے کوئی لڑکی بچ نہیں سکتی۔ میں تمہیں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اپنے آپ کو اس کے فریب سے نکالو۔"

"لیکن ... لیکن ..." میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ "وہ میری کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا چکا ہے۔ مجھ پر جو بیتی ہے اس سے میں پاگل ہوگئی تھی۔ میں جل کر راکھ ہو چلی تھی کہ اس نے میری راکھ میں جان ڈال دی" ـــــ اور میں نے اس عورت کو اپنی کہانی سنا ڈالی۔ ہم دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔

"اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو شاید میں بھی وہی کچھ کرتی جو تم نے کیا ہے۔" اس نے دردمندانہ لہجے میں کہا۔ "عورت کی محرومیوں اور جذبات کی پیاس کو وہی عورت جان سکتی ہے جو ان محرومیوں اور پیاس سے دوچار ہو۔ میں ہوں وہ عورت جو تمہارے دل کا حال بہت اچھی طرح جان سکتی ہوں۔ گمراہ خاوندوں کی بیویاں اکثر گمراہ ہو جاتی ہیں کیونکہ ہماری سوسائٹی میں گمراہ کرنے والے موجود ہیں۔ تم سے پہلے ایک اور لڑکی میرے خاوند کی عیاشی کا کھلونا بنی رہی ہے۔ وہ تمہاری ہی تصویر تھی۔ اس کے خاوند نے بھی انگلینڈ جا کر اُسے طلاق بھیج دی تھی۔ لیکن میری بہن! تم جیسی ہزاروں ہیں جن کے خاوند انہیں جیتے جی بیوہ کر چکے ہیں لیکن وہ سب بدکار نہیں ہوئیں۔ سب نے تمہاری طرح سہارے نہیں ڈھونڈے۔ وہ گھروں میں بیٹھی جل رہی ہیں۔ تم بھی جلو اور جل کر راکھ ہو جاؤ، سہارے نہ ڈھونڈو۔ میں بھی جی رہی ہوں۔ میں بھی کسی اور سے دل لگا سکتی ہوں۔ مجھے میرا خاوند روکے گا نہیں کیونکہ وہ چاہتا یہی ہے کہ میں کسی غیر مرد سے دوستی کر لوں اور اس کی راہ کا روڑا نہ بنوں۔ لیکن میں اپنی آبرو کو سہاگ پر قربان نہیں کروں گی۔ میں اپنے خاوند کے دو بچے پال رہی ہوں۔ میرا پیار صرف ان بچوں کے لئے وقف ہے۔ دوسروں کے لیے اور اپنے خاوند کے لئے میرا جسم برف کا تودہ بن گیا ہے۔ جسے اب جنس اور جذبات کی حرارت پگھلا نہیں سکتی۔ میں اب بیوی نہیں، ماں ہوں۔ ماں بدکار نہیں ہو سکتی۔ میں ان بچوں کو صرف ایک سبق دوں گی کہ بڑے ہو کر جو جی میں آئے کر گذرنا لیکن کسی عورت کا دل نہ توڑنا۔ کسی عورت کے جسم سے کھیلنے کو دل چاہے تو یہ یاد کر لینا کہ یہ جسم اس عورت کا ہے جس کے رحم سے تم نے جنم لیا اور جس کی چھاتیوں سے تم نے دودھ پیا تھا ـــــ کاش، تمہارا خاوند تمہیں ایک بچہ دے جاتا جسے تم پیار کا مرکز بنا لیتی تو وہ تمہارے لئے پیار کا سرچشمہ بن جاتا ..."

"میرے جسم میں پیار کا سرچشمہ پھوٹ رہا ہے۔" میں نے اقبالِ جرم کر ہی لیا۔ "لیکن یہ

میرے خاوند کا نہیں تمہارے خاوند کا ہے“۔۔۔ میں اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ لپک کر اس عورت کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور میں اس کے ہاتھوں کو دیوانہ وار چوم کر تیزی سے اس کے گھر سے نکل آئی۔ میرا دل دکھوں سے آزاد ہوگیا۔ جسم میں گناہ کا بوجھ اٹھائے ہوئے بھی میں ضمیر پر کسی گناہ کا بوجھ محسوس نہیں کر رہی تھی۔

میں نے اب دفتر جانا چھوڑ دیا ہے اور اس عورت کے خاوند کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ محلے میں لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھانے لگے ہیں۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ میں اکیلی مجرم نہیں۔ مجھے دوسروں کے جرائم نے مجرم بنایا۔ مگر انہیں پکڑنے والا کوئی نہیں۔ پاکستان کا قانون بھی انہیں نہیں پکڑ سکتا۔

ور اب کسی شام آپ منوڑہ کے ساحل پر جائیں تو زندگی کے میلے سے منہ موڑے ہوئے آپ کو ایک عورت الگ تھلگ ٹہلتی یا کسی چٹان پر بیٹھی سمندر اور ساحل کی کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی نظر آئے گی۔ یہ عورت اپنے وجود میں اپنے خاوند اور اسی جیسے ایک اور خاوند کے گناہ کو سینچ رہی ہے۔ جب یہ گناہ ایک انسان کی صورت میں دنیا میں آئے گا تو میں اسے گود میں اٹھا کر اس کے باپ کی بیوی کے حوالے کر دوں گی اور اسے کہوں گی کہ یہ تمہاری ہی امانت ہے، اسے بھی پال پوس کر سبق دینا کہ بڑا ہو کر کسی عورت کا دل نہ توڑے۔

پھر میں اپنے ناپاک وجود کو سمندر کے حوالے کر دوں گی۔ اگر سمندر نے میری لاش کو انہی چٹانوں پر پھینک دیا جن پر بیٹھ کر میں زندگی کے آخری دن گزار رہی ہوں، اگر سمندر کی مخلوق نے میری لاش کو کھا نہ لیا تو شاید لاش انگلینڈ کے ساحل سے جا لگے ۔۔۔ یہ لاش اُن ہزاروں خاوندوں کے لیے ان کی بیویوں کا پیغام ہوگی جو ان کے جیتے جی بیوہ ہوگئی ہیں اور جن کی آہیں اور فریادیں گھر کی دیواروں سے دن کے وقت اڑتے ہوئے اندھے چمگادڑوں کی طرح ٹکرا رہی ہیں۔